هو الکریم

# دیوانِ ذوق

یعنی

ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام

جس قدر بہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانح عمری

مؤلفہ

شمس العلما مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی

حسبِ فرمائش

آغا محمد طاہر مالکِ آزاد بکڈپو دہلی

محبوب المطابع دہلی میں طبع ہوا

سنہ ۱۹۳۲ء
۱۳۵۱ھ

# دیوان ذوق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ معنیٔ نازک و شیریں جو آج تک کی دنیا میں آتی تھیں۔ ذوق و شوق کے وعدے
تھے کہ دلوں کو گدگدا کر چلے۔ استاد مرحوم جو حسرت ساتھ لے گئے۔ والد مرحوم نہیں
تو اور جو ہے وہ نہیں۔ بڑھاپا ہوا۔ اب صحبت کی امانت رہ گئی۔ آزاد کہ سامان سفر سے کوچ کا
علم آ جائے۔ ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر تھے کہ دماغوں نے
پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے۔ اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے
کبھی کچھ سنے۔ چند پرانے مسودے اور کچھ صفحے جو حافظے تک کی یادگار رہ گئے۔ والد
مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں۔ کہ
حاضر رہ کر لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ سنے سنائے اشعار کا پڑھنا۔ ٹکڑے حرفوں کا ملانا
اس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا۔ صاحبوں کا تصور باندھنا۔ جو سبب سے الفاظ و مطالب
کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام تھا۔ خدا کی عنایت اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی
میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے۔ جب یہ مہم سر انجام
ہو گئی۔ پہلے مرحوم و مغفور کا حال سوانح عمری کے طور پر لکھتا ہوں۔ اور جہاں جہاں موقع ہے
کوئی صورت خاص پیش آئی۔ یا کوئی نظم کسی تقریب خاص سے کہی گئی۔ یا کوئی لطیفہ
قابل لکھنے کے شگفتہ ہوا۔ وہ بھی جابجا درج کرتا ہوں۔ والد مرحوم دیوان کا آغاز تکمیل میں ساتھ

شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلہ کے شوقین نوجوان دلوں کی امنگیں اُن
کچھ کچھ کہوالیجاتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے
یہی چرچا رہتا تھا۔ شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سنتے سنتے مجھے بہت شوق
ہوگئے نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ
پھرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے
خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حُسنِ اتفاق تھا کہ ایک
نعت میں۔ اُس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک مہم کو خود ا
شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو اور دوسرا نعت میں ہو۔ جب یہ بھی خیال نہ تھا
اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہوجانے
دل کو ہوئی اُسکا مزا اب تک نہیں بھولتا۔ اُنہیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں
پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سناتا تھا اور خوشی
پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے
لیتے رہے۔ اسی عالم میں بیقرار تخلص کرتے تھے۔

اِسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خان
وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے
اصلاح لیتے تھے اُنکا ذہن بھی تیزی اور براقی میں لاجواب تھا۔ انھیں اپنے بزرگوں کی
صحبت میں تحصیل کمال کے لیئے اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور اتحادِ طبعی کے
سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے ◆

---

(بقیہ صفحہ گزشتہ) لکھا ہوا تھا یہ اُس مہ جبیں کے پردہ پر
کہ زلک مژگان چشم ستمگر آکے جگر میں گھوپ چلی
وعدہ کیا تھا شام کا مجھ سے شوق جنوں نے کل دیکھو
ناقہ مست عدو سے بد ایسا ہی جھنی کا رجتا ہے
شیخ بچارے شیخی اپنی مفت کے لئے کھاتا ہے

نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردہ پر
آکے ہمدم ساقی ادھر حسرت جنگ کو اپنے دھوپ چلی
آج وہ آپ پاس مرے جب ڈیڑھ پہر کی دوپ چلی
نانی جسکی آئی چھٹی میں دھوم سے لیکر گھی کھچڑی
دود ملید اکھاتے ہیں یا مست قلندر گھی کھچڑی

ہوا تھا۔ ساتھ پڑھے ساتھ بڑھے۔ ہر معرکہ میں شریک حال رہے۔ اور تھوڑے دنیا سے رخصت ہوئے۔ مجھے بیس برس تک اسطرح حضوری خدمت ہر وقت پاس بیٹھکر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اسطرح سنے ہیں گویا سامنے گذرے ہیں۔

تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے۔ مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنیوالے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں! اُس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا ایک صنعت کاری کی کل میں کون سے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اسکی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا اسی واسطے میں لکھوں گا اور سب کچھ لکھوں گا۔ جو بات سلسلۂ حالات میں مسلسل ہو سکے گی ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

خاندان

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علیخاں نے انہیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کی داروغگی پر رکھا تھا۔

۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے

۱۱۔ ذیحجہ ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظ اُن کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلہ کے اکثر لڑکے اُنہی کے پاس پڑھتے تھے انہیں بھی وہیں بٹھا دیا۔

تعلیم و تربیت

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوق تخلص کرتے تھے[۱]۔ اگلے وقتوں کے لوگ جیسے

[۱] نمونہ کلام یہ ہے۔ مزا انگور کا ہے رنگترے میں — اثر زنبور کا ہے رنگترے میں — ہیں اشعار بالی اسکی جا نگیں — یہ صفوں دو کا ہے بگترے میں — نہیں ہے اسکی ان جا نگوں میں زیبا — یہ لشکر مور کا ہے رنگترے میں — ہے نگوں جسم پا بھرا خون — کسی مجذور کا ہے رنگترے میں — مزاج اب جیکا صفراوی ہو اے شوق دل اس بیمار کا ہے رنگترے میں — وغیرہ وغیرہ

اور مباحثے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل پر جو معرکہ ہوا ردیف ی میں درج ہے دیکھو۔ ع

یہاں سے آپکا مقدر قاصد اوہ دن کرے

اگرچہ لوازمات شاعری جو ایک ہونہار سخنور کے لیئے چاہئیں سب انکی طبیعت میں جمع تھے۔ لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لیئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوشِ نقش پا۔ آغوشِ نقش پا۔ شاہ صاحب کے پاس لیگئے انہوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے ہاب تو مرزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ یہ وہاں سے چپکے چلے آئے دنوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا۔ مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے احتیاط شرط ہے۔ قریب شام کے افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک جا پہنچے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے۔ وہاں میر کلو حقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے میر صاحب نے انہیں پاس بٹھایا۔ اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ ملدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا انہوں نے بیان کیا میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہیں تو سناؤ! انہوں نے وہی غزل سنائی میر صاحب کو انکے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ دو۔ کوئی اعتراض کرے گا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اٹھا کر دیر تک ان کے لئے دعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب موصوف کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا تھا اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ دیکھو ردیف الف میں۔ ع

رکھتا بہر قدم ہے یہ وہ ہوش نقش پا

اس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے۔ طبیعت کی

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ اُنہی سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُن کے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

اِسے عطاء الہٰی کہنا چاہیئے کہ جُوں جُوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا۔ میاں عبدالرزاق ایک فاضل اسی محلہ میں صاحبِ تدریس تھے اُن کے درس میں جاکر شامل ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی اور کئی برس تک دونوں کی تعلیم ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں پلتی رہی۔ نیکی کی بنیاد ہمیشہ استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا ربط اخیر دم تک قایم رہا یہ بات اب سگے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوتی +

سلسلہ اصلاح جاری تھے۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں لوگوں کی واہ وا طبیعتوں کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے اُستاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقعوں پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے اُن کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو۔ کبھی کہدیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر اُنھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی اور پہلوتہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ کبھی بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے۔ جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ اُن کی غزلوں میں توارد سے۔ یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے اس لئے اُنہیں زیادہ رنج ہوا۔

منیر مرحوم کو جسقدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں جوانی کے جوش بھرے ہوئے تھے وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل مشکل طرحیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اس نال کو اُٹھا سکے۔ غرض کہ اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی

میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کیساتھ امارت خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کیلئے ولیعہد سے شقہ چاہا مرزا مغل بیگ اُن دنوں میں اُن کے مختار کل تھے اور وہ ہر وقت اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے سرکاتے رہیں اس قدرتی پیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان ہوگیا۔ اور وہ چلے گئے ٭

ولیعہد شاگرد ہوتے ہیں

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم! استاد تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا! غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم اور کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ابو ظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اسکا گورنمنٹ میں دائر تھا اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپیہ کے فقط پانسو روپیہ مہینا ملتا تھا۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کار سرکار ولیعہدی سے للعہ مہینا بھی ہوگیا۔ اُسوقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا رعب وداب کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کرکے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کرکے باپ نے اکلوتے بیٹے کو نوکری سے روکا۔ لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ۔ نہ سمجھنا۔ یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قایم ہوئے ہیں۔ موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ چنانچہ شیخ مرحوم ولیعہد کے استاد ہوگئے ٭

نواب الٰہی بخش خان اصلاح لیتے ہیں

دلی میں نواب علی بخش خان معروف ایک عالی خاندان امیر علوم ضروریہ سے

شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں کے دلوں میں اثرِ برق کیطرح دوڑی اور کلام کا چرچا بڑھا۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھواکر سُنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکلکر کوچہ و بازار میں رنگ اڑانے لگیں+

قلعہ میں کیونکر پہنچے

**اکبر شاہ** بادشاہ تھے اُنھیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے اور ظفر تخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اسیلئے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ مثلاً حکیم ثناءاللہ خاں فراق میر غالب علیخاں سید۔ عبدالرحمٰن خان احسان۔ برہان الدین خاں زار۔ حکیم قدرت اللہ خان قاسم۔ ان کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگرد میر تقی مرحوم مرزا عظیم بیگ عظیم۔ شاگرد سودا۔ میر قمرالدین منت۔ اور ان کے صاحبزادے میر نظام الدین ممنون وغیرہ سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع طرح میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا۔ مصرع پر مصرع لگاکر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوتِ فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اس اس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی۔ جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے اور اکثر دربار ولیعہدی میں جانے لگے+

قدرتی سامان

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے میر کاظم حسین ان کی غزل بنانے لگے انہی دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ اُنہیں ایک

شروع کر دیے۔ شیخ مرحوم نے وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا کہ بد مزہ ہو گئے کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستاد مرحوم نے اُنہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلعے اُس کے پڑھے:۔

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا ‌ ‌ ‌ گر آج بھی وہ رشک مسیحا نہیں آتا
مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا ‌ ‌ ‌ پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُس دن سے معمول ہو گیا کہ ہفتہ میں دو دن جاتے اُن سے غزل لے آتے اور اصلاح کی بھی دے آتے۔ چنانچہ جو دیوان **معروف** اب رائج ہے وہ تمام و کمال انہی کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے۔ اُس عالم میں اُستاد مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمائش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اٹھانی پڑیں مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف فن شعر کے کامل ماہر تھے

فرماتے تھے کہ ایک مدت شوق میں وہ بھی کبھی جرأت کبھی سودا کبھی میر کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر اخیر میں کچھ مقتضائے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحبدل اور صاحب نسبت تھے خواجہ میر درد کی طرز میں آ گئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اور تھا۔ جوانی دوانی۔ جرأت کے رنگ میں۔ کبھی سودا کے انداز میں۔ اور وہ رہ گئے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہہ کر دکھاتے۔ اب اُن کا دیوان ویسا بنا دیتے جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے۔ اور کہتے ہائے الٰہی بخش خان۔ ان کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اور اس طرح ذکر کرتے تھے۔ جیسے کوئی بااعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُن کی سینکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا

باخبر اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ جہاں متاع نیک دیکھتے تھے نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے اُن کا کلام گذرانا تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے۔ اور سید علی خاں غمگین وغیرہ وغیرہ استادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا۔ جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو اُنہیں اشتیاق پیدا ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے دولتِ فقر کی برکت سے ترک دنیا کر کے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹-۲۰ برس کی عمر تھی گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے بعد وہاں بیٹھ کر وظیفہ پڑھا کرتا تھا ایک دن چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور کچھ چیز رومال میں لپٹی ہوئی میرے سامنے رکھ کر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہو کر میں نے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور کا تھا چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچتا ہے۔ مگر آپ سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ استاد نے کہا کہ کل تو کام ہے۔ یہ کہہ دینا کہ پرسوں حاضر خدمت ہوؤنگا۔ تیسرے دن تشریف لے گئے وہ بزرگانہ اخلاق سے ملے اور بعد گفتگوئے معمولی کے شعر کی فرمائش کی انہوں نے ایک غزل شروع کی تھی اُس کا مطلع پڑھا ؎

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حال تو پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا مگر تمہاری زبان سے سُن کر اور لطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنی استاد مرحوم کے قدیمی استاد اسی وقت آنکلے ✤

استاد کا ادب

نواب اُنہیں دیکھکر مسکرائے اور شیخ مرحوم نے اسی طرح اُٹھکر سلام کیا جو سعادتمند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے۔ کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا۔ غرض انہوں نے اپنے شعر پڑھنے

سے لیا تھا وہ انہیں دیا ۔

اُن کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ایک سو ایک مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں ۔ اسی رعایت سے اس کا نام **تسبیح زمرد** رکھا تھا ۔ یہ تسبیح بھی اُستاد مرحوم نے پروئی تھی ۔ اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہکر لگائی تھی جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مرحوم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل ۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ ۔ اُن کے بذل و کرم اور حسن اخلاق اور عالی ہمتی کے سبب سے اکثر شرفا بخصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے ۔ اور اشعار سنتے سناتے تھے ۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا ۔ بھورے خاں **آشفتہ** ایک پرانے شاعر شاہ محمدی **مائل** کے شاگرد اور ان کے مرید تھے عمدہ وظیفہ بھی پاتے تھے آشفتہ کے شعر میں ہری چُگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا ۔ اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا ۔

تسبیح زمرد

سودے بیچ کو ایک محاورہ [illegible]

آج یہاں کل وہاں گزرے یونہی ڈھنگ ہیں
کہتے ہیں سب سبزہ رنگ ہیں سے ہری چگ ہیں

آشفتہ کو سو روپئے ایک رومال میں باندھ کر دے دیے کہ تمہاری کارش طبع کیوں خالی جائے ۔

فرماتے تھے ایک دن مجھے ایک غزل دی اور کہا کہ میاں ابراہیم یہ غزل ہماری مدت سے پڑی ہے ۔ دیوان میں درج نہیں کی ۔ ردی کرنے کو جی نہیں چاہتا ۔ مطلع اس کا ہمیں پسند ہے ۔ **مطلع** : ۔

میں جو سکنے لگا کچھ یار کے ناخونوں میں
بولے رکھ چھوٹے ہیں تجھ سا کے ناخونوں میں

اسی وقت عذر معقول میری سمجھ میں آگیا ۔ اور **معروف** اس خوبی سے موزوں ہوا : ۔

غلط العام فصیح ہے سخن میں معروف
پھر سخن کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں

دلی میں آب حیات کو دیکھکر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کرامت

کے کاموں کا دستور العمل ہیں +

الٰہی بخش خاں مرحوم کی سخاوت

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا۔ امیر۔ فقیر بچہ بوڑھا اُسے بغیر دیے نہ رہتے تھے۔ اور دینا بھی وہی جو کہ اُس کے مناسب حال ہو۔ کوئی سوداگر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جائے۔ اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل ہمارے پاس بیٹھکر بناتے جاؤ۔ سُناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا مگر اُن کی خوشی اسی میں دیکھی تو مجبور رہا اور یہی خوب ہوا +

ایک دن میں اُن کا وہ غزلہ بنا رہا تھا۔ اُس کا مقطع تھا:-

اک غزل پر دردی معروف لکھا اس طرح میں
ذوق ہے دل کو نہایت درد کے شعار سے

کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے
جانور گرنے لگے جائے ثمر اشجار سے

تلوار کی قدردانی

سوداگر آیا اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ اُن میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی وہ پسند آئی۔ خم دم آبداری اور جوہر دیکھکر تعریف کی اور میری طرف دیکھکر کہا:- ع

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

میں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا۔ بہت خوش ہوے +

سر لگا دیں ابروے خمدار کی قیمت میں آج
اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

خیر اور چیزوں کے ساتھ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو ان کے حالات و خیالات سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کریں گے۔ خدا کی قدرت ۲-۳ ہی دن کے بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ) ایک اور صاحب کو اپنے ساتھ لے کر نواب احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے ان کے پاس آئے باتیں چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو اُنہوں نے وہی تلوار منگا کر صاحب ممدوح کی کمر سے بندھوائی اور کہا ؎

برگ سبز است تحفۂ درویش
چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر

سنائی۔ اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے اسے میں اُستاد مانتا ہوں[1]۔ دوسرے مشاعرہ میں اُنہوں نے اس پر غزل پڑھی شاہ صاحب کی طرف سے۔ بجائے خود اُس پر کچھ اعتراض ہوئے جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اُس کی صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں۔ اُنہوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ مگر ولیعہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اُسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا۔ اُنہوں نے جو کہا تھا۔ وہی جواب میں لکھدیا اور یہ شعر بھی لکھا:—

بود گفتۂ من حرف اعتراض چناں
کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا۔ اور دربار شاہی میں جا کر قصیدہ سنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سنا کہ اس پر اعتراض لکھے گئے ہیں۔

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو بہ سر معرکہ فیصلہ ہو جائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک مستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کر کے فرمایا کہ انہوں نے اس پر کچھ اعتراض لکھے ہیں۔ شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپ کا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ کہ آپ کے اعتراضوں کے لیے قابلِ خطاب ہوں۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ انہوں نے کچھ لکھا ہے۔ شیخ مرحوم نے کہا۔ کہ خیر تحریر تو اسی وقت تک ہے۔ کہ فاصلہ دوری درمیان ہو۔ جب آمنے سامنے موجود ہیں تو تقریر فرمائیے۔ قصیدہ کا مطلع تھا:—

معرکۂ عجیب

صرصر و کوہ میں ہوں گر آتش و آب خاک و باد
آج نہ چل سکیں گے پر آتش و آب خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو پڑھنے کے سبب حرکت ہے تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی۔ معترض

[1] یہ حضرت شیخ مرحوم پر کردار ولیعہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں سے راست دکھلاتے تھے۔

بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہوگا۔ اس مضمون کو تم نکال ڈالو۔ میں کیا کہوں کہ استاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اُن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے اب تک میرے پاس موجود ہیں۔ دکھاؤں کسے ✦

ذوق کا استغنا و توکل

استاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایک طرف جانماز بچھی رہتی تھی جب میں رخصت ہوتا تو آفتاب دس دس دن فرماتے بھئی میاں ابراہیم ذرا ہماری جانماز کے نیچے دیکھنا۔ میں نے گوشۂ جانماز اٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا۔ ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ میں سمجھ گیا اور لے لیے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں جو کچھ دیں جس سے ہم مانگتے ہیں یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔ پھر جب کچھ دیتے تو اسی طرح دیئے۔ یہ گوشۂ جانماز اٹھاتے اور لے لیتے ✦

حقہ بھی پلواتے ہیں

ایک دفعہ استاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد گئے ضعف تھا اور کچھ شکایتیں باقی تھیں۔ فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ مگر نواب صاحب حقہ پلوائیں تو خالی کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی۔ نیچہ اور چلم۔ مغرق نیچہ۔ مرصع فہنال تیار کروا کر سامنے رکھوا دی ✦

یہ بھی خالی نہ جائے

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے۔ رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن اصطبل سے منگایا۔ زین زین کسا ہوا۔ اُس پر سوار کر کے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے کیا جائیگا کہ میں کس کے پاس گیا تھا ✦

شاہ نصیر مرحوم سے معرکہ آرائی ہوتی ہے

ادھر ولیعہد بہادر کی فرمائشیں۔ اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمائشیں تھیں۔ کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا۔ شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر پڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمائش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی۔ آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں

نے ان سے کہا کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک رہو چنانچہ یہ نوبت ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے تو راجہ صاحب کا آدمی انہیں ڈھونڈ کر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا۔

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہم نے لکھی اُس کی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں۔ میر نجات کی گل کُشتی ہماری دیکھی ہوئی تھی مگر حکیم[۱] مرزا محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے اور میرے والد مرحوم اُن ہی کا علاج کرتے تھے۔ وسعتِ معلومات اور حصولِ تحقیقات کی نظر سے ہم نے اُن سے جا کر پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ رواج اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے جس بحر میں چاہو لکھو۔ اُستاد کے مسودوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اُس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا۔ دو شعر اتنے یاد ہیں۔

کُھلیاں تو نہ تھیں وہ مے عشرت کے سبو تھے  یا قلزمِ ہستی کے حباب لب جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُنکے گلو میں  ہے بند کیا عیش کے دریا کو سبو میں

درباربار شاہی سے خاقانی ہند خطاب ملتا ہے

چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہہ سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کیے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا اُن کی تعداد ۱۸ تھی مطلع اُس کا یہ ہے:-

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن  آب و ایلولہ ہوے نشوونمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی

---

[۱] حکیم مرزا محمد صاحب علم و فضل کے خاندان سے ایک نامی کامل اور جامع الکمالات تھے۔ طب میں حکیم شریف خاں مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم محمود خاں کے دادا تھے حکیم مرزا محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور اُن کے والد بھی صاحب علم و فضل شاعر تھے کامل تخلص کرتے تھے۔ اور میر شمس الدین فقیر مصنف حدائق البلاغت کے شاگرد تھے۔ ان کا ایک معرکہ دار رسالہ علم قوافی میں ہے۔ انہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے تین باب باقی تھے کہ دنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علماء نے کتاب مذکورہ کے جواب لکھے ہیں۔ مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے۔ کسی نے نہیں لکھا۔

نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو۔ انہوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے۔ تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان سوال وجواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعۃً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر حسن تاثیر کا پڑھا:۔

پیش از ظہور جلوۂ جانانہ سوختیم — آتش بہ سنگ بود کہ ما خانہ سوختیم

مشاعرہ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گزرانا۔ ع

ہر سنگ میں شرار ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال وجواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُس نے یہ اعتراض کیا کہ اس میں ثبوت روانی کا نہیں ہے۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ تغلیب ہے اُس وقت خود شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہ ہو جائز نہیں ہو سکتی۔ شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپ نے ۹ شعر کی غزل پڑھکر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی اُستاد نہ ہوا! معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ کل پیچ مقرر رکھنا چاہیے۔ اور جلسہ برخاست ہوا۔

تکمیل علوم کے قدرتی سامان

اُسی دن سے تکمیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اس کا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام دا ملازم شاہ اودھ کے مختار تھے۔ انہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں۔ مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے قدیمی اُستاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً یہ بھی ایک دن مولوی صاحب کے ساتھ گئے۔ چونکہ ان کی تیزی طبع کا شہرہ ہو گیا تھا۔ راجہ صاحب رام

روکش تھے ترے رخ سے ہے کیا نورِ سحر رنگِ شفق ــ ذرہ ترا پرتوہ نورِ سحر رنگِ شفق

اگرچہ مرزا ابو ظفر ہمیشہ انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور دلی رازوں کیلیے مخزنِ اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیگ مختار تھے جب کبھی بڑی سے بڑی ترقی یا انعام کے موقع آئے۔ تو اُستاد کیلیے یہ ہوا کہ للعہ مہینے سے ھہ ہو گئے۔ ھہ سے صہ ہوگئے جب بادشاہ ہوئے اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کینہ قلعہ میں بھر گیا مگر استادِ شاہی کو ضد۔ مینا! پھر بھی انہوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کیلیے عرض نہیں کی ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے اور شعر موزوں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون پیچ اور درد کی کیفیت سے موزوں ہوتا تو اُسکے سرور میں آسمان کیطرف دیکھتے اور کہتے پھرتے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ــ اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں عبدالعزیز خاں صاحب ایک مردِ بزرگ صاحب نسبت فقیر تھے۔ شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایک دن اُن کے پاس لئے اور کہا کہ قسمت نیکی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ اللہ کے نام پر نہیں آتے۔ زبان تک درست نہیں مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے بے عقل ظاہر ہیں کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے وہ اُس کو بھی تو نہیں دی ہے۔ جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اُس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہوگا۔ ادنےٰ ادنےٰ متصدی اُس کے لکھتے پڑھتے ہونگے۔ وہ کیا نہ رستا ہوگا۔ کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُن کی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی ✦

چندروز کے بعد مرزا مغل بیگ کی ترقی تمام ہو گئی۔ تمام کنبہ قلعہ سے نکالا گیا نواب حامد علیخاں مرحوم مختار ہو گئے۔ تب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا ہو ا مہینہ

۱؎ فراش خانہ کی کوٹھڑی رہتے تھے۔

عمر ۱۹ برس کی تھی +

حافظ احمد یار[1] نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک جنازہ رکھا ہے۔ بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبد الرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا پیالہ لیے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے۔ اور جنازہ کس کا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم اُن کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں +

**خاقانی ہند** کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کیے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا۔ اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے۔ اُسے بھی تو دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ قصیدۂ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا اُس وقت یہی کہا تھا۔ اور جب میں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا اُن کی بے خبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا۔ تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی۔ اور اُس کی تاریخ کہی۔ ع توبہ اور توبہ کی تاریخ

| | |
|---|---|
| اے ذوق بگو سہ بار توبہ | |

مرزا ابوظفر بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ تو انہوں نے یہ پہلے قصیدہ گزرانا مبارکباد جب ظفر بادشاہ ہوا

[1] حافظ احمد یار سید انشا کے یار تھے۔ عجب شگفتہ مزاج۔ خوش طبع۔ سخن فہم شخص تھے۔ باوجودیکہ اُستاد جوان تھے۔ وہ بڈھے تھے۔ مگر یاروں کی طرح ملتے تھے۔ حافظ مرحوم اُنہی مولوی صاحب کے داماد تھے جنہوں نے حقیقت زاغ کا فتوٰے دیا تھا۔ اور سید انشا نے اُس کی ہجو کہی تھی۔ ترجیع بند مخمس میں ع اک مسخرا یہ کہتا ہے کوا حلال ہے +

پھر یہ قطعہ پڑھا:-

چو حق گفت فردوسی پاک ذات ۔۔۔ کہ رحمت براں تربت پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است ۔۔۔ کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

خوف خدا پر لطیفہ

ایک دفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اُس وقت قصیدہ لکھ رہے تھے۔ ع شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت * چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھ کر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار ان کے پاس آ بیٹھتی تھیں۔ یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پہ آن بیٹھی۔ انہوں نے ہاتھ سے اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی انہوں نے پھر اڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنس کر کہا کہ اس غیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنایا ہے؟ ایک طرف میں بیٹھا تھا ایک طرف حافظ ویران بیٹھے تھے۔ وہ نابینا تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پہ تو نہیں بیٹھتی۔ اُستاد نے کہا بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلا ہے۔ عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ پڑھ کر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا لگتے گا اور بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَرُ کر دیگا۔ دیوانی ہے جو تمہارے سر پہ آئے *

ایسے صاحب نظر کہاں ہوتے ہیں

فرماتے تھے کہ میں نے ساڑھے سات سو دیوان اساتذۂ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اور کتابیں گویا اُن کی زبان پر تھیں۔ گر مجھے اس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر انہیں ازبر تھے تو مجھے حیرت نہیں۔ گفتگو کے وقت جس ترتیب سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں۔ کیونکہ جس فن کو وہ لیے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے۔ تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا

مَیں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یادکرکے اِس واقعہ کی تصدیق کی - اور کہا کہ فی الحقیقت اُسوقت تیری عمر بَرس دِن سے کچھ کم تھی +

*صلاحیت طبع* صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر ادا کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ایک دن اِملی کے درخت میں کنکوا اٹک گیا - میں اُتارنے کو اوپر چڑھ گیا - ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھ کر پاؤں رکھا - وہ ٹوٹ گئی میں نیچے آپڑا - بہت چوٹ لگی - مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اڑایا - نہ درخت پر چڑھا +

*خوف خدا* عُمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا - عالم جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مجرّب نسخہ قوّتِ باہ کا بڑی کوششوں سے ہاتھ آیا - شریک ہوکر اُسکے بنانے کی صلاح ٹھیری - ایک ایک جُزو کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذِمّہ ہوا - چنانچہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے سر ہوا - ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلادیئے - اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے اُن کا پھڑکنا دیکھ کر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے مزے کے لیئے ۴۰ بے گناہوں کا مارنا کیا انسانیت ہے - یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں - اور اپنی پیاری زندگی کے لیئے ہر قسم کی لذتیں رکھتے ہیں - اسی وقت اُٹھا - اور اُنہیں چھوڑ دیا - اور سب سامان توڑ پھوڑ یاروں میں جاکر کہدیا کہ بھئی ہم اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے +

*خوف خدا* عادت تھی کہ ٹہلتے بہت تھے - دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے - رات کے وقت ٹہلتے ٹہلتے آئے اور کہنے لگے کہ میاں ابھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا - اُس وقت حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے اُنہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی - فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا - مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے - تجھے کیَ رکعت کا ثواب ہوگا - پھر

نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال اور اُس کے خواص معلوم کرنے کے لیے بڑے برس چاہییں۔ یہ سُن کر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا۔

نجوم و رمل

نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا کہ ولیعہدی کا زمانہ تھا۔ مرزا مغل بیگ کا بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم بے تربیت جاہل تھا۔ مگر بھائی کی بدولت آسودہ ہو گیا تھا۔ وضع کو تراشتا تھا۔ سرکار میں صاحب خدمت تھا۔ کاروبار میں دخیل تھا۔ یہی لوگ اجزائے دربار تھے۔ اُستاد جاتے تو اُنھیں میں بیٹھنا اور وقت گزارنا پڑتا۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا۔ اُس سے ہنسا کرتے اور دل بہلایا کرتے۔ اُس کی ایک رنڈی بھی تھی۔ اُستاد کبھی کبھی کہتے کہو تمہاری وہ کیسی ہیں؟ وہ کہتا خوب! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے اور کہتے کیوں جی آج رات کو تو جوتی چلتی رہی۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں رات کو تو مزے میں تھے۔ کیوں جی وہ عطر کی پر بگڑی تھی یا اور بات پر۔ روشن بیگ سوچتا کہ انھیں کہاں سے خبر ہو جاتی ہے۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اُس سے ملتے نہ ہوں۔ گھبراتا اور شرماتا۔

اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انھیں نجوم میں بڑا دخل ہے۔ ایک دن اُستاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے۔ خبر ہوئی۔ باہر آئے۔ مٹھی سامنے بند کر کے اُن سے پوچھا۔ بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم سے حساب کر کے بتاؤ۔ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ گوشت کی بو معلوم ہوتی ہے۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھول کر دکھا دی۔ رہی تھی ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انھوں نے اُس دن سے توبہ کی پھر کبھی موقع ہی آ جائے تو حساب کر کے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی۔

مکھن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تُلسی رام نابینا تھے۔ ایک مرد

تصوف

معلوم ہوتا تھا گویا نسخۂ کیمیا دیکھ کر اُٹھے ہیں۔ خصوصاً تصوف میں ایک عالمِ خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں۔ یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدت وجود اور وحدت شہود میں علم اشراق کا پرتو دے کر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے۔ کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے۔ ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سن لیا ہے آج تک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں انہیں خدا نے ایک ملکۂ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اِس قدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا بڑا تعجب ہے۔ مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ ان کے حافظے میں اس قدر مضامین محفوظ کیونکر رہے۔

علمِ طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا کہ ایسا نہ ہو۔ بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے۔

کہتے تھے کہ شعر کا بچپن سے عشق ہے۔ ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا۔ اتفاقاً خاندیس سے ایک بڑا صاحبِ کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی۔ باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لیے ۳۰۰ برس کی عمر چاہیے۔ ۱۰۰ برس سیکھے ۱۰۰ برس سنتا پھرے۔ اور جو سیکھا ہے اُسے مطابق کرے پھر ۱۰۰ برس بیٹھ کر اوروں کو سنائے اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سن کر دل برداشتہ ہو گیا۔ اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اس پر بھی جو کلاونت ہوگا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ اتائی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بننا کیا ضرور۔ نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں دستگاہ پیدا کی۔ نجوم و رمل کا ایک صاحبِ کمال مغلپورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایک دن کسی سوال کا

چند روز موسیقی کا بھی شوق رہا

گزارہ کا انداز

ایک تنگ و تاریک مکان تھا جس کی انگنائی اس قدر تھی کہ ایک چھوٹی سی چارپائی ایک طرف بچھی تھی۔ دو طرف اتنا رستہ رہتا تھا کہ ایک آدمی چل سکے حقہ منہ سے لگا رہتا تھا۔ کھرّی چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے۔ لکھے جاتے تھے۔ یا کتاب دیکھے جاتے تھے۔ گرمی جاڑا۔ برسات تینوں موسموں کی بہاریں وہیں بیٹھے گزر جاتی تھیں۔ انہیں کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کوئی عید اور کوئی موسم بلکہ دنیا کے شادی و غم سے انہیں سروکار نہ تھا۔ جہاں اول روز بیٹھے وہیں بیٹھے۔ اور جب ہی اُٹھے کہ دنیا سے اُٹھے +

پاک خیال

ہر وضو کے بعد ایک لوٹے سے برابر کُلیاں کیے جاتے تھے۔ ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ متاسف ہو کر بولے کہ خدا جانے کیا کیا ہزلیات زبان سے نکلتے ہیں خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کر کے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور یہ مطلع اُسی وقت کہکر پڑھا:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

اوراد و وظائف

معمول تھا کہ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر بادشاہ کی غزل کہتے تھے۔ آدھے بجے تک اُس سے فراغت ہوتی تھی پھر وضو کرتے اور وہی ایک لوٹے پانی سے کُلیاں کر کے نماز پڑھتے۔ پھر وظیفہ شروع ہوتا۔ زیر آسمان کبھی ٹہلتے جاتے۔ کبھی قبلہ رُو ٹھہر جاتے۔ اگرچہ آہستہ آہستہ پڑھتے تھے مگر اکثر اوقات اس جوش دل سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا گویا سینہ پھٹ جائیگا +

وظیفہ پڑھکر دعائیں شروع ہوتی تھیں۔ یہ گویا ایک نمونہ تھا۔ اُن کی طبیعت کی نیکی اور عام نیک خواہی کا۔ اس میں سب سے پہلے یہ دعا تھی کہ الٰہی ایمان کی سلامتی بدن کی صحت۔ دنیا کی عزت و حرمت۔ پھر الٰہی میرے بادشاہ کو با دولت با اقبال صحیح و سالم رکھ۔ اُس کے دشمن رد ہوں وغیرہ وغیرہ۔ پھر میاں اسمٰعیل یعنی اپنے بیٹے کے لیے۔ پھر اپنے عیال اور خاص خاص دوستوں کے لیے۔

دیرینہ سال منشی درگاپرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعد ازاں اِنہوں نے بے اظہارِ نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحبِ کمال ہو۔ اور غالباً کمال اُس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعث تفریح ہو۔ اس کا کمال زوائج خوب بازے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں مگر کوئی سامنے نہ ہوسکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کیے جاتے تھے جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اُس کی عمر کیا ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ ۶۷ - ۶۸ حد ۶۹ یہ سُن کر شیخ مرحوم کے چہرے پر آثارِ ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکامِ نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہیے لیکن واقعہ نظر کے سامنے گزرا تھا اس لیے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا کہ اُنہیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایک دفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ اُنہوں نے مُبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسبِ معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اُس قصیدہ کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اُس کے سُنانے لگے۔ مطلع تھا:۔

| | |
|---|---|
| زہے نشاط کہ گر کیجیے اُسے تحریر | عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر |

اس کے آگے شعر سُناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مُسکراتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا:۔

| | |
|---|---|
| ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ | کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر |

بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ سبحان اللہ۔ رنگینی اور یہ زور! ظہوری کا ساقی نامہ ہو گیا۔ چپ ہو گئے۔ اور کہا کہ اس میں زور آتا جاتا ہے۔ میں گھٹتا جاتا ہوں۔ اس کی جوانی ہے اور میرا بڑھاپا ہے۔ ان کی طبیعت کو خدائے تعالیٰ نے شعر سے ایسی مناسبت دی تھی کہ رات دن اس کے سوا کچھ خیال نہ تھا اور اسی میں خوش تھے۔

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں سب ذخیرہ نکالا محنت نے اُس کے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا۔ کیونکہ بچپن سے لیکر دمِ واپسیں تک کا کلام اُنہی میں تھا اور بہت سی غزلیں دشمنوں کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں +

چنانچہ اوّل اُن کی اپنی غزلیں اور قصائد انتخاب کر لیے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر باطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہہ و بالا ہو جائیگا حسرتوں کے خون بہہ جائیں گے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائیں گے۔ دفعۃً ۱۸۵۷ء کا غدر ہوگیا۔ کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی اُن کے فرزندِ روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا یہ حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعۃً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کرلے چلوں۔ اُن کی غزلوں کے جنگ پہ نظر پڑی۔ یہی خیال آیا کہ محمد حسین زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائیگا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہوں گے جو غزلیں پھر آکر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ سجے سجائے گھر کو چھوڑ ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ غرض میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔ حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض دردخواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ تو سب دلی کے ساتھ برباد ہوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے۔ اگر اب دیوان مرتب نہ ہوا تو کبھی نہ ہوگا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا اور خدا نے اُن کی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت

یا جو کسی دوست کے لیے خاص مشکل درپیش ہو۔ وغیرہ وغیرہ ایک شب اُس موقع پر میرے والد مرحوم اُنہی کے ہاں تھے۔ ساری دعائیں تمنا کیے۔ چنانچہ اُن کے دروازہ کے سامنے تلہ کا حلال خور رہتا تھا۔ اُن دنوں میں اُس کا بیل بیمار تھا۔ دعائیں مانگتے مانگتے وہ بھی یاد آ گیا۔ کہا کہ الٰہی تمّا حلال خور کا بیل بیمار ہے اُسے بھی شفا دے۔ بیچارہ بڑا غریب ہے۔ بیل مر جائے گا تو یہ بھی مر جائے گا۔ والد نے جب یہ سنا تو بے اختیار ہنس پڑے۔ فقرا اور بزرگان دین کے ساتھ اُنہیں ایسا ولی اعتقاد تھا کہ اُس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ علما اور اساتذہ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی اُن پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے۔ اس واسطے اُن کے مذہب کا حال کسی کو نہ کھلا ۔

ترتیب دیوان

فصاحت کا دل خون ہوتا ہے جب ان کے دیوان مختصر پر نگاہ پڑتی ہے۔ یہ اُن کا بیان ایک مصیبت کا افسانہ ہے اور مرثیہ خوانی اُس کی میرا فرض ہے۔ فرماتے تھے کہ بچپن میں جبکہ ۱۵-۱۶ برس کی عمر تھی ہم نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا اور اُسے بڑے شوق سے لکھا تھا۔ پھر زمانہ نے فرصت نہ دی۔ جو غزل ہوتی جُدا کاغذ پر لکھی جاتی۔ اسی طرح طاق میں رکھ دیتے۔ کہ فرصت میں نظر ثانی کریں گے۔ جب طاق بھر گیا تکیہ کے غلافوں میں بھرے۔ اور گھر میں دیدیے اور کہہ دیا کہ احتیاط سے رکھنا۔ کبھی مٹکے میں کبھی ٹھلیاں میں بھرے اور گھر میں بھجوا دیے کہ ضائع نہ ہوں اس طرح بہت سے تھیلے اور مٹکے ٹھلیاں بھر گئے تھے ۔

والد مرحوم نے آغاز شباب میں کئی بیاضیں بنائی تھیں۔ وہ ہمیشہ [illegible] بھی کاروبار میں عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے تو اُستاد کا کلام اُن سے لیتے اور صاف کرتے جاتے۔ بداندیشوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے جاتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی ۔

پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور نغیر مزاج شخص تھے۔ اُن کی پسند طبع کے بموجب انہیں بھی تصوّف اور عرفان اور درددلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرأت اور سید انشا و مصحفی کے مطلعے اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے۔ اُن کی غزلیں اُنہی کے انداز میں بناتے تھے۔ نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ اُن کی غزل اخیر کو گلدستہ گلہائے رنگا رنگ ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے ایک دو تصوّف کے۔ دو تین معاملہ کے۔ درمیان اسمیں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا اُسی میں باندھ دیتا تھا اور اس طرح باندھتا تھا کہ اور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورے کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہی اصول کے لحاظ سے میر۔ مرزا۔ درد۔ مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت بلکہ تمام شعرائے متقدمین کو اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا اُنہی کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا اسی دستور العمل سے اُنہوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے۔ پھر بھی جاننے والے جانتے ہیں کہ اصلی میلان اُن کی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا۔

قصائد پر رائے

نظم اُردو کی تماشا گاہ میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے بعد شیخ مرحوم کے سوائے کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور اُنہوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی فارسی کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔

کے محتاج نہیں تھے - باوجود اس کے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی - غرضکہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں - ذوق نے اس مہم کا سرانجام کیا اور ۱۲۹۰ھ میں ایک مجموعہ جسمیں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار - اور چند قصیدے ہیں چھاپکر نکالا - مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا - کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں - دن کی عیدیں - رات کی شب براتیں ان کے آرام - دل کی خوشیاں طبیعت کی امنگیں سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا جس کی انتہا نتایہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہیگا - آہ بکار زمانہ کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا - اور جس نے اوروں کو شاگردوں کو صاحب دیوان کر دیا - اس کو یہ دیوان نصیب ہوا - ع یعنی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے ✣ میرے پاس بعض قصیدے ہیں - اکثر غزلیں ہیں - یہ دو مل ہو جائیں گی یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائیں گی - افسوس کے دریاؤں سے پیاس بھر پانی بھی نہیں ✣

غزلوں پر رائے

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہی تھیں اگر جمع کی جائیں تو بادشاہ کے چار دیوانوں کے برابر ہوتیں - غزلوں کے دیوان کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون - صفائی کلام - چستی ترکیب - خوبی محاورہ - اور عام فہمی ہے - مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا - ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا - شاہ نصیر سے اُن دنوں معرکے ہو رہے تھے - اُنکا ڈھنگ وہی تھا - اس لیے اُنھوں نے بھی وہی اختیار کیا - اس کے علاوہ مرزا کی طرز کو طلب کے گرانے میں - اور لوگوں کے لب دہن سے واہ واہ کے نکال لینے میں جادو کا اثر ہے - چنانچہ وہی مشکل طرحیں چست بندشیں - برجستہ ترکیبیں معانی کی بلندی الفاظوں کی شکوہیں ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں ✣

چند روز بعد نواب الٰہی بخش خاں معروف کی خدمت میں اور ولیعہد کے دربار میں

اپنی غزل بادشاہ کو نہ سناتے تھے۔ اگر کسی طرح پہنچ جاتی تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتے۔ اب اگر نئی غزل کہہ کر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچہ نہ تھا۔ ۲۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اس سے چُست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر دے دیتے تھے بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پہ زورِ طبع نہ خرچ کریں۔ جب ان کی شوقِ طبع کو کسی طرف متوجہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو ادھر ہی آ جائے۔

## عموماً اندازِ کلام

کلام کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے تارے آسمان سے اُتارتے ہیں۔ مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے انھیں ایسی شان و شکوہ کی کرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انھیں قادرالکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت ملی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارے کی بو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سیدھے سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں مگر ایسا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور منہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیب الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں۔ مگر جسے جہاں سجا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لیے ہوتا ہے۔ وہ طبیب کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دے جائیگا اور کونسا رنگینی میں۔ کامل مصور کی تیزی قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح ان کے مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور

---

[۱] دیکھو ردیف ت میں۔

ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ
الگ تھیں۔ اگر جمع ہوتے تو خاقانیِ ہند کے قصائد خاقانیِ شروانی سے دوچند ہوتے
جب تک اکبر شاہ زندہ تھے ان کی مدح تھی۔ کہ قصیدہ کہہ کر لے جاتے اور اپنے آقا
یعنی ولیعہد بہادر کو سناتے تھے۔ وہ دوسرے دن ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ
بادشاہ کا نام ڈلوا کر بھیجتے اور دربار شاہی میں سنواتے۔ افسوس یہ ہے کہ عالم جوانی
کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے بڑھاپے کی برکت ہے۔
کئی مخمس تھے۔ رباعیاں تھیں۔ تاریخیں تھیں سب اُن کے ساتھ گئیں۔

مرثیے سلام — مرثیے سلام کہنے کا انہیں وضع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ
کی طرح محرم میں ماتم کرتے اور ایک سلام مرثیہ کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی
سعادت اور عبادت سمجھتے تھے۔

ہزاروں گیت۔ ٹپے۔ ٹھمریاں۔ بولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم
میں مشہور ہیں اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے۔

ہجو — اُن کے اور اُن کے دیکھنے والوں کے لیے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ
خدا نے کمال شاعری اور ایسا اعلیٰ درجہ قادر الکلامی کا دیا اور چند آدمیوں سے
انہیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا۔ مگر تمام عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو
اُس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی۔ مگر خدا نے اُن کی
ہجو کسی کے منہ سے نہ نکلوائی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جوہر لطیف ہے۔ اسے ہجو
سے آلودہ نہ کرنا چاہیے۔

اکثر نئے ایجاد و اختراع اُن کے ارادہ میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع
ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمائشیں دم لینے کی مہلت نہ دیتی تھیں۔ اور
تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اتنا تھا کہ بات نکال کر اسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔
اُن کو کیا ہوا انہیں سنبھالنا پڑتا تھا۔

ہو یا عاشقانہ یا تصوف۔ اُن کے سینہ میں جو دل تھا۔ گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اس واسطے کلام اُن کا مقناطیس کی طرح قبولِ عام کو کھینچتا ہے۔ دل دل کے خیال باندھتے اور اس طرح باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گزری ہے +

طرزِ اصلاح

شاگردوں کی غزل بڑی توجہ سے درست کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اور اُستاد اس قدر زیادہ اصلاح نہیں دیتے۔ فرمایا کہ میری غزل پر اُستاد توجہ کم کرتے تھے اکثر واپس بھی کر دیتے تھے کہ دوبارہ دیکھو۔ طبیعت پر زور دیکر کہو۔ بعض شعر کاٹ دیتے تھے۔ مجھے رنج ہوتا تھا۔ اس لیے شاگردوں کے کلام کا درد آتا ہے۔ اور کاوش سے درست کرتا ہوں +

اس میں خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُس کی حیثیت اور استعداد سے گھٹنے یا بڑھنے نہ پاتا تھا۔ اور کیفیت اس کی مشاعرہ کی غزلوں میں کھلتی تھی۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے۔ ولیعہد کی غزل بھی بناتے تھے۔ اور جب جدا جدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے۔ یہ ولیعہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام اصلاح کے اپنے انداز پر تھا۔ دیوان اپنی جگہ۔ داغ اپنی جگہ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ +

# اعتراض

ان کے کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پرانی غزل کا شعر ہے

سر بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے    یہ نصیبِ اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں ی زیادہ کرنی جائز نہیں۔ مگر یہ اعتراض اُن کی کم نظری کے سبب سے تھے +

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے    بنیروئے مردے بر آید زجائے

اے زدہ برتر از گماں دامنِ کبریائے را    دستِ جو کجا رسد عقلِ شکستہ پائے را

پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے ۔ گویا ایک شربت کے گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا ۔ اسی وصف نے ناوانوں کو غلطی میں ڈالا ہے ۔ جو کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں ۔ وہ نہیں جانتے کہ اُن کے ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پاکر نکلے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی ۔ خدا جانے زبان نے کس آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے یا اُنہوں نے الفاظ کے نگینوں پر کیونکر جلا کی ہے جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہوگئی ہے حقیقت میں اس کا سبب یہ ہے کہ قدرت کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دے کر آئینہ بناتا ہے ۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے ✦

ہمیشہ فکر سخن میں غرق رہتے تھے اور اپنے کلام کو آپ الٹ پلٹ کرتے تھے یہی سبب ہے کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سے اور لکھے نظر آتے ہیں ✦

اُن کا کلام دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے ۔ اُن کے لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے ۔ وہ زور فقط اُن کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا بلکہ سننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا کرتا ہے اور یہی قدرتی رنگ ہے جو اُن کے کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے ✦

ان کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اُس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلموں آوازیں آتی ہیں ۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں ۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے دیکھنے سے دل اُکتا نہیں جاتا ۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے ۔ اور مضامین کے طبیب تھے جس طرح برجستہ میٹھا دیکھتے تھے اُسی طرح باندھ دیتے تھے خیال بندی

کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل عامیانہ۔ اب ثقہ متین اور شریفانہ ہے +

آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے :۔

جو ستمگر ہیا کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں ۔۔۔ سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں شمشیر کا کھیت نہیں ہے +

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے :۔

منھ اُٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ بجھے ۔۔۔ ہے ترا نقش قدم چشم نمائی کرتا

نواب کلب حسین خاں نادر تلخیص معلّے میں فرماتے ہیں (بجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے۔ پہلے مصرع میں نہیں لانا چاہیے۔ اس کا جواب مجھے نہیں آتا +

**نقل**۔ شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا۔ اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ ابھی نوجوانی کا عالم تھا حسب معمول اُستاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہ صاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک بادیہ لیے ہوئے آئے۔ اُس میں دہی تھا۔ کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ ان کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا۔ انہیں رنجش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شاہ صاحب نے کہا کھٹیا ہے۔ کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ اُستاد نے ہنس دیا اور کہا کہ ع

بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں

مصرع میاں مجذوب کا ہے مگر کھانے کا موقع تھا اس لیے سب کو بہت مزا دیا +

ایک دن حسب معمول حضور میں گئے مرزا شاہرخ[1] ایک بیٹے حضور کے تھے اُنہوں نے اُن دنوں بہت سے کاروبار کی خدمتیں قبضہ میں لے رکھی تھیں وہ اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجیے وہ بھی آہی پہنچے۔ معلوم ہوا کہ حضور کی ایک غزل ہے اُس کے ہر شعر میں ایک مصرع لگا کر مثلث کرنا چاہتے

[1] مرزا رفیع سودا کے بیٹے کہلاتے تھے۔ شاید متبنّیٰ تھے +

ایک پرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی:۔

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو	آئے ہے جُز میں تفرقِ کل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جُزو مع واو کے ہے۔ فقط جُز صحیح نہیں۔ اس کا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں:۔

ہر چہ کند در جزو در کُل اثر	کُلّی و جُزئیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں:۔

جُز مرتبۂ کُل کو حاصل کرے ہے آخر	ایک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا

ایک دن میں اوج سے ملا اور اُستاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا:۔

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے	صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا:۔

یہاں جو برگِ گُلِ خورشید کا کھڑکا ہو جائے	دھول دستارِ فلک پر لگے تڑکا ہو جائے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ طنز کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے جو اُستاد نے باندھا ہے۔ یہ جائز نہیں۔ مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں بات کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر! میری طرف دیکھکر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی ؎

دوسرے دن میں اُستاد مرحوم کی خدمت میں گیا اور یہ ماجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اُس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے یعنی روشنی نصیب نہ ہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی نہ ہوئی نہ ہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حُسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ۔ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لُطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت

بدیہہ

فرماتے تھے کہ جوانی کا آغاز اور میری بدیہہ گوئی پر نظریں پڑتی تھیں کہ ایک دن سید محمد خاں اعظم الدولہ کے بالاخانہ کے نیچے سے میرا گذر ہوا۔ وہ پُرانے شاعر تھے اور سرور تخلص کرتے تھے۔ مجھے دیکھکر آواز دی۔ میں گیا۔ بیٹھتے ہی فرمایش کی کہ تذکرہ ہم نے تمام کردیا۔ اب اس کی تاریخ کہہ دو۔ میں نے کہا۔ اچھا فکر کرونگا اُنھوں نے کہا۔ فکر کرنے کو تو سبھی ہیں۔ ابھی فکر کرو۔ اور کہہ دو۔ فرماتے تھے۔ خدا کی قدرت ان کے خطاب کے خیال سے اُسی وقت ذہن میں آیا دریائے اعظم حساب کیا تو عدد برابر۔ عجب خوشی دل کو ہوئی۔ میں نے جھٹ کہہ دیا۔ ہنسے اور کہا پہلے سے کہہ رکھی ہوگی۔ پھر کہا۔ مصرع ابھی لگادو۔ میں نے کہا کہ مصرع پھر انشاء اللہ۔ جو بات تھی وہ ہوگئی ﴿

زہے طبع حاضر

ایک دن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشد زادے تشریف لائے وہ شاید کسی اور مرشد زادے کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لے کر آئے تھے۔ اُنھوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنھوں نے عرض کی صاحب عالم اس قدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لیجانا کیا تھا۔ صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ "اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ اُستاد دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے۔ اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور ؎

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے      اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ اواخر عمر کی غزل ہے۔ اس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہوگیا ﴿

ایک دن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہوکر کہنے لگے کہ آج عجب ماجرا گذرا۔ میں جو حضور میں گیا تو محل میں تھے۔ وہیں بُلالیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے دیر تک ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال

تر ۔ تدایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے ۔ بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے ۔ غرض بادشاہ نے وہ غزل انہیں دی کہ استاد اس پر مصرع لگا دو ۔ انہوں نے قلم اٹھا کر ایک شعر پر نظر کی ۔ اور فوراً مصرع لگا دیا ۔ اسی طرح دوسرے میں ۔ تیسرے میں سلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اسی وقت پڑھکر سنائی ۔ سب حیران ہو گئے ۔ بلکہ مرزا شاہ رخ نے کہا کہ استاد آپ گھر سے کہکر لائے تھے ۔ بادشاہ بولے بھلا انہیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے ؛

**نقل** ۔ برسات کا موسم تھا ۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب میں تھے مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) شب مہتاب میں تلاؤ کے کنارے پر چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے ۔ استاد مرحوم پاس کھڑے تھے انہیں بھی شعر کا شوق تھا اور شاگرد تھے ۔ ان کی زبان سے یہ مصرع نکلا ع

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر

ان سے کہا کہ استاد اس پر مصرع لگائیے گا ۔ انہوں نے فوراً کہا ۔ ع

عکس رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر

نواب حامد علیخاں کے خسر نواب فضل علیخاں ستہ اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا ۔ اس لیے نواب حامد علی خاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے ۔ ایک دن دیوان خاص میں کھڑے ہوئے شعر سنتے سناتے تھے ۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا :-

جانور جو ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے ۔۔۔ اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

استاد مرحوم نے کہا کہ صدقے میں اکثر کوا چھڑواتے ہیں اس لیے زیادہ مناسب ہے :-

زاغ بھی جب ترے صدقے میں رہا ہوتا ہے ۔۔۔ اے شہ حسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا۔
جب اُس نے کٹورا لاکر دیا تو یہ مطلع کہا۔ کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

پلائے آشکار ا ہم کو کس کی ساقیا چوری　　خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

تاریخ

تاریخ کی کمائی بھی سب بادشاہ کے حصّے میں آئی۔ کیونکہ اکثر اُنہی کی فرمائش سے کہتے تھے اُنہی کا تخلص ہوتا تھا۔ نواب زینت محل بیگم۔ بادشاہ بیگم تھیں اور کُل احکام سلطنت کی حاکم تھیں۔ اُنہوں نے شہر میں ایک مکان بنوایا۔ تاریخ کے لیے بادشاہ سے عرض کی۔ اُنہوں نے دربار خلوت میں استاد سے فرمایا۔ بیگم بولیں کہ حضور اُستاد سے کہئے کہ آج تاریخ لکھ جائیں۔ اُستاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا:-

کروائے ظفر زینت محل تعمیر تعمیر بدل　　تاریخ گفتم بمحل۔ ایں خانہ زینت محل

ایسی ایسی تاریخیں سینکڑوں کہہ دیتے تھے۔ یاد کہاں! اور لکھے کون؟

والد مرحوم نے بہ نیت وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایک دن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لیے کہا۔ اسی وقت تامل کر کے کہا۔ "تعزیت گاہ امام دارین" پوری تاریخ ہے۔

مریضہ

حکیم میر فیض علی مرحوم طب میں ان کے اُستاد تھے اور اُنہی کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایک دن میں بھی موجود تھا۔ نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا۔ بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اُٹھ کر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچ کر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو یہی تاریخ ہے۔ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ یوں تاریخیں سینکڑوں کہہ دیں۔ کہاں تک لکھوں! اور یاد کہاں؟

ایک شخص نے کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمائش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہوا دو کہ جس میں دونوں نام آجائیں۔ آپ نے سُن کر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آئیے گا۔ انشاء اللہ ہو جائیگا۔ وہ رخصت ہو کر چلے۔ ڈیوڑھی کے باہر نکلے ہونگے

پوچھا۔ کہ وہ اِجو قصیدہ تم نے ہمارے لیے کہا تھا اُس کے وہ اشعار آج ہمیں یاد آ گئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لطف حاصل ہوا مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لیے کہتے ہو۔ ہم مر جائیں گے تو جو تخت پر بیٹھے گا اُس کے لیے کہو گے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ تردد نہ فرمائیں خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائیں گے اور حضور خیال فرمائیں کہ عرش آرامگاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امرا ان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے عرش آرامگاہ کے اُمرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمائیے۔ جو جس کے ہوتے ہیں وہ اُسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے۔ اور اپنا سامان مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سُن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ دیکھو ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا۔ حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے +

حسب حال شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے اواخر عمر میں روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے۔ کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو بالاکوٹھے پر جا کر یا گھر میں جا کر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں وہ عالم نہان و آشکار کا ہے۔ اُس کی تو شرم نہیں ہو سکتی بھلا بندے کی تو شرم رہے +

پھر ایک دفعہ رمضان کا مہینہ تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلئے چونکہ وہ اُس وقت کچھ لکھوا رہے تھے مصروفیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا

یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائیگی۔ کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو۔ اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جالی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ لو یار بڑی قسمت والے ہو۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا مُنہ پھاڑ کر گرا۔ اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا بارود اُڑ گئی۔ چھینک کر پیچھے ہٹا اور جل کر کہا واہ یہی دلی! انہوں نے کہا۔ اس چٹخارے ہی کے مارے تو پڑے ہیں ✦

**لطیفہ**۔ مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حقدار ہوئے تھے وہ بھی اُستاد سے اصلاح لیتے تھے۔ شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر کی باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور کتنے ہی امیروں کو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اس پر بھی لڑکپن کی کلیاں چُنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴ - ۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھ کر غلام ہو گئے۔ مرزا نے ایک دن اُستاد کو بلا بھیجا۔ یہ گئے۔ اُنہوں نے غزل عنایت کی اور کہا کہ اُستاد اسے یہیں اصلاح دیدیجئے۔ اُستاد غزل بنانے لگے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچے میں سے نکالی۔ اُسے دیکھا اور کہا کہ اُستاد ذرا اسے دیکھیے۔ اُستاد سمجھ گئے کہ اُسی کی تصویر ہے۔ دیکھ کر کہا۔ بہت خوب۔ مرزا کی خاطر جمع نہ ہوئی۔ پھر کہا دیکھیے تو سہی۔ اگر واقعی ایسا معشوق ہو تو کیسا ہو۔ اُستاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے چاہتا ہے کہ میں بھی بُڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! ان سے پھر بھی نہ رہا تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا۔ بھلا اُستاد اس حُسن میں کچھ نقص تو بتائیے اُستاد نے دیکھا اور کہا " ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں "۔ اُستاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا۔ لڑکا ہے۔ اور ایک بیسوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔ میں نے اُستاد سے پوچھا

جو ذکر ت کہا کہ محمد بخش بلا ؤ انہیں ۔ لپٹا لینا ۔ خوب ہوا ان کے تقاضے سے جلدی مخلصی ہو گئی ۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہا ۔ ع

پڑھ نام محمد پسر غلام علی

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سن کر مصرع طرح بھیجا اور بلا بھیجا ۔ آپ نے غزل لکھ کر بھیجی اور مقطع میں لکھا ۔

آجکل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدر سخن    کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

انہوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے ۔ ایک دن میں نے نہ جانے کا سبب پوچھا ۔ فرمایا :-

**نقل** ۔ کوئی مسافر دلی آیا ، مہینہ بیس دن رہ کر چلا ۔ یہاں ایک کتا ل گیا تھا ۔ وہ دو کا مارا ساتھ ہو لیا ۔ شاہدرہ پہنچ کر دلی یاد آئی اور رہ گیا ۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا کہ دنیں فربہ بدن نیارے چکنی چکنی پشم ۔ ایک کتا انہیں دیکھ کر خوش ہوا ۔ اور دلی کا سمجھ کر بہت خاطر کی حلوائیوں کے بازار میں لے گیا ۔ حلوائی کی دکان سے ایک بادشاہی اڑا کر سامنے رکھا ۔ بھٹیارہ کی دکان سے ایک کلہ جھپٹا ۔ یہ نعمتیں کھاتے اور دلی کی باتیں سناتے رہے ۔ تیسرے دن رخصت مانگی ۔ اس نے روکا ۔ انہوں نے دلی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کیے ۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلی آنے کی تاکید کر آئے ۔ اسے بھی خیال رہا اور ایک دن دلی کا رخ کیا ۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کتے مردار خوار ۔ خونی آنکھیں ۔ کالے کالے منھ نظر آئے یہ لڑتے بھڑتے نکلے ۔ دریا ملا دیر تک کنارہ پر پھرے ۔ آخر کود پڑے ۔ مر کھپ کر پار پہنچے ۔ شام ہو گئی تھی ۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچا کر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی ۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے ۔ بظاہر خوش ہوئے اور کہا ادھو اس وقت تم کہاں ؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا ۔ ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا ۔ اسے لے کر ادھر ادھر پھرنے لگے

پاخانے سے نکلے فرمایا کہ لو جی ۳۳ برس کے بعد آج اصلاح دینی آئی ہے۔ حافظ ویران نے کہا حضرت کیونکر؟ فرمایا۔ ایک دن شاہ نصیر مرحوم کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے۔ اس میں مصرع تھا۔ ع

کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ

ابتدائی مشق تھی۔ اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے۔ اور جب سے اکثر یہ مصرع کھٹکتا رہتا تھا۔ آج وہ نکتہ حل ہوا۔ عرض کی حضرت پھر کیا۔ فرمایا۔ ع

کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اڑا دو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر۔ تو ہم مصرع الٹ پلٹ کیے تھے ایک اس وقت خیال میں آئے

بل بے کمر کہ زلف مسلسل کے پیچ میں  کھاتی ہے تین تین بل اک گدگدی کے ساتھ

کابلی دروازہ کے پاس ہی مکان تھا۔ شام کو باہر نکل کر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ مضامین کتابی۔ خیالات علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایک دن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ۔ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے۔ تم بھی تو کچھ کہو میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں غوں غاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی۔ میں نے کہا۔ ع

سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذرا تامل کر کے کہا ہاں درست ہے ؎

آجائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہیے  سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اب جو کبھی دلی جانا ہوتا ہے اور اس مقام میں گزر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔

اس مطلع پر حضور نے کئی دفعہ جال مارے مگر بیٹھا ٹال گئے مضمون آنہ سکا۔ مطلع انہوں نے نہ دیا

کیا کہوں اُس ابرو سے پیوستہ کے دل سب میں ہے  ایک طعمہ مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہے

بادشاہ کے چار دیوان ہیں۔ پہلے میں کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں۔ غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان

حضرت! پھر مرزا نے کیا کہا۔ فرمایا۔ پہلو میں رکھ لی۔ میں نے کہا۔ بارے اُس بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ فرمایا۔ کہتے کیا؟ پی گئے ✦

**لطیفہ**۔ دلّی میں ایک شریف خاندانی۔ خوش اخلاق خوش مزاج تھے۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ نوکر کے پاس خاصدان میں ہر وقت چند گلوریاں رکھتے تھے۔ جہاں جاتے یا راہ میں کوئی دوست ملتا۔ مزاج پُرسی کے بعد اُسے ایک گلوری بھی دیتے تھے۔ اور اسی واسطے **میر گلوری** مشہور تھے انہوں نے بیٹے کی ختنہ کی۔ اور بعد غسلِ صحت کے تمام احباب کو بلا کر کھانا کھلایا۔ جلسہ ضیافت میاں عنایت افزوں خواجہ سرا کے مکان میں تھا۔ اُستاد مرحوم بھی گئے۔ کھانا کھا کر دوسرے مکان میں آ بیٹھے۔ چند بزرگ اور بھی موجود تھے کہ اتنے میں میر گلوری صاحب آئے سینی میں ایک شخص گلوریاں لیے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں دیں ✦

حکیم آغا جان عیش اُستاد سے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب سے گلوری لے کر کہا۔ آج تو دست مبارک سے گلوریاں کھلانی واجب تھیں۔ اُستاد نے کہا۔ ہاں ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب ہنسے اور کہا۔ حضرت! میر صاحب کی ظرافت کے نکتے کوئی کہاں تک پائے۔ ختنہ کی ضیافت کی۔ خواجہ سرا کے مکان میں لے جا کر کھلایا۔ اُستاد نے کہا ظرافت پر ظرافت یہ کہ کھلایا بھی خصی پلاؤ[لہ] ✦

عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے۔ اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ میں چھٹّی کے دن اُس وقت جایا کرتا تھا۔ اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی میں تھا۔ پاؤں کی آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹی سی انگنائی تھی۔ پاس ہی چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے اجی ہمارا وہ شعر اُس دن تم نے پڑھا تھا؟ ایک دو لفظ اُس کے پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے۔ ہاں اب اسے یوں بنا لو۔ ایک دن ہنستے ہوئے

---

[لہ] خصی پلاؤ اُس پلاؤ کو کہتے ہیں کہ گوشت کی جگہ اس میں چنے کی دال دم دیتے ہیں۔ گویا گوشت کا پلاؤ مرد ہے ✦

کنجڑے کی ہی ہاٹ ہے دُنیا جنس ہے ساری کھٹی　　میٹھی چاہے میٹھی لے لے کھٹی چاہے کھٹی
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا
روپ رنگ کے پھول دلیں دیکھ عقل کے بیری　　اوپر میٹھی نیچے کھٹی - انبوا کی سی کیری
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

ایک فقیر صدا کہتا پھرتا تھا - کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہوگا - حضور کو پسند آئی ان سے کہا - انہوں نے بارہ دوہرے اُس پر لگا دیے - مدتوں تک گھر گھر سے یہی گانے کی آواز آتی تھی - اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے (حافظ ویران کو خدا سلامت رکھے انہی نے یہ شعر بھی لکھوائے ):-

کچھ راہِ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہوگا
محتاج خراباتی - یا پاک نمازی ہے　　کچھ کر نہ نظر اس پر - واں نکتہ نوازی ہے
کچھ راہِ خدا دے جا - جا تیرا بھلا ہوگا
دنیا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے　　اور جاتا ہے یاں سے - جانا تجھے آخر ہے
کچھ راہ خدا دیجا - جا تیرا بھلا ہوگا
جو رب نے دیا تجھکو - تو نام پہ رب کے دے　　گر یاں نہ دیا تو نے - واں دیویگا کیا بندے
کچھ راہِ خدا دے جا - جا تیرا بھلا ہوگا
دنیا کے کیا کرتا ہے سینکڑوں تو دھندے　　پر کام خدا را بھی تو کر لے کوئی بندے
کچھ راہ خدا دے جا - جا تیرا بھلا ہوگا
دیگا تو اُسی کو تو - وہ جس کو ہے دلواتا　　پر ہے یہ ظفر تجھ کو - آواز سُنا جاتا
کچھ راہ خدا دے جا - جا تیرا بھلا ہوگا

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں - ٹپے ٹھمریاں - پہیلیاں - سیٹھنیاں - کیا کیا لکھوں ؛

ایک دن ٹہل رہے تھے - حافظ ویران ساتھ تھے - بہ تقاضائے استنجا

سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں۔ جن سنگلاخ زمینوں میں قلم کو چلنا مشکل ہے اُن کا نظام دسرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔ والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے۔ طرحیں خوب نکالتا ہے۔ مگر تم سرسبز کرتے ہو۔ ورنہ شورزار ہوجائے۔ مسوّدۂ خاص میں کوئی شعر پورا۔ کوئی ڈیڑھ مصرع کوئی ایک۔ آدھا مصرع۔ فقط بحر اور ردیف قافیہ معلوم ہوجاتا تھا۔ باقی بخیر۔ یہ اُن ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حُسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے۔ ایجادی فرمائشوں کی حد نہ تھی۔ چند شعر اس غزل کے لکھتا ہوں جس کے ہر شعر کے نیچے مصرع لگایا ہے:۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا — یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجھ کو — عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خمِ دخمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا — کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر — ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

ایک بڈھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا۔

ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

حضور نے سُنا۔ ایک دو مصرعے اس پر لگا کر اُستاد کو بھیج دیے۔ انہوں نے دس دوہرے لگا دیے۔ حضور میں کنچنیاں ملازم تھیں۔ اُنہوں نے یاد کر لیے۔ دوسرے دن بچہ بچہ کی زبان پر یہی گیت تھا۔ دو بند یاد رہ گئے:۔

ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا +

ایک شب والد مرحوم کے پاس آکر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے۔ لاؤ یہیں کہہ لیں۔ کئی فرمائشیں تھیں۔ ان میں سے یہ طرح کہنی شروع کی محبت کیا ہے۔ صورت کیا ہے۔ مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ حضرت زمین شگفتہ نہیں۔ سکوت کرکے فرمایا۔ کہنے والے شگفتہ کر ہی لیا کرتے ہیں۔ پھر یہ دو مطلعے پڑھے :-

سودا

نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے  نہیں ہے اعتبار اس کا یہ مُنھ دیکھے کی الفت ہے

میر

بگولے سے جسے آسیب صرصر سے زحمت ہے  ہماری خاک یوں برباد ہوا ے ابر رحمت ہے

اتفاق۔ فرماتے تھے کہ ایک دن بادشاہ نے غزل کا سودہ دیا اور فرمایا کہ اسے ابھی درست کرکے دے جانا۔ موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھاؤ پر تھا۔ میں دیوان خاص میں جاکر اسی رُخ پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور غزل لکھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پُشت پر ایک صاحب انگلے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا۔ آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا "غزل ہے"۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعاگوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کس زبان میں؟ میں نے کہا اُردو میں۔ پوچھا آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی خاص موقع ہو تو اُس میں بھی کہنا پڑتا ہے۔ ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کرسکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کرسکتا۔ پوچھا۔ آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا۔ نہیں۔ فرمایا۔ کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا کہ ہمارا لب ولہجہ اُس سے موافق نہیں۔ وہ ہمیں آتی نہیں

بیٹھ گئے۔ اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ اُنھوں نے قریب جاکر خیال کیا۔ تو کچھ گنگنا رہے ہیں۔ اور چٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اس وقت اُس کا خیال آ گیا۔ پوچھا کہ یہ جوتی پر آپ چٹکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا۔ اس کے لفظ تال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں +

حافظ ویران کہتے ہیں۔ ایک دن عجب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ مطلع ہوا کہ ؎

ابرو کے اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی　　تلوار آج ماہِ لقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا۔ اُستاد مرحوم متوجہ ہوے۔ اُنھوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا۔ تو کھاری باؤلی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی۔ اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ ویران سُن رہے تھے۔ ہنس کر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے۔ آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ انھیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا۔ اہلِ ذوق کے لطفِ طبع کے لیے لکھ دیا۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ ایک دن حضور میں غزل ہوئی جس کا مطلع تھا ؎

آج ابرو کی ترے تصویر کھنچ کر رہ گئی　　سُنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کھنچ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتبِ تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں۔ طولِ کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں +

ایک دفعہ دوپہر کا وقت تھا باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ردیف الالف

[illegible]

ہوا حمدِ خدا میں دل جو مصروف قلم میرا
الفؔ الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نامِ محمدؐ لب پہ یارب اوّل و آخر
اُلٹ جائے بوقت نزع جب سینہ میں دم میرا

محبت اہلبیتِ مصطفےٰ کی نور برحق ہے
کہ روشن ہو گیا دل مثلِ قندیلِ حرم میرا

دکھائی مجھکو راہ شرع اصحابِ پیمبر نے
چراغ راہ ہے اکرام اصحابِ کرم میرا

کہیں شاہِ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا
کہ ہے دُرِ نجف ہو کر چمکتا دُرِ یتیم میرا

رہیگا دانہ افشاں مزرعِ اُمید بخشش میں
غمِ آلِ نبیؐ سے دانہ ہر اشک نم میرا

شہ بغداد کا خط غلامی ذوق رکھتا ہوں
نہ کیوں دل میں خطِ بغداد سے ہو جامِ جم میرا

[illegible]

ہوا ایسا سینہ یکسر خار زارِ دشتِ غم میرا
کہ آیا پا بجوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

صراطِ عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دمِ شمشیرِ قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا

مری خواری کے رتبہ کا کمالِ اوج تو دیکھو
کہ ہے چرخِ زحل بھی سایۂ بختِ دژم میرا

وہ ہوں میں آتشیں گل تازہ نخلِ شمعِ اُلفت کا
نہیں ہے کوئی گلچیں غیر مقراض ستم میرا

نشانِ بے نشانی گر دکھائے زور مٹ جائے
جھجک سے دیدۂ صراف کی نقشِ درم میرا

روان ریگ رواں ہو جائے آبِ اشکِ مژگاں سے
کدورت بار ہے دیکھو سحابِ رنج و غم میرا

وہ ہوں میں آہوئے وحشی رمیدہ دامِ ہستی سے
کہ ہے اک کوچۂ رم جادۂ دشتِ عدم میرا

جھپکتی آنکھ شب جوں حلقۂ زنجیر کیا میری
طلسمِ خواب منزل تھا سرِ الف الم میرا

کہوں کیا تنگ دہن سے جو سبب قطعِ آرزو نے ل
لبِ تبریز تنگ پہ ہے جوں لبِ شمشیر دم میرا

مری افسردہ حالی گر چمن آرائے دل سردی
عجب کیا شیر برفیں ہو اگر شیرِ علم میرا

بھیجولا کام فعی میں نے ولی اینک جہاں ٹپکا
ذفا ہے جام سے یک قطرہ زہرابِ غم میرا

ہے۔ صاحب نے کہا۔ وِل یہ کیا بات ہے۔ دیکھئے ہم آپ کا زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی۔ بہت مشکل معاملہ ہے۔ اُنھوں نے پھر کہا کہ وِل ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپ ہمارا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اسے کہتے ہیں کہ اُس میں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح کریں جس طرح خود اہلِ زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا۔ بھلا یہ کیا زبان ہے۔ اسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے اسے زبان کا خراب کرنا کہتے ہیں +

اللّٰھم تمم بالخیر

باندھوں میں مضموں جو اپنی شور بختی کا کوئی
ہو زمین شعر میں عالم زمینِ شور کا

میں وہ ہوں نخچیر جس کو دیکھتا ہے وقتِ ذبح
دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہرِ ساطور کا

اس نزاکت پر نظر کرنا کہ وہ رشکِ پری
بال بھی باندھے جو مستی پر تو زلفِ حور کا

دل کا یہ احوال ہے غم سے ترے اے مستِ ناز
جیسے مرجھایا ہوا دانا کوئی انگور کا

نقشِ دل میں وہ ہوں کہ آ کر داغِ سوزاں پر مرے
اُڑ گیا مرہم کے پھاہے سے اثر کافور کا

گر ترے فریادیوں کے نامۂ پیچیدہ کو
لب پہ رکھ کر پھونکئے پیدا ہو نالہ صور کا

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجب غماز ہے
قصہ پہنچایا زبانِ دار پر منصور کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سے تیز ذہن
تین دن جائے اگر تو یہ میری گور کا

زخم میرا ہے وہ ایذا دوست خوں تک نہ لے
منہ سے گر جراح کے سن پائے نام انگور کا

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
وائے قسمت ہو گئی روزن میں گھر زنبور کا

دفن ہے جس جا پہ کشتہ سرد مہری کا تری
بیشتر ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

تو ہو بعد از مرگ بھی گر اے محبت دستگیر
استخواں سے ہو مری دستہ ترے ساطور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

دل بے وحشت اب تلک بھی شاخِ آہو کی طرح
پیچ کھاتا ہے دھواں میری چراغِ گور کا

دیکھنا زہرآب پیکانِ محبت کا اثر
چشمِ افعی بن گیا روزن ہر اک ناسور کا

کھینچے مانی اُس پری کی کیونکہ تصویر کفک
جمع ہو جب تک نہ رنگِ سرخ روئے حور کا

تیرے قامت سے جو ہو برپا قیامت سر بسر
کام لے منقار سے فریاد قمری صور کا

ذوق راہِ عشق وہ کوچہ ہے جس کی خاک میں
ہے درِ تاجِ سلیمان بیضہ بیضِ مور کا

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورتِ تصویرِ نہالی
کیا اُٹھے سرِ بسترِ غم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

ہوا روشن چراغِ کعبہ زاہد جن کے شعلے سے — اُسی آتش کا کھٹکا ہے شررِ سنگِ صنم میرا
نہ ہوئے وہ قرب ترک سجدۂ ابلیس سے آدم — عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا
وہ ہوں میں گیسوئے موجِ محیطِ اعظمِ وحشت — کہ ہے گھیرے ہوئے روئے زمیں کو پیچ و خم میرا
مری صورت کے معنی ہیں نفختُ فیہِ من روحی — حدوثِ بے ثبات اثبات کرتا ہے قدم میرا
وہ ہوں میں رہ نوردِ شوق میرے ساتھ جاتا ہے — بہ رنگِ سایۂ مرغِ ہوا نقشِ قدم میرا

تخیل نے مرے باندھا طلسمِ تازہ کیفیت
نہ کیوں ہو کاسۂ سر ذوق رشکِ جامِ جم میرا

لکھنؤ سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح میں آئی۔ شہر میں چرچا ہوا کہ ان شعروں پہ شعر نہیں ہو سکتے۔ شاہ نصیر مرحوم اُستادِ وقت تھے۔ اُن کی صحبت میں بھی یہ باتیں پہنچیں۔ اُستاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چکی تھی۔ مگر آدابِ شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ اُن کی خدمت میں گئے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ میاں ابراہیم تم نے بھی وہ غزل دیکھی۔ یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ عرض کی حضرت سُنتا ہوں ایسی تو نہیں جیسی لوگ کہتے ہیں فرمایا پھر تم نہیں کہتے؟ کہا۔ جو ارشاد ہو۔ اُنہوں نے فرمایا کہ ہم بھی کہیں گے۔ تم کیوں نہیں کہتے۔ دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں۔ جبھی اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ وہ غزلیں پھر لکھنؤ گئیں وہاں بھی تعریفیں ہوئیں +

شوقِ نظارہ ہے جب سے اُس رخِ پُرنور کا — ہے مرا مرغِ نظر پروانہ شمعِ طور کا
اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اِس رنجور کا — دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا
گر لکھوں مضمون اپنے نالۂ پُر شور کا — ہو صریرِ خامہ سے میں کام بانگِ صور کا
لُطف پاتا ہے سمجھ نالۂ پُر شور کا — خونِ دل پینا ہے یہ کھانا مجھے سیندور کا
نزع میں بھی دھیان تھا اُس نرگسِ مخمور کا — شعلۂ شربت میں مزا آیا ہے انگور کا
وادیِ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا — ہر اک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ دور کا
تیرے کوچہ میں تنِ لاغر ترے رنجور کا — اک غبارِ ناتواں ہے کاروانِ مور کا

تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہمپایا نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے
تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

کیا تھا یا نہ تھا سب ہم پہ گزرا
فلک تو نے کیا اپنا نہ پایا

سُراغِ عمرِ رفتہ ہاتھ کیا آئے
کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملکِ فنا کی
کہ اس بازار میں سودا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا
غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیشِ کژدم
کبھی خوش فہم کو سیدھا نہ پایا

تہِ خنجر ترے بسمل نے سہے ہے
ذرا قابو تڑپنے کا نہ پایا

ترے مجنوں کی تربت پہ جنوں نے
بگولے کے سوا سایا نہ پایا

فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو
نکل جاتے مگر رستا نہ پایا

جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا
کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا

چراغ و داغ سیکڑوں میں ڈھونڈا
اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا

وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی نے
خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا

یہی ہر دم ہے زخمِ دل کو رونا
دہن پایا لبِ گویا نہ پایا

کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم
غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا

سوا تیرے خطِ مشکیں کے کوئی
مجرب نسخۂ سودا نہ پایا

وہ بولے دیکھکر تصویرِ یوسف
سُنا جیسا اُسے ویسا نہ پایا

کیا ہم نے سلام اے عشق تجھکو
کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا

نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل
ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا

جوں دانۂ روئیدہ تہِ خاک ہمارا
سر زیرِ گراں بارِ الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغِ معاصی مرا اُس دامنِ تر سے
جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا

پردہ درِ کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسارِ صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی
اے راہروِ مُلکِ عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق
کچھ فائدہ بے دستِ کرم اُٹھ نہیں سکتا

کام منظور ہے توفیق کے اسباب بنا
دل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

واہ کیا مرہمِ زخمِ دلِ بیتاب بنا
آب سے نشترِ سرتیز کے تیزاب بنا

نہ بچے اشک کے دریا سے مری سوزشِ دل
کر دیے شعلۂ جوالہ کو گرداب بنا

دلِ بیتاب کو ہم سینہ میں ٹھہرا نہ سکے
شعلۂ خور دیکھتے ہی تجھ کو وہ سیماب بنا

پوچھیں گر مجھ سے کہ ہے عشق ہوئی کب سے تلخ
کہوں جس دن سے فلک کاسۂ زہراب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب
کہ مری خاک سے بھی جامِ مئے ناب بنا

تیرہ روزی نے مری مہرِ جہانتاب کا نور
جب اُڑایا تو وہیں کرمکِ شب تاب بنا

اسے پچھتاتا ہوں کیوں اُس سے کیا میں نے نگاہ
کہ جو اب پھرتا ہوں میں طرح سے بیتاب بنا

سرمۂ چشمِ عزیزاں نہ بنا میں اے چرخ
کیا بنا خاک غبارِ دلِ احباب بنا

آیتِ سجدہ ہے ثابت ہیں مرے جوہرِ تیغ
ہے خمِ تیغ فقط کیا خمِ محراب بنا

خالِ عارض سے ہے جو ہندوے خدا ترس تو کیا
ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے میرے حبیب
میں ہوں اک شمع پئے محفلِ احباب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پرآب بنا

آہ کے ساتھ جو نکلا شررِ آتشِ دل
چرخ پہ جا کے وہ خورشیدِ جہانتاب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق

خواہر عالمگیر کی قبر بھی تھی۔ اس میں ایک بالاخانہ مرمت کر کے درست کروا دیا۔ شاہ صاحب وہیں جا رہے۔ شام کو اُستاد اور والد مرحوم وہاں جاتے تھے۔ شیخ ناسخ کا پہلا دیوان اُنہی دنوں ہمارے ہاں آیا تھا۔ اُس کی غزلوں میں سے کوئی مصرع لیتے تھے اُسی پر اُستاد غزل کہتے تھے۔ والد مرحوم لکھتے تھے۔ شاہ صاحب سنتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے۔ عجب گلزار صحبت تھی +

یوں تنِ خاکی پہ دل روشن ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کوئیں کی تہ میں تارا[1] ہو گیا

میرے نالوں سے جو پانی سنگِ خارا ہو گیا
کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہو گیا

ذکرِ دنیا نفسِ مُردہ کو ہوا آبِ حیات
مر کے یہ سیماب پھر زندہ دوبارا ہو گیا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ کے
میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارا ہو گیا

ہر حبابِ بحر کی کھل جائیگی تارا سی آنکھ
عکس افگن گر رُخِ روشن تمہارا ہو گیا

رشک سے اُس زلف کے کیا مشک ہی کیسر ہے خوں
بلکہ جل کر سوختہ عنبر بھی سارا ہو گیا

شیخ نے افطاریوں کے تر نوالے کھائے خوب
ہے مگر روزوں کی گرمی سے چھوارا ہو گیا

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امیدِ وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ
ہو گئے جس طرح کوئی دم گذارا ہو گیا

دل پہ زخموں کی ترقی سے عجب آئی بہار
آگے تھا صد برگ یہ گُل اب ہزارا ہو گیا

ظلمتِ عصیاں سے میرے بن گیا شب روزِ حشر
آفتاب اک نیزہ پر دمدار تارا ہو گیا

چشمِ مستِ یار میں آخر ہوئی سُرخی عیاں
لو ہمارا خونِ پنہاں آشکارا ہو گیا

ذوق اِس بحرِ فنا میں کشتیِ عمرِ رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا

[1] کوئیں کی تہ کا تارا۔ یا کوئیں کا تارا۔ زبان اُردو کا محاورہ ہے۔ کبھی نہایت گہرے اور پُرانے کوئیں میں دیکھتے ہیں۔ اندھیرے کے سبب سے کچھ نظر نہیں آتا۔ غور سے کہ اندر پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والا کہتا ہے۔ وہ پانی کا تارا چمکتا ہے۔ کبھی کہتے ہیں بڑا عمیق کنواں ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔ پانی دور کہیں تہ میں تارا چمکتا ہے +

| | |
|---|---|
| مرے طالع کی وہ گردش ہے جس سے | فلک نے بھی ستارا صلا نہ پایا |

نظیر اُس کا کہاں عالم میں لے ذوق
کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا

۱۲۴۵ھ میں ایک بزرگ کہن سال حافظ علی شاہ نام اورنگ آباد ملک دکن سے وارد دہلی ہوئے۔ اور قلعہ میں آبدار خانہ شاہی کے داروغہ کے پاس اُترے۔ وہاں اُستاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ صاحب دل صاحب معرفت شخص تھے۔ طرز معاشرت سے معلوم ہوا کہ خاندانی رئیس تھے۔ امیری چھوڑ کر فقیری اختیار کی تھی۔ زبان سے نہ کہتے تھے مگر ٹیپو سلطان اور خواتین مدراس کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ شامل تھے۔ باوجود اس کے علوم رسمی سے آگاہ تھے۔ شعر و سخن کا مذاق بہت خوب تھا۔ اُستاد سے تھوڑے عرصہ میں بہت رابطہ بڑھ گیا اُستاد نے والد مرحوم کو بھی ملایا۔ شاہ موصوف اُستاد کی غزلیں اپنی بیاض میں لکھواتے تھے۔ اور فرمائشیں کر کے کہواتے تھے طبیعت کی آزادی اور بے نیازی اُن کی خداداد سلطنت معلوم ہوتی تھی۔ کئی مہینے کے بعد دفعتہً غائب ہوگئے۔ بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا رہ گیا اُس وقت اکبر شاہ بادشاہ تھے +

۱۲۶۰ھ میں دفعتہً پھر آئے۔ کہا ہمیں نثار علی شاہ خطاب ہوا ہے۔ یہ زمانہ تھا کہ دلی کے ٹوٹے پھوٹے تخت پر بہادر شاہ بیٹھے تھے اُستاد کی شاعری اوج پر اور اختیارات موج پر تھے خلیفہ اسمعیل کو سرکار شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں۔ انہی میں تیول شاہی (املاک و باغات) بھی سپرد تھے۔ شاہ صاحب ہمارے ہاں اُترے۔ مگر فرمایا کہ فقیر کو شہر میں رہنا مناسب نہیں کوئی جگہ باہر ہونی چاہیے کہ اوقات میں خلل نہ ہو +

شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی اُستاد مرحوم رہتے تھے۔ باہر ایک باغ بادشاہی تیس ہزاری[۱] باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں۔ زیب النسا بیگم

[۱] اب تیس ہزاری باغ صاف ہوگیا۔ وہاں ریل چلتی ہے۔ زیب النسا کی قبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہے فادخلی جنتی۔ عالمگیر کی کہی ہوئی تاریخ تعویذ پر کندہ تھی +

چند شعر اِس غزل کے عالمِ شباب میں کہے تھے۔ وہی زبان زدِ خلائق تھے پھر ۱۲۶۶ھ میں تیس ہزاری باغ میں غزل پوری کی تھی۔

اِس تپش کا ہے مزہ دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا

آسماں دردِ محبت کے جو قابل ہوتا
تو کسی سوختہ کا آبلۂ دل ہوتا

چھوڑتا ہاتھ سے ہرگز نہ کبھی بسملِ شوق
دامنِ برق اگر دامنِ قاتل ہوتا

چینِ پیشانی اگر تیری نہ ہوتی زنجیر
نالۂ دیوانہ تھا جو پابہ سلاسل ہوتا

کرتا بیمارِ محبت کا مسیحا جو علاج
اتنا دق ہوتا کہ جینا اسے مشکل ہوتا

ذبح ہونے کا مزہ جانتا گر صیدِ حرم
آپ گردن پہ چھری پھیر کے بسمل ہوتا

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں مرے
زلف ہوتا ترے رخسار پہ یا تِل ہوتا

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکل کر یوسف
جذبۂ شوقِ زلیخا جو نہ کامل ہوتا

موت نے کر دیا ناچار و گرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا

آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

سینۂ چرخ میں ہر اخترِ اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہوئی گر عقدہ کشائی نہ یداللہ کے ساتھ
ذوق حل کیونکہ مرا عقدۂ مشکل ہوتا

جو رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا

کسی رنج کش کو دیتا تو کچھ اس کو سود ہوتا
دلِ سخت کاش کافر حجر الیہود ہوتا

تری بزم میں تو جلتا کہ تجھے بھی بو پہنچتی
جو یوں ہیں تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

جو نہ ہوا امید واشد نہ ہو دل گرفتہ غنچہ
کہ قبول تنگ رہنا نہیں بے کشود ہوتا

لبِ نازک اُس کا کیونکر کہو بارِ حرف اٹھائے
کہ جو صدمۂ تبسم سے بھی ہو کبود ہوتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِّ راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

میں ہجر سے مرنے کے قریب ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آ پہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اب جان پہ آفت ہے جو آئے ہو دوبارہ
اک بار تو غارت دل و دیں ہو ہی چکا تھا

سینہ جو کیا چاک تو واں کچھ بھی نہ پایا
کیا جل کے جگر خاک کہیں ہو ہی چکا تھا

برہم اُسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے اے زلف
اے دل وہ ابھی چیں بجبیں ہو ہی چکا تھا

ہوتا جو نہ پیوندِ زمیں تیری گلی میں
آسودہ یہ دل زیرِ زمیں ہو ہی چکا تھا

آنے سے مرے ٹھہر گئے آپ وگرنہ
جانے کا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

جو خط میں لکھا اُس نے وہ لکھنے سے بھی پہلے
مکتوب سرِ لوحِ جبیں ہو ہی چکا تھا

بے بدرقۂ مرگ توقف رہا ورنہ
تجھ بن سفرِ جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

کیا ہوتا جو سمجھاتے اسے جا کے مرے دوست
دشمن کا سخن ذہن نشیں ہو ہی چکا تھا

کیا دیکھتے ہم یوسفِ کنعاں کو کہ اپنا
منظورِ نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا

کیا گرمِ تپش ہوتا تڑپ کر ترے آگے
میں سرد تہِ خنجرِ کیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکمِ ازلی ذوق یوہیں ہو ہی چکا تھا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی سنہ ۱۲۶۰ ہجری:-

محفل میں شورِ قلقلِ مینا سے غل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا قُل ہوا

دریائے غم سے میرے گزرنے کے واسطے
تیغِ خمیدہ یار کی لوہے کا پُل ہوا

پروانہ بھی تھا گرمِ تپش پہ کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

آئی تھی اندروں کی نہ ہرگز سمجھ میں بات
آوازہ گو بلند مثالِ دہل ہوا

جن کی نظر چڑھا ترا رخسارِ آتشیں
اُن کا چراغِ گور تا حشر گُل ہوا

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کُل ہوا

اُس بن رہا چمن میں بھی میں ذوق دلخراش
ناخن سے تیز تر مجھے ہر برگِ گُل ہوا

مذکور تری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دم آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں گھٹتا مرا دم سینہ میں غم سے
کس وقت مرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

میں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یاں تک
کافر تجھے کچھ خوف خدا کا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آتا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمر جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

ساتھ اُن کے ہوں میں سایہ کی مانند ولیکن
اس پر بھی جدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

دل مانگتا مفت اور پھر اس پہ تقاضا
کچھ قرض تو بندہ پہ تمہارا نہیں آتا

بیجا ہے ولا اُس کے نہ آنے کی شکایت
کیا کیجیے کا فرمائے اچھا نہیں آتا

خالی رہی زلفوں کی لٹک دل سے ہمارے
افسوس کچھ ایسا ہمیں لٹکا نہیں آتا

جو کوچۂ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا
کیا جانے مزہ کیا ہے کہ جیتا نہیں آتا

آئے تو کہاں سے کہ جانا ہی سے کوئی جا کے
جب تک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوقؔ وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا
تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا

شب ہم نے بہتیرا جو کیا توبہ کا ساقی
مغرب سے سحر مہرِ درخشاں نکل آیا

تنگ آکے جو دم تن سے نکل جائے تو جانو
زنداں سے کوئی قیدیِ زنداں نکل آیا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

تہ خاک ہوتا ظاہر جو سلگنا اپنے دل کا
تو شرارِ سنگِ تربت میں بھی اپنے دُود ہوتا

جو ہے سر گذشتہ اُس کو نہیں دینا سر کا مشکل
کہ وہ سر بکف نہ ہوتا جو نہ دستِ جود ہوتا

جو رقیب سر بکف ہیں کبھی ہوتے سر بکف بھی
ترے جاں نثار کا گر انہیں دستِ جود ہوتا

ترے در کی جبہ سائی اگر اشک اپنے کرتے
سرِ قطرہ قطرہ پیدا اثرِ سجود ہوتا

کوئی زہر نوش مجھ سا نہیں پہنچا ذوقؔ ورنہ
شجرِ زقوم دوزخ میں بھی خشک دود ہوتا

نیمچہ یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا منہ اُسے میدانِ اجل میں مارا

اُس نے جب مال بہت ردّ و بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اٹھا اپنی بغل میں مارا

اجل آئی نہ شبِ ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

عشق کے ہاتھ سے نہ قیس بچا نے فرہاد
اس کو گر دشت میں تو اس کو جبل میں مارا

دل کو اس کاکلِ پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

کھینچ کر عشق جفا پیشہ نے شمشیرِ جفا
پہلے اک ہاتھ مجھی پر تھا ازل میں مارا

چرخ بدبیں کی کبھی آنکھ نہ پھوٹی سو بار
تیر نالے نے مرے چشمِ زحل میں مارا

ہم لے جانا تھا تبھی عشق نے مارا اُس کو
تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا

اُس لب و چشم پہ ہے زندگی و موت اپنی
کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا

کون سنتا ہے تری راہ میں دل کی فریاد
کہ مسلماں کو ہے کافر کے عمل میں مارا

عُرس کی شب بھی مری گور پہ دو شیون لائے
پتھر اُس گنبدِ تربت کے کنول میں مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں
کانٹا سمجھئے سیہ کا یا گل کنیر کا

مجنوں کی روح دشت میں مانند گردباد
کرتی طواف تھی ترے مجنوں کے ڈھیر کا

ہیں اس دہن کے ملنے کے رستے تو سینکڑوں
پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا

دم آ چکا ہے لبوں پہ سب آنکھوں میں انتظار
بے دید جلد آ کہ نہیں وقت دیر کا

چھوڑا نہ ایک دانۂ اختر سحر تلک
گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب بھنگیر کا

کوٹھے پہ اُن کے خوب بنے آج رات کو
تھا یا کہ آ گیا جو سہارا منڈیر کا

ہوتے زبان حال سے مضمون ہیں واہ وا
جس میں نہ اختلاف زبر کا نہ زیر کا

زیبا ہے ذوق خرقۂ درویش مرد کو
ہر قمع کبھی نہ پائے گا نام دشیر کا

یہ غزل بھی وہیں لکھی تھی:۔

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا
سن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

بل بے گداز عشق کہ خوں ہو کے دل کے ساتھ
سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلّو پانی میں ایمان بہ گیا

ہے موج بحر عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بیچارہ مشتِ خاک تھا انسان بہ گیا

دریائے اشک سے دم تحریر حال دل
کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
نالہ سا ایک سوئے بیابان بہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعلِ بدخشان بہ گیا

کشتی سوار عمر ہیں بحر فنا میں ہم
جس دم بہا کے لے گیا طوفان بہ گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان[1] بہ گیا

[1] سندھستان کیا محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا یا کسی کام کا وقت گزر جاتا تو کہتے تھے۔ اب وہ پانی ملتان بہ گیا یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریائے راوی چلا ہوا بہتے بہتے ملتان کی جانب سے چل کر پنجاب کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا اور دریائے سندھ میں جا پڑتا ہے پھر اسے ادھر آنے کا موقع نہیں پس جب کسی امر فوت شدہ کے باب میں کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اس کا موقع گذر گیا۔ اب نہ ہو سکیگا۔

ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہر مقصود — دریا سے تہی پنجۂ مرجاں نکل آیا
رات آہ تپاں یوں سینہ سے اک شعلہ سا چمکا — میں نے تو یہ جانا۔ دلِ سوزاں نکل آیا
ناقوس ایہ کس دل سے کیا نالۂ جانسوز — یاں دل کا دھواں آہ سے پیچاں نکل آیا
علامت بھی ہے کیا شے کہ الگ یوسفِ گلعلی — دریائے مقتل سے عزیزاں نکل آیا
ہے کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ — جب کھودا کنواں گنجِ شہیداں نکل آیا

دل رکھ کے کہیں ذوق کا ہم بھول گئے تھے
تھا گم وہ کئی دن سے مگر ہاں نکل آیا

ہر اک سے ہے قول آشنائی کا جھوٹا — وہ کافر ہے ساری خدائی کا جھوٹا
نہ کیوں تیرے دانتوں سے جھوٹا ہو موتی — کہ دعویٰ کیا تھا صفائی کا جھوٹا
ہوا بخت دامن سے جب اُن کے سچا — ہوا ہاتھ اپنی رسائی کا جھوٹا
بناتا ہے آئینِ اُلفت میں مجھ کو — یہ شیوہ تری بیوفائی کا جھوٹا
ترا قول ہاتھوں میں چمکا رہا ہے — نگیں خاتمِ دل ربائی کا جھوٹا
اُڑا کر کیا رنگ الفت کو رُخ نے — یہ ساغر ہے کہربائی کا جھوٹا
مرے پیلیکے پیوے اگر موت پاوے — یہ پانی مریضِ جدائی کا جھوٹا
مجھے نعمتِ خلد ہووے جو پاؤں — ترے در پہ ٹکڑا گدائی کا جھوٹا
گئے طاقِ ابرو میں تھے حضرتِ دل — سو دعوے ہوا یا رسائی کا جھوٹا

خدا جانے ہے ذوق جھوٹا کہ سچا
نہیں ہے وہ ہے آشنائی کا جھوٹا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی:۔

یاں تک عدو زمانہ ہے مردِ دلیر کا — جھلتے ہیں منہ شکار کئے پر بھی شیر کا[1]

[1] شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ جب شیر کو شکار کرتے ہیں تو وہیں سے گھاس پھوس کا پولا بنا کر اسے آگ دیتے ہیں اور شیر کا منہ جھلس دیتے ہیں کہ کوئی بدنیت اس کی مونچھ کا بال نہ لے جائے اور اپنے دشمن کا خون نہ کرے۔ ان بالوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں اور پان کی رگوں میں چبھو کر کھلا دیتے ہیں۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

مجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یا تک کہ جب میرا
تو تو آنسو مری آنکھوں سے نکلا سرخرو نکلا

گھسے سب ناخن تدبیر اور ٹوٹی سر سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ ہرگز وہ کبھو نکلا

اُسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو
جسے یاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا

جب نیم جاں ہوں کوچۂ قاتل میں لوٹتا
قاتل ہے لوٹنے پہ مرے دل میں لوٹتا

لیلیٰ کے شوق وصل میں مجنوں کو دیکھنا
کیا کیا ہے راہ ناقہ محمل میں لوٹتا

غیرت سے دیکھ دیکھ تری گرم جوشیاں
میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

دی لب نے تیرے غنچہ کو اکسیر مسکرات
گل ہو کے ہے جو پائے عنادل میں لوٹتا

کعبہ کا رخ ہے اور ترے درد فراق سے
میں اے صنم ہوں پہلی ہی منزل میں لوٹتا

دل کا سا ہوتا گر دُرِ غلطاں کو اضطراب
پھرتا تمام دامن ساحل میں لوٹتا

سودائیوں کے دل پہ تری یاد زلف میں
اک سانپ سا ہے قید سلاسل میں لوٹتا

کس کس مزے سے لوٹتے ہیں میکدہ میں مست
ہے ایک جو ایک سفال میں لوٹتا

بے آب تیغ ماہی بے آب کی طرح
اے ذوق دل ہے سینۂ بسمل میں لوٹتا

یہ غزل ناتمام ہے۔ عین عالم شباب کے شعر ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ قافیے اور مضمون ہیں ہمارے خیال میں۔ کبھی کہینگے۔

[illegible]

عالم ہے زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا

جلوہ ہو کیونکہ خاک پہ تب ماہتاب کا
بلتے انہیں نے برق سے دامن سحاب کا

اے گر نہ چھیڑتا دامن سحاب کا
دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا گلاب کا

اس گل بغیر طوطی بسمل سے کم نہیں
سبزہ مزار عاشق پر اضطراب کا

صد پارہ دل ہے گنجفۂ عشق ہو گیا
اور ہر ورق پہ نقش ہے حکم آفتاب کا

یہ غزل شیخ ناسخ کی غزل پر لکھی تھی۔ **مطلع**

سروِ عاشق ہو گیا اُس غیرتِ شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے ہے مبارکباد کا

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیاد کا

روزِ مرگِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن
ہے بجائے شورِ ماتم غل مبارکباد کا

آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں سایہ سخت جاں
کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اِس فولاد کا

کچھ گدازِ عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے
کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا

ہو سبق آموزِ شوخی گر پری کو چشمِ شوخ
کام لے موجِ نگہ سے سیلیِ استاد کا

سوزشِ غم سے ہزاروں داغ جل جل کے چٹے
ہو گیا میرا کفن جامہ مگر حدّاد کا

سروِ موجِ آب جو سے پائے در زنجیر ہے
دیکھ لو آزاد کو یہ حال ہے آزاد کا

آبداری سے تری تلوار میں پیدا ہو گیا
آب زہرہ سخت جانی سے مری فولاد کا

یاد کرتا ہے مجھی کو پہلے وقتِ قتلِ عام
کیوں نہ میں کشتہ ہوں اے قاتل تری اِس یاد کا

میں ہوں چکر میں لگی جس دن سے دنیا کی ہوا
حال میرا ہے بعینہ آسیائے باد کا

سر ترے کشتہ کا دیکھے گا نہ ہرگز روئے خاک
لے اُڑے گا شوقِ پابوسی اسے جلاد کا

سلسلہ میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی
ابجدِ عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

یوں تو ہے استادِ شیطاں پر کہوں کیا تجھکو دل
تو تو شاگردی میں بھی اُستاد ہے استاد کا

ذوق حیراں ہے بہت فکرِ کشادِ کار میں
یا علی مشکلکشا یہ وقت ہے امداد کا

میرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا
دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

میرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
اگر خورشید نکلا تیرا گرمِ جستجو نکلا

مئے عشرت کا تھا خمخانۂ افلاک پر دھوکا
کہ تھا لبریزِ غم اِس خمکدہ سے جو سبو نکلا

ترے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے روبرو نکلا

نالہ اس شور سے کیوں میرا دہائی دیتا
اے فلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تِل میں ہے دکھائی دیتا

دے دعا وادیٔ پُرخار جنوں کو ہر گام
داد یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارہ تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے درد جدائی دیتا

پنجۂ مہر کو بھی خون شفق میں ہر صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دستِ حنائی دیتا

روشِ اشک گرا دینگے نظر سے اِک دن
ہے ان آنکھوں سے یہی مجھ کو دکھائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

کون گھر آئینہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جاروب صفائی دیتا

ساغرِ مے بھی ترے کشتۂ انداز کو یار
بوسۂ لب نہیں ہے چشم نمائی دیتا

منہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر نہیں آگے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

یہ غزل بھی تمیں ہزاری باغ کی بہار ہے۔

نکتہ اس بت سے کبھی لیوینگے ہم ایمان کا
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کام ہے شیطان کا

جھوٹ ہی جانو کلام اس رہزنِ ایمان کا
پہن کر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

جو دلِ پُر آرزو سے نکلا نالہ عشق میں!
ایک پُتلا تھا سراپا حسرت و ارمان کا

بن گیا جوشِ محبت سے ہمارے سینہ میں
ماہیٔ دریائے خوں جوہر ترے پیکان کا

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتے ہیں انساں بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

یہ تپِ غم کی ہے شدت اس ترے بیمار کو
یوم راحت بھی ہے حق میں اسکے دن بحران کا

اے اجل تکلیف مت کر کیا کرے گی آنکر
ہو چکا پہلے ہی کشتہ میں کسی کی آن کا

ہو سکے آلودہ دامن پاکدامن کس طرح
اے زلیخا چھوڑ دامن یوسفِ کنعاں کا

ہے دل جلوں کے واسطے یہ نامہ بر تو خوب / اڑنا مگر محال ہے مرغِ کباب کا

ٹپکے اگر عرقِ گلِ رخسار سے ترے / دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا

اے آفتاب تیرے رخِ تابناک سے / کیا کیا چمک رہا ہے ستارہ حباب کا

ہوتا ہے دل جلوں سے کہیں ذوقؔ ضبطِ آہ / موجِ دخاں سے ضبط نہ ہو پیچ و تاب کا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں پھوڑا اٹکا / چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف / کب تک اٹکا رہے دم آنکھوں میں تھوڑا اٹکا

توسنِ عمرِ رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا / کبھی میدانِ فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا

بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح / سامنے میرے ذرا بھی نہ بگوڑا اٹکا

لے گئے مر کے بھی اے ذوقؔ رکاوٹ دل میں / ہاتھ تلوار کا جو یار نے چھوڑا اٹکا

عالمِ شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہو گیا تھا۔ اور آخر عمر میں آ کر غزل پوری ہوئی ۱۲۶۸ھ میں تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا / کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خواروں کا / دیجئے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شورِ فغاں ہو کہ چمن میں بلبل / خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسیٰ / ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

ہوں رگیں حلقِ بریدہ کی ہمارے خونبار / گر تماشا انہیں منظور ہو فواروں کا

اے ستمگر جو ترے تیر نہیں تشنۂ خوں / تو کھلا رہتا ہے منہ کس لئے سوفاروں کا

کیوں نہ ہر تار میں دل ہو دیں گرفتار کہ زلف / جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا

دینگے جاں بوسۂ لعلِ نمکیں پر ہم بھی / جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا

بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوقؔ / رو سیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا

پہنچیگا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر
مکتوب شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا

تو جس سے ملے ہے مری آنکھ سے سو در
ٹپکا جو پڑ گیا ہے تجھے انتظار کا

ہے دل کی داؤ گھات میں مژگاں سے چشم یار
کرتی ہے قصد نئی کی او جھل شکار کا

قاصد لکھوں لفافہ کو خطِ غبار سے
تا جانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

اس روئے تابناک پہ ہر قطرہ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

اے ذوق ہوش گر ہے تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کا چمن ہے:۔

خطر ہے خون سے دل پائمال کے کیسا
بچا ہے دیکھنا دامن سنبھال کے گیا

بغل سے لے گئے دل کو نکال کر وہ صریح
جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے کیسا!

کسی کے رخ پہ ہے جو گی جو چشم بند و زار
تو اس کے گھیرے ہیں مژگان بال کے کیسا

نمود خال کی دیکھو تو زیر ابروئے یار
ستارہ نکلا ہے نیچے ہلال کے کیسا

ہماری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے آ قاتل
اٹھا ہے فتنہ یہ بعد انفصال کے کیسا

شب فراق میں اُس مہ بیں کے انجم چرخ
مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے کیسا

ہزار دم ہیں اُسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر مجھ کو ٹال کے کیسا

پرانی غزل تھی میرے سامنے دوبارہ سنائی تھی۔

میں کہاں سنگ دریا رہے ٹل جاؤنگا
کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

نالہ کہتا ہے کہ تا چرخ زحل جاؤنگا
ملک میں توڑ کے اس کو بھی نکل جاؤنگا

آج اگر راہ نہ پاؤنگا تو کل جاؤنگا
کوچۂ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤنگا

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لے جا مجھ کو
جا کے میں واں ترے تابوے نکل جاؤنگا

[illegible]

نفسِ بے مقدور کو قدرت ہو گر تھوڑی سی بھی
دیکھیو پھر سامان اس فرعون بے سامان کا

دیکھنا اے ذوقؔ ہو گئے آج پھر لاکھوں کے خون
وہ جماتا ہے لبِ لعلیں پہ لاکھا پان کا

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپ ہی مر رہا ہو اس کو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیرِ نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہو اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانے کے
تری زلفوں نے مشکیں باندھ کر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دیکر
جو اس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ یاں رونا ہے مثلِ قلقلِ مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

مرے آنسو ہمیشہ ہیں برنگِ لعل غرقِ خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل لوٹتا ہے تم نے کیا جانے
ادھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگینِ خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے
اگر تیشہ سرِ کہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دلِ بدخواہ میں تھا مارنا یا چشمِ بد بیں میں
فلک پر ذوقؔ تیرِ آہ گر مارا تو کیا مارا

میں وہ شہید ہوں لبِ خندانِ یار کا
ہنستا ہے چراغ بھی میری مزار کا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

آتا ہے گر تو آ کہ سینہ سے چل لب
آنکھوں میں آ کے ٹھیرا ہے دم انتظار کا

ہو پاکدامنوں کو خلشِ گر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

پوچھے ہے کیا حلاوتِ تلخابۂ سرشک
شربت ہے باغِ خلدِ بریں کے انار کا

## نامرد مرد۔ مرد جواں مرد ہوگیا

پرانی غزل تھی۔ میرے سامنے نظرثانی کی۔

پانی طبیب دیگا ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا
کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا
چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا
پھر دل میں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور
لو پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا
پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا مرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا
جل کر اگر بجھا بھی دل سوختہ مرا
یوں جل اٹھیگا جیسے کہ کوئلا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینہ میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

استاد کے مسودہ سے جس دن یہ غزل میں نے لکھی۔ فرمایا کہ عجیب اتفاق ہوا ایک دن میاں نثار علی شاہ تشریف لائے۔ حسب عادت غزل کی فرمائش فرمائی میں نے بھی یہ غزل کہی تھی۔ انہیں سنائی۔ خوش ہوئے۔ بہت عنایت کی اور چلے گئے۔ دوسرے دن سنا کہ چلے ہی گئے۔ کاش کوئی اور غزل سناتا۔

جدا ہوں یار سے ہم اور نہ ہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا
تری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستاں سے عندلیب جدا
الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے موذن جدا خطیب جدا
تمہارا درد جدائی نہ ہو جدا مجھ سے
حروف درد میں ہو حکمت طبیب جدا
ہے اور علم و ادب مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا
ہجوم اشک کے ہمراہ کیوں نہ ہو نالہ
کہ فوج سے نہیں رہتا کبھی نقیب جدا
فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک ابتک
الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا
کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر
نہ کر سکا مرے دل سے غم حبیب جدا

مدرسہ میں بھی اگر جاؤنگا تو جاے کتاب
شیشۂ بادہ لئے زیر بغل جاؤنگا

دیکھ کر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاس ادب
ہوں جو خورشید تو یاں سر کے بل جاؤنگا

دل یہ کہتا ہے مجھے روزن سینہ سے نکال
ورنہ خوں ہوکے میں آنکھوں سے نکل جاؤنگا

سرد مہروں سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ
نخل سرمازدہ کی طرح سے جل جاؤنگا

آنکھ سے اشک صفت مجھ کو گرا کر نہ اٹھا
دل نہیں ہیں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤنگا

کہتا وحشت سے یہ ہے جامۂ پیری میرا
دیکھ کپڑا ہوں پرانا ابھی چل جاؤنگا

عقل سے کہدو کہ لائے نہ یہاں اپنی کتاب
میں ہوں دیوانہ ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

اے صنم در پہ نہیں دیر میں جا بیٹھوں گا
کچھ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ بہل جاؤنگا

قیس و فرہاد کو بتلاؤں گا کچھ عشق کی راہ
اب کے میں گو طرف دشت و جبل جاؤنگا

گر پڑا آگ میں پروانہ دم گرمئ شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤنگا

کہتا ہے پیراہن گل ہے یہ نزاکت سے نسیم
ہاتھ مجھکو نہ لگانا کہ نکل جاؤنگا

سنتے ہو زاہد و ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے
کیا بدل دیوینگے یہ۔ اور میں بدل جاؤنگا

میں وہ مشتاق شہادت ہوں کہ سر دینے کو
پائے کوباں تہ شمشیر اجل جاؤنگا

جنبش برگ صفت باغ جہاں میں آکے ذوق
کچھ نہ ہاتھ آئے گا تو ہاتھ ہی مل جاؤنگا

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہوگیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہوگیا

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہوگیا

سو بار مر کے عاشق جاں باختہ ترا
لڑنے کو پھر کھڑا روش نرد ہوگیا

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانند گردباد
جب خاک اڑائی ہم نے تو وہ گرد ہوگیا

اس صید تیر خوردہ کو تو نے کیا نہ ذبح
آخر تڑپ تڑپ کے یونہیں سرد ہوگیا

آ اے مرے چمن کے گل درد دیکھ لے
عاشق کا رنگ زرد زر ورد ہو گیا

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق

مصحفِ رخ پہ ترے رنگ سنہرا ہے چڑھا
واہ کیا خوب ہے سونا سرِ قرآن چڑھا

آنکھ تو ٹک لگی پر کوئی بھی اس دل کے سوا
فوجِ مژگاں کے نہ منہ پر سرِ میدان چڑھا

بوالہوس جاتے ہیں گر دام میں آہو کی طرح
چلّۂ ابرو کی کماں پر ترے قربان چڑھا

دیکھو قسمت کا لکھا اس نے پڑھا خط سو بار
دھیان پر میرا نہ مطلب کسی عنوان چڑھا

نگہِ یار کو دے سونپ متاعِ دل و جاں
چور قسمت سے نظر اپنی نگہبان چڑھا

سنگِ سرمہ میں یہ تاب کہاں تھی وہ تیغِ نگاہ
گردشِ چشم نے پر دی ہے غضب سان چڑھا

کشتۂ دستِ حنا بستہ ہوں ان ہاتھوں سے
کبھی دو پھول تو لا کر تو مری جان چڑھا

اشک آئے نہ مرا حشر تلک یہ کیا یاروں نے بھی
پانی سو نیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

حضرتِ عشق کی درگاہ میں آ کر اے ذوق
دل و دیں دیتے ہیں سب گبر و مسلمان چڑھا

---

نیمچہ جب مول وہ بانکا جواں لینے لگا
موت کے جی میں مرے رنج جاں لینے لگا

تیر بغلی میں لیا اس نے لیے جانِ عدو
رشک میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا

نام میرا سن کے مجنوں کو جمہائی آ گئی
بید مجنوں دیکھ کر انگڑائیاں لینے لگا

مجھ کو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روزِ حشر
مجھ سے یہ کس دن کے بدلے آسماں لینے لگا

ہے جو غنچوں کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
یہ بلائیں کس کی باغ اے باغباں لینے لگا

جس نے کی اس میکدہ میں بیعتِ دستِ سبو
وہ قدم تیرے بس اے پیر مغاں لینے لگا

لے کے آئینہ جو دیکھی حسن کی اپنی بہار
اپنے بوسے آپ وہ غنچہ دہاں لینے لگا

آ کے دل پر جب کبھی کرنے لگے تیغِ نگاہ
چشم کی گردش سے وہ کارِ فساں لینے لگا

ذوقِ حسن و عشق روشن ہو گیا سب بزم پر
شمع کی گلگیر جو منہ میں زباں لینے لگا

موت اس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

رات کو اے ذوق اس کے نوکِ مژگاں کا لیا
تن پہ ہر موئے مرے کارِ سناں لینے لگا

کریں جدائی کا کس کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کی غزل ہے سنہ ۱۲۶۰ ہجری۔

شکر پردہ ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا
ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

تھا نہ پامال رہ عشق کی تربت کا نشاں
بارے تعویذ تو نقش کف پا نے رکھا

تلخکامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر
استخواں کو مرے منہ پر نہ ہما نے رکھا

آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جا کر
ایک تنکا بھی نہ تھا باد صبا نے رکھا

دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اسکو
پا بہ زنجیر تری زلف دوتا نے رکھا

آنکھیں بیدار طلب گور سے آئی ہیں نکل
دستہ نرگس کا نہیں میرے سرہانے رکھا

پے ناواقف رہ پہلے ہے رہبر موجود
گور سے آگے قدم دیکھ عصا نے رکھا

ناتواں ہیں نہ تن زار مرا دیکھ سکا
خوب دھوکے میں اسے تار قبا نے رکھا

نہ رکھی خوبی وحشی سے غرض آئینہ وار
گھر میں مہمان جسے اہل صفا نے رکھا

کیا تماشہ ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا
نام مجنوں مرا اس ہوش ربا نے رکھا

شربت مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر
لیک ناکام اسے آب بقا نے رکھا

نہ گیا مرنے بھی اس مصحف رخسار کا شوق
کہ رہا گور پہ قرآن سرہانے رکھا

بے نشاں پہلے فنا سے ہو جو ہو تجھ کو بقا
ورنہ ہے کس کا نشاں ذوق فنا نے رکھا

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا
سر پہ شیطان کے یاں اور بھی شیطان چڑھا

عشق کے دھب پہ نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا

توسن وحشت اگر اپنا زمیں چڑھ جائے
ابھی افلاک کو دیں خاک بیابان چڑھا

دل نے کب دیکھا مہ نو کو جو ابرو کافر
لے کے شمشیر ہے سینہ پہ مرے آن چڑھا

دیکھنا ملت و دیں دونوں ہیں برباد آج
باد کے گھوڑے پہ وہ دشمن ایمان چڑھا

وہ مستِ ناز لیکر مجھ سے میرے شیشۂ دل کو
ہوا خوش اسقدر گویا کہ ہاتھ اُسکے حلب آیا

نوشتہ سے ہوا اک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم
جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا

برنگِ غنچہ خونیں دل ہنسے کیا اس گلستاں میں
بھر آیا منہ میں خوں گر اک تبسم زیرِ لب آیا

وہ آئیں یا نہ آئیں میں نہیں رنجیدہ دل ان سے
مگر یہ رنج ہے کیوں رنج انکو بے سبب آیا

لگائی زلف کو شانہ نے جو انگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا

ترے در سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

میں اپنے ذوق کے قربان کہ مستی میں محبت کی
بلایا کس نے اسکو جب یہ آیا بے طلب آیا

اُتارا تو نے سر تن سے گرانی شامت کے مارے کا
تو کچھ او لگا نہ میں احساں ترے تنکا اتارے کا

مجھے طاقت میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جانا ہے کافی آتشِ دل کے شرارے کا

ستارے دیکھ کر موتی تمہارے گوشوارے کا
کھینگے ہے ہمارا نور صدقہ اس ستارے کا

نفس ہے جادۂ عمرِ رواں جسطرح سے گزرے
یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستہ گذارے کا

جسے کہتے ہیں بحرِ عشق اسکے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

ترا ہر موئے مژگاں دل کو انگشتِ اشارت ہے
سمجھنے والا مجھ سا چاہئے پر اس اشارے کا

ملے اکسیر گر اس کشتۂ خواب نہیں نہ لوں ہرگز
مرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کرنا پارے کا

منید حول دل ہوں چاندنی کے پھول کیا مجھ کو
دکھا دو خندۂ دنداں نما اس ماہ پارے کا

نہ پکڑیں دامنِ دریا اس گردابِ بلا میں ہم
کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

مرے گھر میں تو ہو ماہ سراج السیر بجلے تے
کیا غیروں میں پیدا حکم کیونکر قطب تارے کا

سرِ راہِ فنا میں ہوں مہیا ہے سفر لیکن
برنگِ اشکِ مژگاں منتظر ہوں اک اشارے کا

گنہ رحمت سے اُس کی بخشوائے دل نے رد و کر
چھڑک کر ہم نے بیچا نفع پر سودا خسارے کا

ڈھلکتا ہے مثالِ دانۂ تسبیح کیوں منکا
کہ جب ٹھیرا سفر دنیا سے کیا کام استخارے کا

فقط تارِ نفس کا ذوق خطِ جادہ کافی ہے

پہنچا آبِ تیغِ قاتل تا لبِ سر اچھا ہوا
اے دلِ مجروح لے تو غسل کر اچھا ہوا

ایک دن بالکل نہ میں اے چارہ گر اچھا ہوا
داغ اِدھر تازہ ہوا گر زخم اُدھر اچھا ہوا

کم نہ ہو اس آبِ خنجر کی الٰہی آبرو
آج مدت میں ہمارا حلق تر اچھا ہوا

آرہی گا دشت میں لیلیٰ ترے ناقہ کے کام
ہو گیا مجنوں جو کانٹا سوکھ کر اچھا ہوا

روز کہتا تھا مزا مجھ کو چکھانے عشق کا
بھر دیا نون اس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

سن کے مجنوں نے مرے شورِ جنوں کو یہ کہا
واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

بندھ گیا اس مو کمر کا جبکہ مضمونِ کمر
ہو گئی مضموں میں دقت شعر پر اچھا ہوا

مجھ کو صدقہ کر اگر ہے بد مزہ تیرا مزاج
یہ اِدھر صدقہ دیا تو نے اُدھر اچھا ہوا

ہاتھ تو اوچھا پڑا تھا یار کی شمشیر کا
زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا

کھنچ گیا میری طرف سے اور بھی دلبر کا دل
واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا

قتل کرتا ہے ترا بسمل سے یہ کہنا کہ لو
اب تو دامن بھی ہوا لوہو سے تر اچھا ہوا

نامہ بر جاتا ہے جا جلدی چلی جانِ حزیں
دیر مت کر ساتھ تیرے ہم سفر اچھا ہوا

آئینہ خانے میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال
تا تجھے جانیں کہ یہ صاحب نظر اچھا ہوا

ہے برا تو ہی اگر آیا نظر تجھ کو برا
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

ذوق کے مرنے کی سن کر پہلے تو کچھ رک گئے
پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر اچھا ہوا

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے وہ شوخ کب آیا
اگر چہلم کو بھی آیا تو ہم جانیں گے اب آیا

چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ عیش و طرب آیا
بہاریں تو جب لوٹیں گے اگر وہ غنچہ لب آیا

خلافِ وعدہ کے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا
نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا

عجب حیرت میں ہوں جب سے نظر وہ خال لب آیا
دہن اس کا عدم ہے اور عدم میں نکتہ کب آیا

تو پی لے تشنہ کامی یارے آبِ خنجرِ قاتل
گلو تک میرے اور زخمِ گلو کے تا بلب آیا

تامل کیجو ذوقِ طپیدن۔ دیکھئے کیا ہو
کہ اب تک ذبح کرنے کا نہیں قاتل کو ڈھب آیا

نہ کرتا ضبط میں گریہ تو اے ذوق اک گھڑی میں
کٹورے کی طرح گھڑیاں کے غرق آسماں ہوتا

لڑکپن کی غزل تھی نظرِ ثانی سے اصلاح کی۔

آنکھیں مری تلوؤں سے وہ مل جائے تو اچھا
یہ حسرتِ پابوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمارِ محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو خبر اس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دلِ انساں کو نہ وہ زلفِ سیہ فام
سانپ اسکو اگر آ کے نگل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تنِ خشک کو غرق آب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیرِ محبت تو عجب حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

[illegible] تری تارِ نفس سینہ میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو سامانِ ثمرِ نخلِ محبت
یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تری اٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر وہ ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہیں ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یہاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطعِ رہِ عشق میں اے ذوق ادب شرط
یاں شمع نمط سر ہی کے بل جائے تو اچھا

سنہ ۱۲۶۰ھ
سبک ہے خنجرِ قاتل سے یہ گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پئے لہو میرا

مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کب آنے دے
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا

نہ پہنچا گردنِ جاناں تک اور ٹوٹ گئے ہائے
پڑا گلے میں مرے دستِ آرزو میرا

سیلِ عمرِ رواں کیا جانے رستہ گذارے کا

نالہ ہے اُن سے بیاں دردِ جدائی کرتا
کام قاصد کا ہے یہ تیرِ ہوائی کرتا

پنجۂ شانہ کو دیتا ہے فلک کب ناخن
جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرتا

دیکھتا اُس بتِ مغرور کا گر جاہ و جلال
کبھی فرعون نہ دعوائے خدائی کرتا

خاک آئینہ سے ہے نامِ سکندر روشن
روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا

نہیں گوش شنوا باغِ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

بند آنکھیں کئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے
ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

سوزِ دل کون بجھائے کہ نہیں چشم میں اشک
پر ہے کچھ خونِ جگر کار روائی کرتا

بیٹھ رہئے تو قفس ہے عجب آرام کی جائے
پر ہے بے چین ہمیں شوقِ رہائی کرتا

ذوق اس پائے نگاریں کا جو ہے وصف نگار
اشکِ خونی سے ہے کاغذ کو حنائی کرتا

پُرانی غزل تھی۔ نظرِ ثانی میں نئی ہوئی۔

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے اِک نیا اور آسماں ہوتا

ابھی ٹھنڈا بھلا کیونکر شہیدِ تفتہ جاں ہوتا
کوئی دم شمعِ مردہ میں بھی ہے باقی دھواں ہوتا

کہے ہے مرغِ دل اے کاش میں زاغِ کماں ہوتا
کہ تا شاخِ کماں پہ اس کی میرا آشیاں ہوتا

عزاداری میں ہے کس کی یہ چرخِ ماتمی جامہ
کہ جیبِ چاک کی صورت ہے خطِ کہکشاں ہوتا

نہ ہوتی دل میں گر کاوش کسی کی نوکِ مژگاں کی
تو کیوں تن میں مرے ہر موئے تن شکلِ سناں ہوتا

نہ رکھتا گر نہ رکھتا منہ پہ دانہ یہ مریضِ غم
مگر تیرا میسر بوسۂ خالِ دہاں ہوتا

اگر جی کھول کر میں تنگنائے دہر میں روتا
تو جوئے کہکشاں میں بھی فلک تک خوں رواں ہوتا

بگولا گر نہ ہوتا وادیٔ وحشت میں اے مجنوں
تو گنبد ہم سے سرگشتوں کی تربت پہ کہاں ہوتا

ترے خونیں جگر کی خاک پر ہوتا اگر سبزہ
تو شکلِ موئے مژگاں اُس سے پیہم خوں رواں ہوتا

رکاوٹ دل کی قاتل کے بوقتِ ذبح ظاہر تھی
کہ خنجر تھا مری گردن پہ رُک رُک کر رواں ہوتا

جاہلِ منکر نہ آئے راہ پر معجزے سے بھی
جہل سے بوجہل اپنے نام سے ناداں ہی رہا

حلقۂ زنجیر میں بھی دل رہا پا در رکاب
توسنِ وحشت ہمارا گرم جولاں ہی رہا

کب لباسِ دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
خانۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

حلقۂ گیسو میں دیکھی کس کے رخسارے کی تاب
شب مہِ ہالہ نشیں سر در گریباں ہی رہا

مدتوں دل اور پیکاں دونوں سینے میں رہے
آخرش دل بہ گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا

سب کو دیکھا اس نے اور اسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

آگے زلفیں دل میں بستی تھیں اور اب آنکھیں تری
ملکِ دل اپنا ہمیشہ کافرستاں ہی رہا

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگِ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوقؔ کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

طلسمِ طرفہ تر آنسو نے میرے مردماں باندھا
کہ ہے اک اک گرہ میں حاملِ صد بحر و کاں باندھا

ترے جوڑے کے کھلنے نے مرا دل دلستاں باندھا
عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا

یہ بہتاں کس نے افشائے محبت کا یہاں باندھا
جو بعد از مرگ تو نے منہ کو میرے بدگماں باندھا

ہوئی تشہیرِ نعشِ ناتواں کی جب تو پاؤں میں
کوئی تارِ نگاہِ مور جائے ریسماں باندھا

کیا مجنوں مجھے آشفتگیِ زلف نے کس کی
کہ میرے سر پہ مرغِ شانہ سر نے آشیاں باندھا

ترا ہنسنا جو یاد آیا برنگِ قہقہہ مینا
تو میں نے تار اک رونے کا لے کے ہچکیاں باندھا

تڑپ کر دامنِ زیں کو نہ آلودہ کرے خوں سے
بھلا فتراک سے کیوں تو نے صیدِ نیم جاں باندھا

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
مجھی پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدزباں باندھا

وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد اپنی
مرے مرقد پہ چلہ دشمنوں نے دوستاں باندھا

اڑا دینگے دھوئیں اک آن میں اس چرخِ گرداں کے
اگر حلقہ دھوئیں نے دل کے زیرِ آسماں باندھا

نہیں بلا سے کوئی یار عشق میں اے دل
کہ غمگسار ہوں میں تیرا اور تو میرا

مقام وجد میں آئیں ابھی ملائک عرش
جو میکدے میں نہیں شور ہائے ہُو میرا

عجب نہیں ہے مری سوزشِ محبت سے
کہ تار شمع ہو ہر ایک تار مُو میرا

برنگِ آئینہ چشمِ پُر آب سے میرے
گرا نہ اشک۔ کیا پاس آبرو میرا

نہ آئے سائے نگہِ یار تجھ کو کچھ غیرت
کہ آگے تیغ اجل کے ہو سرفرو میرا

کروں میں کیا کہ گریبان صبح کی مانند
نہیں ہے چاک جگر قابلِ رفو میرا

نظر جو آتا ہے اب تک فلک کا رنگ سیاہ
پڑا تھا سایۂ بختِ سیہ کبھو میرا

ہمیشہ میں ہوں اسی داؤ گھات میں اے ذوق
کہ رام ہو وہ غزالِ پلنگ خُو میرا

نہ ہوا آبِ شہادت سے گلو تر نہ ہوا
مستعد جب وہ ہوا ہائے تو خنجر نہ ہوا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا

بے چراغ اسکو نہ رکھ داغِ الم سے اے عشق
خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہ ہوا

کب صبا آئی ترے کوچے سے اے یار کہ میں
جو حبابِ لبِ جو جامہ سے باہر نہ ہوا

ق

خون رگہائے گلو لاشۂ بے سر سے مرے
آکے کب جوش پہ فوارہ سے ہمسر نہ ہوا

عشق یہ معجزہ کیسا ہے کہ اس کشتہ کے
موئے سر حلق سے پیدا ہوئے اور سر نہ ہوا

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جسکو وہ جاں بر نہ ہوا

جان کے دل میں سدا جینے کا ارماں ہی رہا
دل کو بھی دیکھا کئے یہ بھی پریشاں ہی رہا

بعد مردن بھی خیالِ چشمِ فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت مرا وقفِ غزالاں ہی رہا

میں ہمیشہ عاشقِ پیچیدہ مویاں ہی رہا
خاک پر روئیدہ میری عشق پیچاں ہی رہا

پستۂ قندی ہے کام غیر میں وہ لعل لب
پر مرے حق میں تو سنگِ زیرِ دنداں ہی رہا

بند ہو سکا ہم سے نہ مضموں اس دہانِ تنگ کا
ہاتھ اپنا فکر میں زیرِ زنخداں ہی رہا

[illegible]

لذت کو تیغِ عشق کی سن سن کے بوالہوس
آ کر طمع سے حلق بریدوں میں مل گیا

گر بعد فقر پھر سگِ دنیا ہوا فقیر
کمبخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

آخر کو شیخ بیعتِ دستِ سبو سے آج
پیرِ مغاں کے بن بھی مریدوں میں مل گیا

دکھلائے نمکداں سے نمک چاک سینہ رات
اس ماہوش کے سینہ دریدوں میں مل گیا

اس شکل سے ہوا وہ طلبگار دید یار
صاف آئینہ کا نقش ندیدوں میں مل گیا

حسبِ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حرص
تھا اگرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

سنہ ۱۲۶۰ھ کی جمن بند کا ہے :-

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے اجل آنے میں اس کے
اور دم مرا جانے میں توقف نہیں کرتا

تا صاف کرے دل نہ مے صاف صوفی
کچھ سود و صفا علم تصوف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے مرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ میں تف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خط غیر مرا واں کسی عنواں
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گزرے نہ دل میں تیرے کافر
یاد اس لئے میں سورۂ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

یہ غزل ہے جس پر شاہ نصیر مرحوم سے قطع تعلق ہو گیا تھا (دیکھو صفحہ ۲)

ہر گام پہ رکھے ہے دو دیدہ ہوش نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوش نقشِ پا

افتادگاں کو ہے سر و ساماں نہ جا ہیو
داماں خاک ہوتا ہے روپوش نقشِ پا

اعجاز پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
بول اٹھے منہ سے ہر لبِ خاموش نقشِ پا

افسارہ گذر نہیں کو ہو لی فرصت مقام
بیٹھے ہے نقشِ پا بہ سر دوش نقشِ پا

جسم نزار خاک نشینان کوئے عشق
یوں ہے زمیں پہ جیسے تن و توش نقشِ پا

فلک وارستۂ پیری نہ دے ہے کوئی پرِ خرد شوں کو
گیا ہی آخرش زنجیر سے پیلِ دماں باندھا

بلا ہوں مضطرب میں بھی کہ مجھ سے برق نے جگر
حصار اک گرد اپنے شعلۂ جوالا ساں باندھا

مرا دل آ گیا ہی سینہ میں اک پیڑا سا لگتا ہے
خیالِ خطِ سبزِ یار نے کیوں برگِ پاں باندھا

دلِ مجروح پہ میرے نہ سمجھو داغِ حسرت کا
پرِ طاؤس اس زخمی نے بہرِ دوستاں باندھا

کہاں دل بھاگ کر جاوے کہ تیرے نخلِ قامت نے
عجب اک گرد نامہ خط نے اے سروِ رواں باندھا

تپِ سوزِ محبت کے لئے چارہ نہیں تم سے
یہ گنبدِ نیلگوں گردوں پہ کیوں آشفتہ جاں باندھا

سمجھ کر موجِ دریائے فنا کو تختۂ سرتاسر
کفن مثلِ حباب اے ذوق ہم نے سر پہ یاں باندھا

بھڑک کیا کہوں سینہ میں اپنے آتشِ غم کا
کہ جلتے ہیں بہ ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصۂ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا
کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

ترے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آبِ دمِ خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آبِ زمزم کا

برنگِ طوقِ قمری کوئی نکلے ہے لگا لے تو
کمندِ گردنِ دل ہے جو حلقہ زلفِ پُرخم کا

ترے رخسار کا پرتو پڑے گر عارضِ گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پہ ہر قطرہ شبنم کا

سئے جاتے ہیں کس سے زخم اس تیغِ تبسم کے
کہاں کھلتا ہے بخیہ سوزنِ بیٹے مریم کا

دلیرانِ محبت کو خلش ہے اس کی مژگاں کے
لبِ مردن تک بھی ہے عالم جاہ و رستم کا

خراش سینہ میں اک رہ گیا ہے ٹوٹ کر ناخن
غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ پھاہا ہے مرہم کا

اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکساروں پر
تعجب کیا کہ ابلیسِ لعیں دشمن ہے آدم کا

خط اس کا وصل کی دولت کا ہے پیغام اے قاصد
لگا قسمت سے نسخہ ہاتھ یہ اکسیرِ اعظم کا

شہیدائے ذوق سینہ میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں
مری جو آہ ہے گویا وہ ہے اک نخلِ ماتم کا

یہ گلدستہ تیس ہزاری باغ میں بنایا تھا سنہ ۱۲۶۱ ہجری:-

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

آغاز شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کا ایک قلمی دیوان کتب خانۂ آزاد میں موجود ہے اُن کی بھی ایک غزل اسی طرح میں درج ہے۔

رکھتے تھے جو کشور کسرے و قیصر زیر پا
ہے انہی کا آج سر با تاج و افسر زیر پا

اے جنوں! ہم پا برہنہ۔ گرم پتھر زیر پا
دوپہر ہے۔ سایہ بھی بیٹھا ہے چھپکر زیر پا

تم چلو رکھ کر جو میرا دیدۂ تر زیر پا
پل ہوں بحر اشک پر مژگاں سراسر زیر پا

خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیر عشق
اب تو پارس ہوگا جو آئیگا پتھر زیر پا

میری آنکھوں کو ملو تم لے کے تلوؤں کے تلے
کیوں نشے میں توڑتے ہو رکھ کے ساغر زیر پا

ہے ہمارے کشتۂ قامت۔ بجائے جا نماز
اے قیامت لا بچھا دامانِ محشر زیر پا

زیر دستی پر بھی ہے موذی سے لازم احتراز
جب دبیگا سانپ کاٹیگا مقرر زیر پا

ہیں ترے مجنوں کے مژگاں وادیٔ وحشت کے خار
راہ آنکھوں کے نکل آئے ہیں چبھکر زیر پا

بو نہ گل سیدھی کے گلبن برشکِ گل کھلوں یوں
آ کھڑا ہو رکھ کے میرا کاسۂ سر زیر پا

فاتحہ عاشق کا دیتا ہے تو واجب ہے ادب
اپنے کفشِ پا کو رکھدے پاسے باہر زیر پا

میں ہوں وہ کشتیِ شکستہ بحر الفت میں صبا
ایک تختہ رہ گیا ہے جس کے بچ کر زیر پا

نصرتِ تن کو ذوق سب غارت کرے گا ایکدن
چونٹیوں کا پھر رہا ہے یہ جو لشکر زیر پا

اسی عالم میں یہ غزل ایک مرشدزادہ[1] کی فرمائش سے کہی تھی۔ انہیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اُسی کے لئے غزل کہوائی تھی۔ نظر ثانی اس پر بھی نہیں ہوئی۔

دشمنِ جاں یک بیک سارا زمانہ ہوگیا
ہائے تاثیر محبت یہ ستم کیا ہوگیا

تم ہی تھا یا مجھ ہی تھا دل بچھڑ کہو کیا ہوگیا
دل کے جانے کا تو عالم کو اچنبھا ہوگیا

جس کو لے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہوگیا
سوکھ کر ایسا ہوا دُبلا کہ کانٹا ہوگیا

[1] مرشدزادہ۔ اہل قلعہ کے محاورہ میں عموماً شہزادہ کو کہتے تھے۔ اور جو شہزادہ قرابت قریبی کے لحاظ سے ایک وقت میں دعویدار سلطنت کے ہو سکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے۔ مثلاً شاہ موجود کا چچا۔ بھائی وغیرہ وغیرہ۔

فیضِ برہنہ پائی مجنوں سے دشت میں — ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

پابوسِ دلربا کہ اپنی تو خاک بھی — پہنچی نہ ذوق اُس کے بآغوشِ نقشِ پا

اب ردیف الف کی وہ غزلیں لکھتا ہوں جن کا حال دیباچہ کے صفحہ ۲۶ میں لکھ چکا ہوں۔ ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے۔ یا خود یاد آجاتے تو سناتے۔ اور عجب محبت سے فرماتے۔ یہ ہمارے بچپن کا کلام ہے۔ نظرثانی کرینگے۔ پھر دیوان میں داخل کرینگے۔ اور کچھ کچھ اصلاح کرتے بھی جاتے تھے۔ مگر والد مرحوم کے تقاضوں سے۔ اور میری حاضرباشی سے۔ جس مسودے کو درست کر دیتے تھے۔ نئی غزل مرتب ہو جاتی تھی۔ ہائے۔ وقت تھا کہ گزر گیا۔ یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں۔ اور نہیں پاتا۔ اب جو کچھ ہے یہی غنیمت ہے جیب میں نقل کر دیتا ہوں۔ ضائع ہوئے تو یہ یادگار بھی نہ رہیگی۔ موئی مٹی کی نشانی اسے کہتے ہیں۔ انتہائے کلام تو سب سن چکے۔ ابتدائے کلام آزاد سے سنو۔

جل اٹھا شمع نمط تارِ رگِ جاں میرا — آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا

ہلتے دیکھے جو لبِ زخم تو بولا قاتل — آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا

کرکے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ — دیکھ تر کیجو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

اے جنوں! دن سے سوا رات کو روشن کرنے — مہرِ گردوں ہو جو داغِ دلِ سوزاں میرا

خارِ وحشت سے کبھو چھوڑ دے دامن دل کا — ہے خطِ جادہ ترا چاکِ گریباں میرا

دھیان میں آئینۂ رخ کے گئی جان نکل — رہ گیا ہائے کھلا دیدۂ حیراں میرا

اے جنوں تو کہیں ہو دنیا میں یونہیں خانہ خراب — خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا

نظمِ معنی کا بکھر جائے ابھی حرف سے حرف — باندھیں گر اہلِ سخن حالِ پریشاں میرا

خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھ دو — دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لبِ خنداں میرا

اپنا رونا مجھے ہنسنے سے مبارک ہو ذوق — دیکھ خنداں ہو جو وہ دیدۂ گریاں میرا

زلف کہتی ہے دُرِ گوش سے دکھلادے کوئی
گر سرِ چشمہ سے ناگن کو ہو ٹلتے دیکھا

کج ادائی گئی کب ہم سے ترے ابرو کی
شاخِ آہو سے ہے خم کس نے نکلتے دیکھا

اشک کو لیتا نہ دامن میں تو کیا کرتا میں؟
گاہوارہ ہے یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آبِ حیات
تجھ کو دانتوں پہ مسی ہے کبھی ملتے دیکھا

کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے
اُن کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

خانۂ دل کے سوا آتشِ غم سے اے ذوق
سامنے آنکھوں کے گھر کس نے ہے جلتے دیکھا

برنگِ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغِ جہاں میں غنچۂ تصویر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآں با تفسیر دل میرا

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے تارِ اشک سے مسطر
کریگا شرحِ دردِ عشق کچھ تحریر دل میرا

سنبھالے رکھ ذرا اے آسماں دیکھ اپنے دامن کو
زمیں پر کھینچتا ہے نالۂ شبگیر دل میرا

بتوں کی سرد مہری نے کھلا دی زعفراں لیکن
کرے کیا گرمجوشی ہو گیا کشمیر دل میرا

تری چشمِ فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو
کیا ہے اک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

تصور میں کسی تیغِ نگہ کے کشورِ الفت
ہوا تسخیر کر کے صاحبِ شمشیر دل میرا

ہو اگر حُسن کی دولت سے تم ہو سنگِ پارس
ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل میرا

کبھی منت کی زنجیر اُن کو پہنا سے دیکھا تھا
ہے اب تک پہنے تارِ اشک کی زنجیر دل میرا

نشاں تو رہنے دے قاتل ذرا سا خوں لگا دامن میں
قیامت میں ترا تا ہوئے دامنگیر دل میرا

بتوں کا عشق ہے گر ذوق تو ساری خدائی میں
کریگا شہر شہر اک دن مجھے تشہیر دل میرا

یہ بھی ابتدائی شوق تھی۔ شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہہ دیتے تھے ان دنوں کی غزلوں میں انہوں نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب جوشِ طبع عالمِ طفولیت میں ہوتا ہے تو ایسے ذوق شوق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اُسی عہد کے خیال ہیں

ہم نے اُن سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور وہاں کیا ہو گیا

بادہ گلگوں نے جو رنگِ رُخ کو روشن کر دیا
پہلے تھا گلرنگ مکھڑا پھر بھبھوکا ہو گیا

جب اُٹھا تابوت تیرے کشتۂ حسرت کا آہ
شورِ ماتم تھا کہ اک عالم میں برپا ہو گیا

تم نے کل عزمِ سفر کا ہم کو بھیجا تھا پیام
لو سفر یاں آج دنیا سے ہمارا ہو گیا

پھر چلیو لے حضرتِ دل ہو چکا ملنا بس اب
آج گھر میں غیر کے پھر اُن کا رہنا ہو گیا

مرنا جینا ایک جہاں کا ہے نگاہوں پر تری
جس نظر سے آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھ کو تو اُس میں نام بھی پورا نہ تھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

وہ تو خود شعلہ تھا جب میں نے کہا شعلہ خو
اس لطیفے سے بھڑک کر آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اُڑ کر اگر پہنچا تو کیا
تیرے جانے کا تو اک عالم میں چرچا ہو گیا

گرم ہو کر آتا ہے منہ پر مرے طفلِ سرشک
دیکھ کیا اے چشمِ تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغِ نگہ نے ایک عالم کا ہے خون
نام بدنام اے ستم ناحق قضا کا ہو گیا

یادِ زلفِ عنبریں میں رات یہ آہیں بھریں
گنبدِ گردوں سیہ سارے کا سارا ہو گیا

ذوق نے جو زلف کو چھیڑا تو لگے کہنے تم
تو نے خود چھیڑا اُسے اور برہم اتنا ہو گیا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
اے صنم پر ترا پتھر سا نہ پگھلتے دیکھا

ضعف سے سینہ میں آتا ہے مرا دم جس طرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں سے چلتے دیکھا

تھا میں اس باغ میں نخلِ گلِ آتشبازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

اُس رُخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو فروغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

اے صبا جنبشِ سبزہ کے سوا کس کو بھلا
مورچھل گورِ غریباں پہ ہے جھلتے دیکھا

جو چڑھا اوجِ فنا پر وہ گرا سایہ نمط
پاؤں اس کو نہ ٹکے یہ ہے سبک پھسلتے دیکھا

کوئے جاناں میں گئے دل جیسا گیا قابو سے
ہم نے بچے کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا

خط شرح ناتوانی ہوگیا اڑتے ہی آہ
جوں پر کمزور بازوے کبوتر سے جدا

حضرت آدم کو شیطاں نے نکالا خلد سے
غیر نے ہم کو کیا ہے کوے دلبر سے جدا

ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف اقفس آبرد
بجتے پھرتے ہیں گہر ہو کر سمندر سے جدا

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔

لختِ دل اور اشکِ تر۔ دونو ہم۔ دونو جدا
ہیں رواں دو ہمسفر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

میں نہ چکوا ہوں نہ وہ چکوی پھر آخر کس لئے
رہتے ہیں شب تا سحر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

وصل کی شب نکہتِ و گل کی طرح ہم اور وہ
رہتے ہیں باہدگر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

شکلِ عکس و آئینہ۔ تیرا خیال اور میرا دل
آئینے میں سیمبر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

ذوق ہیں سینہ میں اوراق جلاجل کی طرح
دل جگر با شور و شر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

اسی عالم کا کلام ہے:-

لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
ختم تکلم لب پہ ہے گویا ہم نے زباں کو لال کیا

لیگا دلا اس عشق سے کیا تو جس نے ہے کوہ و صحرا میں
مجنوں کا وہ حال کیا فرہاد کا ہے وہ حال کیا

پھرتا ہے تو لے چاند کے ٹکڑے سا کہ شب و روز آنکھوں
دل نے روشن ہو کے شب فرقت کو ہے روز وصال کیا

آتش گل جو ہوئی روشن باں یہاں چمکا جانے نرگس جب
موسم گل نے کیا ہنگامہ گرم ہے اب کے سال کیا

سادہ رخوں کی جو صحبت تیری ہی تھی یہ سادہ دلی
منہ پہ ملا کر اس شوخ نے اپنا کالا منہ اے خال کیا

تو قلم ایسا لاؤں کہاں سے جو یہ کرے تحریر انہیں
حال تو دیکھو تم نے مجھے ہمدوشِ پرِ بے بال کیا

نامہ یار کو رکھ دیجیو تو ہمدم میرے زیر کفن
نامہ جواب نامہ ہے اپنا وہاں جو کسی نے سوال کیا

شمع نمط ہر خار جنوں کی انگلی لگی جاتی ہے
آبلوں پر تیزاب تھا گر تو نے حق کیوں پامال کیا

آگ ہے دل میں۔ درد جگر میں۔ آنکھ میں آنسو۔ لب پہ فغاں ہے
عشق نے اس کے ذوق ہمارا دیکھ لو ہے یہ حال کیا

ان سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن سے جو اپنا ہمیں جانا اچھا
یار ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

پھول گل مہندی کے لالا کے نہ ہاتھوں میں ملو
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

طائرِ جاں کے سوا کوچۂ جاناں کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجئے روانا اچھا

طاقِ ابرو کے تصور میں دلا کھینچ نہ آہ
سمتِ کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

بدگماں دیکھو کہیں اس پہ نہ ڈالیں رخنہ
روزنِ در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

آتشِ عشق ہے سینہ میں دبی دیکھ اے چشم
اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بیٹھ رہ کر کے قناعت کہ کشکولِ مہِ نو
چھوڑے آدھی تو نہیں ساری کو جانا اچھا

مرغِ دل نے نگہِ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہتا کہ لگاتے ہیں نشانا اچھا

یاں تو دم میں نہیں دم اور وہ لیے تیغ دودم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

طرۂ شمشاد دکھاتا ہے تری زلفوں کو
لاؤ آرہ کہ نہیں اس کو ہے شانا اچھا

ق
ساقیا ابر ہے آیا تو بڑھا تم پہ ہاتھ
کہ گھٹا میں نہیں ہمت کا گھٹانا اچھا

جل کے گر قطرۂ خوں دل کا ہوا اشک آلود
تو نہیں غنچۂ مژگاں سے گرانا اچھا

گردشِ عمر میں تسبیح سلیمانی کا
آج اک ہاتھ لگا ہے مرے دانا اچھا

سامنے یار کے اے **ذوق** بہانا آنسو
ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

چاہے عالم میں فروغ اپنا تو ہو گھر سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

کیجیو مشاطہ نہ سبزہ گوشِ دلبر سے جدا
بدنما ہے گر رکھیں مینا کو ساغر سے جدا

دل مرا یارب نہ ہو زلفِ معنبر سے جدا
سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہ ہو سر سے جدا

لکھے شرحِ سوزشِ ہجراں جو تیرا بیقرار
ہو تڑپ کر جوں شرر ہر نکتہ دفتر سے جدا

فندقِ پائے نگاریں کا ہوں میں سودا زدہ
قطرۂ خوں بھی نہ ہوگا نوکِ نشتر سے جدا

شیشۂ دل میں ہے کیا جم کا شرارِ عشقِ یار
شیشہ گر رکھ تو بھی شیشہ کو نہ اخگر سے جدا

ہو جہاں کشتۂ مژگاں کا تمہارے مدفن
سوزن سبزہ ہو واں خاک سے نشتر پیدا

عاجزی سے سبب آئے نہ ہوا میں کمزور
موت سے چیونٹی کی ہو دیں اگر پر پیدا

قصد پرواز کرے کیوں نہ مرا طائر روح
تیرے خنجر سے جو پہلو میں ہوں شہپر پیدا

خط ترے شعلۂ رخسار پہ ہے معجز حسن
ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیونکر پیدا

خاک دل سوختہ یک مشت ہو گر سرِ چمن
ہوویں شمعوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا

رُخِ روشن پہ عیاں ہیں جو عرق کے قطرے
کیا تماشا ہے کہ دن کو ہوئے اختر پیدا

درفشاں وقت سخن ہیں لبِ رنگیں تیرے
ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا

اشک گرم ایک بھی دریا میں جو ٹپکے میرا
جائے ماہی ہو تہِ آب سمندر پیدا

آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے
دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا

سر کٹانے میں مزہ وہ ہے کہ جی چاہتا ہے
سیر ہر ہوئے بدن ہوئے جدا سر پیدا

بے طلب ہوتی نہیں زیب مکاں کی اے دوست
خانۂ دل سے ہے تو کر اور نہ دلبر پیدا

غزل مذکورہ بالا بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی مجھے یاد ہے مقطع کا مصرع ثانی کئی طرح کہا اور پسند نہ آیا۔ پھر فرمایا خیر جب صاف کرینگے تو سمجھ لینگے۔ اب آگے چلو یہ کہکر اور غزل شروع کردی

لکھنؤ میں ایک دن میں اور مولوی رجب علی خاں ارسطو جاہ کے دونو صاحبزادے میر حسن مرحوم کے پاس گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات تھی۔ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میں نے مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں کہ ٹھہریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہیں ٹھہرے نہ ٹھہریگا

میر مرحوم نے کچھ پڑھوایا اور کہا کیا خوب کہا ہے۔ یہ کس کا ہے۔ میں نے کہا شیخ ابراہیم ذوق کا۔ کچھ گفتگو کے بعد کہا کہ وہ مطلع ذرا پھر پڑھئے گا۔ میر شریف حسن خاں صاحب نے کہا۔ ان کے شعر آپ کو بھی پسند ہیں؟ اور کچھ تعریف کے لفظ کہے۔ میر صاحب نے کہا کہ جی ہاں۔ دلی میں میاں خواجہ میر کے بعد یہی ہوئے اور شاعر کون ہوا؟ تھوڑی دیر کے بعد ہم رخصت ہو کر کھڑے ہوئے انہوں نے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھ دیجئے گا۔ میر شریف حسن صاحب نے کہا کہ آپ کو یہ شعر

ایضاً از عالم بالا

ہجر میں کب کیا مرض ہے سنگدل پیدا ہوا
خون دل پیدا ہوا، آزار سل پیدا ہوا

تیرہ بختی تھی اسی دن اپنی روشن ہو گئی
روئے تاباں پر تمہارے جب کہ تل پیدا ہوا

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے ایسا کیا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

غیر کے چھلے سے واں تو نے جو گل کھائے تو یاں
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

اس لب لعلیں پہ ہے یہ جلوۂ رنگ مسی
یا کہ نافرمان دلالہ مشتعل پیدا ہوا

کر کے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
وہم کیا دل میں یہ اے پیماں گسل پیدا ہوا

خاکساری نے اسی دن روشنی پائی تھی ذوق
آدم خاکی کا جس دن آب و گل پیدا ہوا

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو با فراغ پا
سوز دروں دبی ہے یہ ہو گے نہ داغ پا

تو باغ میں رکھے اگر اے رشک باغ پا
پھولنے واں خزاں تو وہیں ہو دیں داغ پا

وہ آویں میرے گھر میں رقیبوں کو لے کے آئے
بلبل کے آشیاں میں رکھے جیسے زاغ پا

گر کوئے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر
تو کوئے زلف یار میں دل کا سراغ پا

رونے کی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشم آبلہ
جوش جنوں میں رکھ نہ سوئے کوہ و راغ پا

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اس ست تو ڈال دیکھ میاں اجاغ پا

اس گل سے گر اجازت پابوس ہو نصیب
ہو جائے چوم چوم کے دل باغ باغ پا

اچھلے ہے شیخ وجد میں اس طرح بار بار
جس طرح بدلگام ہو گھوڑا چراغ پا

ساقی کا دور چشم ہو گر بر کنار آب
پائے حباب آب رواں سے ایاغ پا

ہے جی میں آب جو ملا اے سرو خوش خرام
دھو دھو پیا کریں ترے سب بے دماغ پا

اے ذوق کیوں چمن میں وہ گل جائے جس کے ہوئے
رنگ حنا سے غیرت صد باغ باغ پا

تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا
گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا

آدم دوبارہ سوئے بہشت بریں گیا — دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا
دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا — وہ مل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا
خورشید وار جیسے یہ چمکا کوئی تو کیا — آخر کو پھر جو دیکھا تو زیر زمیں گیا
دیکھا کہیں نہ اسکو جو دیکھا تو اپنے پاس — میں دور دور جوں نگہ دوربیں گیا

---

کیا کیا مزہ نہ تیرے ستم کا اٹھا لیا — ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اٹھا لیا
یوں لا دیا ہے ہم دل سیپارہ کرکے جمع — دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا
جو بار آسمان و زمیں سے نہ اٹھ سکا — تو نے غضب کیا دل شیدا اٹھا لیا
سر ہم نے جب سے پائے صنم پہ رکھ دیا — دونوں جہاں سے دست تمنا اٹھا لیا

مرض الوفات سے تین دن پہلے غزل کہی اور مجھے سنائی۔ پھر ملازم کو دی کہ اندر طاق میں احتیاط سے رکھ دے۔ میں اکثر اُسی وقت اپنی کتاب میں نقل کر لیتا تھا۔ بدترین اتفاق یہ کہ اس وقت خیال نہ آیا۔ دوسرے دن بیمار ہوگئے۔ پھر نقل کا کسے ہوش تھا۔ انتقال کے بعد ہر چند ڈھونڈی۔ نہ ملی۔ یہ شعر یاد رہ گئے وہی لکھ دیتا ہوں:۔

کیا کہیں اُس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا — وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا
بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مست غرور — گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا
کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر — ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا
آفتاب حسن کو کیا خاکساروں کا ہو درد — پا فتادہ کا ہے درد از پا فتادہ جانتا

---

کروں درد آشنا کیونکر دل احباب اپنا سا — بلا سے جیسا میں ہوں ڈھونڈ لوں بیتاب اپنا سا
ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرہ نوازی ہے — دیا بندہ کو اپنے اس نے خود آداب اپنا سا

آنا تو خفا آنا۔ جانا تو رُلا جانا — آنا ہے تو کیا آنا۔ جانا ہے تو کیا جانا
کیا طبع میں جودت ہے چٹ دل کی اُڑا جانا — ہونٹوں کا یہاں ہلنا۔ وہاں بات کا پا جانا

اتنا پسند کیوں آیا۔ انہوں نے کہا دوسرے مصرع میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے کہ وہ اُسی کا حق ہے۔ میر شریف حسن صاحب بولے کہ آپ کو کیا حاجت ہے۔ وہ نہ ہوا اور لگا لیا۔ فرمایا نہیں۔ وہ استاد تھے۔ جو انہوں نے کہا وہی لفظ ہو تو ہو۔ اور ہو تو نہیں ہوتا۔

ترے ہاتھ سے کوئی آوارہ اے گردش ٹھہریگا
ولیکن تو بھی گر چاہے کہیں ٹھہر دل نہ ٹھہریگا

جو تھک کر ناقۂ لیلیٰ سر راہ ہوں نہ ٹھہرے گا
اگر سو کوس ہوگا نجد تو مجنوں نہ ٹھہریگا

وہ دولت کر طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئے گا گنجینۂ قارون نہ ٹھہریگا

گرا ہوں چشم ساقی سے مری تصویر میں بھی گر
بنا دیگا کوئی جام مے گلگوں نہ ٹھہریگا

سر بالیں اے ہمدم کوئی دم تو ٹھہرنے دے
ابھی سے کیا کہوں حال دل محزوں نہ ٹھہریگا

بتاتے ہو علاج اشک جو اُس خال کا بوسہ
طبیبو آب نزلہ ہے کہ بے افیوں نہ ٹھہریگا

یہی ہے دل کی بیتابی تو بعد از مرگ بھی قاتل
نہ ٹھہرا ہے زمیں پر عاشق محزوں نہ ٹھہریگا

(از مجموعۂ [illegible] سے [illegible] جا)

قتل کرتی ہے نگہ شہرہ نگاہ یار کا
سچ کہا ہے بانڑ کا لے نام ہو تلوار کا

گر دکھاؤں عالم اپنے نالہ ہائے زار کا
کام لوں ہر تار مو سے تار موسیقار کا

کوچۂ زلف بتاں میں دل پڑا ہوگا کہیں
پوچھتے ہو ٹھکانا اُس خدائی خوار کا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اٹھیں
گر پڑے سایہ مرے بتخانہ کی دیوار کا

آنسوؤں میں شمع بالیں سے برستے ہیں پھول
میں شہید ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا

استخواں اس سوختہ جاں کی نہ کھانا زینہار
اے ہما یہ رزق ہے مرغان آتش خوار کا

نالۂ بلبل میں گر پیدا اثر ہو جائے گا
خندۂ گل۔ خندۂ زخم جگر ہو جائے گا

کشتی بحر شہادت ہے ترے بسمل کو تیغ
اب ادھر سے دیکھنا دم میں اُدھر ہو جائیگا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائے گا خبر
کیا خبر تھی جا کے واں خود بے خبر ہو جائیگا

شکل تو دیکھو مصور کھینچے گا تصویر یار
آپ ہی تصویر اس کو دیکھ کر ہو جائے گا

بعد قافِ عشق تھا جو درس مکتب خانہ تھا | کاف کن کے ماسبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا

---

مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا | مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا

---

جل سب گریہ گر زمیں ہو کر قدم گڑنے لگا | اور قدم اُکھڑے تو کیا دیکھا بھنور پڑنے لگا

---

دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا | طائرِ جاں جو رفتہ بپا تھا فرصت پا کر چھوٹ گیا

---

ضبط گریہ نے تماشہ طرفہ دکھلا دیا | چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا

---

ہاتھ آکر دل وحشی جو کوئی چھوٹ گیا | ہوسِ صید سے صیاد کا جی چھوٹ گیا

---

لگا ہے تیر دل پہ آہ کس کافر کی مژگاں کا | نشان سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا

---

دل کہاں جس پر گماں ہو نقشہ تصویر کا | ہے کوئی سینہ میں خوں آلودہ پیکاں تیر کا

---

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کریگا | مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا

---

عہد پیری نے چھڑایا دوڑ چلنا۔ کودنا | ہائے طفلی کھیلنا۔ کھانا۔ اچھلنا۔ کودنا

---

مسجد میں اس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا | کافر کی دیکھو شوخی۔ گھر میں خدا کے مارا

---

اے دل نہ راہِ عشق کشادہ سمجھ کے جا | یاں اژدہا ہے ہر خطِ جادہ سمجھ کے جا
عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں تو لا | اور اسکو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

---

اگر رقصاں نہ سر اپنا سنانِ یار پہ دیکھا | تو سر بازی کا اپنے کیا تماشہ اپنا سر دیکھا
جہاں باریک بینی ناتواں میں اسقدر دیکھا | ہلال انتیسویں کا سب کو منظورِ نظر دیکھا

---

رہیگا تشنہ لب سیراب یہ بسمل نہ ہووے گا | مگر جب تک آبِ خنجرِ قاتل نہ ہووے گا
کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہ ہوئیگا | اگر مہر گواہی میرا داغِ دل نہ ہووے گا

او کو مارو دم سے [illegible] قاتل نہ ہوویگا

---

چاندنی نے شب تجھ بن روپ دکھایا تھا | مجھ کو ماہتابی پر دھوپ میں بٹھایا تھا

---

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا | وہ کہیں تم کو کیا ہوا ہم کہیں تم کو کیا ہوا

---

آدمی گر ہو مکدر کیا قصورِ ادراک کا | خاک کا پتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا

---

کیوں کہے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا | کہ جب تجھے کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

---

وہ دیکھیں کس طرح ہے روزِ فرقت دیکھ کر جیتا | کہ جو عاشق ہو تیرا تیری صورت دیکھ کر جیتا

---

جب قیامت قد ترا اے رشکِ گلشن بن گیا | اخترِ صبحِ قیامت نخلِ گردن بن گیا

---

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا | ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی در پردہ تھا

جوشِ مستی ہے عجب قافلہ جس میں کہ نہیں
ہے پرِ شکستہ ایک بستۂ جرس جامِ شراب

محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا!
ٹوٹا گر اک دلِ آتش نفس جامِ شراب

رات میخانہ میں ساقی جو نشے میں بہکا
خسِ شیشہ کو لگا کہنے خسِ جامِ شراب

مرغِ دل نرگسِ میگوں کی ہے مژگاں میں اسیر
تازہ مضموں ہے جو باندھوں قفسِ جامِ شراب

دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہو سو ٹکڑے
نام لکھدے جو کوئی میرا پسِ جامِ شراب

ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے
رات بھر گشت کرے ہے عسسِ جامِ شراب

نوشدارو سے کئی بہتر ہے دمِ رنجِ خمار
ساقیا شربتِ فریاد رسِ جامِ شراب

بے خبر قافلۂ عیش گزر جاتا ہے
بے زباں ہے جو دہانِ جرسِ جامِ شراب

ابلق چشم سیہ مست کو تیرے دیکھا
ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرسِ جامِ شراب

سمجھے میخانہ کی عظمت تو نہ بیٹھے ہرگز
سرِ جمشید پہ اُڑ کر مگسِ جامِ شراب

نخلِ مینا سے خدا جانے کہ ساقی کس کو
پہلے پہنچے ثمرِ پیش رسِ جامِ شراب

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا
عکسِ مژگاں ترا میکش ہے خسِ جامِ شراب

محو کو اس بوسۂ دنداں نے پس از بوسۂ لب
دے نقلِ نمکیں چند پسِ جامِ شراب

ذوقؔ جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغرِ مُل
لب نازک کو ہے اُس کے ہوسِ جامِ شراب

ہو ہجر مدتوں جو ہو وصل ایک دم نصیب
کم ہوگا کوئی ہم سا بھی الفت میں کم نصیب

ہوں میری خاک کو جو تمہارے قدم نصیب
کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب

بہتر ہیں لاکھ لطف و کرم سے ترے ستم
اپنے زہے نصیب کہ ہوں یہ ستم نصیب

ماہی ہو یا کہ ماہ۔ وہ دے ایک یا ہزار
بے داغ ہو نہ دستِ فلک سے درم نصیب

ہے خوش نصیب عشق میں اے بوالہوس وہی
جس کو کہ غم پہ غم ہے الم پر الم نصیب

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ ہووے تو
ہر دم ہے تجھ کو سیرِ وجود و عدم نصیب

سو بار جوں قلم ہو زباں شمع کی قلم
اک حرف ہو نہ مثلِ زبانِ قلم نصیب

ہوئے انسان ہم درِ محبت کے لئے پیدا | فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

یارب یہ اِس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوا | جس کا بُرا ہو اُن کو یہ کہنا بھلا ہوا

آج غصے سے اِدھر کو دستِ قاتل اٹھ گیا | بس بھروسہ زندگی کا ہم کو اے دل اُٹھ گیا

آخر گِلِ اپنی خاکِ درِ میکدہ ہوئی | پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہو گیا نامۂ شوق اُن کو سب ازبر میرا | کھا گئے ذبح جو وہ کر کے کبوتر میرا

کچھ رازِ نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا | گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

سبزۂ خط اُسے خضرِ طریقت رکھتا رسم الخط ہے جدا | خطِ بتاں ہے خطِ الٰہی۔ لکھے موسیٰ پڑھے خدا

## ردیف بائے موحدہ

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پسِ جامِ شراب | لب پہ توبہ ترے دل میں ہوسِ جامِ شراب

لب تک اُسکے جو ہوئی دست رسِ جامِ شراب | بن گیا خالِ لب اُس کا مگسِ جامِ شراب

جھجکا مستی میں وہ صاحب ہوسِ جامِ شراب | عکسِ خال اپنا جو سمجھا مگسِ جامِ شراب

دل جو ہے جامِ شراب ہوسِ جامِ شراب | اس میں ہے خالِ سویدا مگسِ جامِ شراب

ساغرِ دل کو جو ہو دسترسِ جامِ شراب | دستِ ساقی میں ہو وقتِ ہوسِ جامِ شراب

بازگشت اپنی ہے یوں جانبِ قسامِ ازل | جیسے ساقی کی طرف بازپسِ جامِ شراب

دستِ بدمستی کی لوٹ کے فریاد بہت | نہ ہوا کوئی بھی فریادرسِ جامِ شراب

# تائے مثناۃ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجام محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت

ہیں داغ محبت درم و دام محبت
مژدہ ہے تجھے اے خواہش انعام محبت

ہر روز اڑا دیتا ہے وہ کر کے تصدق
دو چار اسیر قفس و دام محبت

مانند کباب آگ پہ گرتے ہیں ہمیشہ
دلسوز ترے بستر آرام محبت

کاسہ میں فلک کے ہے اک بوند زہراب
دم کھینچے اگر تشنہ لب جام محبت

خاکستر پروانہ دکھا دوں ہیں اڑا کر
پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجام محبت

شوق حرم کوچۂ قاتل میں کفن کو
ہم جانتے ہیں جامۂ احرام محبت

کی جس سے رہ و رسم محبت اسے مارا
پیغام قضا ہے ترا پیغام محبت

نے زہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو
ہیں بادہ کش عشق و مے آشام محبت

ایماں کو گرو رکھ کے اگر کفر کو لے مول
کافر نہ ہو گر دیدۂ اسلام محبت

کہتی ہے وفا نوحہ کناں نعش پہ میری
سونپا کے تو نے مجھے ناکام محبت

معراج سمجھ ذوقؔ تو قاتل کی سناں کو
چڑھ سر کے بل اس زینہ سے تا بام محبت

مجنوں نے دی لگا جو سر خار زار پشت
پشت اب ہجوم خار سے ہے پشت خار پشت

تیر دل کے گر ہو پنجۂ مژگاں سے خار پشت
کھجلائے وہ پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی سے تا بماہ ہیں دست فلک سے داغ
واں داغدار سینہ ہے یاں داغدار پشت

پیدا فلک سے ایک نہ ہو تجھ سا ماہوش
نہ پشت تک تو کیا کہ نہ تا نہ ہزار پشت

بار زمانہ پشت پہ لے کر شتر کی طرح
سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایک بار پشت

ہو جاتی ہے زیادہ گرانباری گناہ
پیری میں ہو خمیدہ نہ کیوں زیر بار پشت

سینہ سپر جو منہ پہ ہیں تیغ نگاہ کی
دکھلاتے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

مجنوں سے سیہ خیمۂ لیلیٰ سے گر نہ ہو
اے خوش نصیب تجھ کو یہ طوقِ جنوں نصیب

دستِ جنوں کو اپنے ہاتھ سے تو ایک بار اُٹھ
ساقی دیئے خدا نے اسے شغل ہے نصیب

ایماں سے تیرا شوق لقا جب تک یہ نہ ہو
دیدار اُسے خدا کا نہ ہو اے صنم نصیب

جاتے تھے کوئے یار کو چھ ایک میں ہو سو ہو
اے ذوق آزماتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

دل عبادت سے چرانا اور جنت کی طلب
کام چور اس کام پر کس منہ سے اُجرت کی طلب

حشر تک دل بستہ ہے اس سرو قامت کی طلب
یہ طلب ہے اپنی یارب کس قیامت کی طلب

دل سلگ جائے نہ جب تک اور بھڑک جائے نہ جان
کم نہ ہو قلیاں کش سوزِ محبت کی طلب

واسطے نظارۂ قاتل کے فرصت چاہئے
اور یہاں فرصت کہاں جو ہو فرصت کی طلب

ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا
ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب

دور رہ اور دیر مت رہ سامنے مثلِ ہلال
شہر میں تجھ کو اگر ہے اپنی شہرت کی طلب

بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اس قدر اپنی کہ ہے
غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب

جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے
کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب

ہو کے دل غمزہ کا بسمل ناز پر دیتا ہے دم
کرتا ہے آفت طلب آفت پہ آفت کی طلب

یاد ہیں صاحب دشکم کی پہلی دو نو سنز ہیں
یاں کہاں وسعت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار
کر کشادِ دل سے اپنے ذوق وسعت کی طلب

کرے ہے شرع کا پاس نمک مدام شراب
حرام ہے نہیں لیکن نمک حرام شراب

یہ ایسا ماہ مبارک وہ ایسا کارِ سعید
شروع دیکھ کے کیجئے مہِ صیام شراب

عوض ہے نشۂ دنیا کا ذوق عقبیٰ پر
دوام بکتی ہے اس میکدہ میں دام شراب

اُس بُتِ نامہرباں کو ہے پسند اتنا رقیب
وردِ اسمائے الٰہی میں بھی ہے تو یا رقیب

وہ مثل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی؟ خضر نے
عاشق رسوا کے خدا یں کیا تکلف چاہیے

لے گیا خطِ ذقن دل کو سوئے گرداب پیچ
چار حرف اک سہ پرچہ پہ دو لو نہیں القاب کھینچ

## حائے حطی

فرقت کی رات جی چلے ہم تا زمانِ صبح / ہوئی اذان گور ہماری اذانِ صبح
پُر نور ہے ترا رخِ سیمیں بسانِ صبح / آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی کشانِ صبح
تار شعاعِ مہر بھی رنگِ شفق میں روز / ماتم میں ہیں مرے مژہ خوں چکانِ صبح
اب سیکدہ میں شام کو ناقوس پھو نکئے / مسجد میں مدتوں رہے تسبیح خوانِ صبح
میسے یہ دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے / انجم کے جتنے دانت تھے زیب دہانِ صبح
ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب / اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح
گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں راتدن / یہ میرے نالۂ شب و آہ و فغانِ صبح
یوں پہنچے اس کی زلف میں عارض سے جانِ دل / منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

اے ذوق کچھ نہ پایا شبِ وصل کا مزہ
یا آج صبح ہم نہیں یا طائرانِ صبح

ٹھیری ہے جانکے آنے کی اب کل پہ جا صلاح / اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح
منظورِ چشمِ یار ہے سب عینِ مصلحت / پوچھے بلاکشوں کی کسی سے بلا صلاح
سیدھے ہی جائیں کعبہ کو بیت الصنم سے ہم / گر پھیر دے نہ وہ صنمِ کج ادا صلاح
اس چشم مست کے ہیں خرا باتیوں میں ہم / تقویٰ کجا و زہد کجا و کجا صلاح
کیا جان میری جان کے درپے وہ ہو سکے / غمزہ سے تیرے پوچھے نہ جبتک قضا صلاح
اس بد معاملہ سے بھلا کیا معاملہ / کس بد صلاح نے تجھے دی یہ دلا صلاح
رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ / جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح
زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل ان بتوں سے تو / دیتا ہے ایسی کوئی بھی مردِ خدا صلاح

ڈر ہے یہی کہ ایسا نہ ہو بعد مرگ بھی
لگنے نہ دے زمیں سے دلِ بیقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت چار پشت

## جیم عربی

ہے وہ آزارِ محبت سے دلِ زار کو رنج
جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج

دیدۂ آبلۂ پا کا یہی ہے رونا
کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج

جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو
ہے جو ناکامیٔ فرہاد کا کہسار کو رنج

کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا
اور ہوتا ہے سوا مرغِ گرفتار کو رنج

شربتِ خضر بھی دے ہے روشِ تلخیٔ مرگ
تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج

راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونو لیکن
ہاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج

سخت جانی سے ہوں لاچار دگرنہ مجھ سے
نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج

سن کے فریاد قفس میں مری خوش ہوں بیدرد
یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغِ گرفتار کو رنج

ہوش کو بیچ کے لے دارُوئے بیہوشی تو
ذوق بیہوش کو آرام ہے ہشیار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج
خط بھیج یا نہ بھیج۔ زبانی خبر تو بھیج

---

بیمارِ عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج
کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

## جیم فارسی

اس پری کو تو نہ لے حسرتِ دلِ بیتاب کھینچ
اور لیوے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

یوں گلوئے تشنہ میں وہ آبِ خنجر ہو فرو
جیسے تفسیدہ زمیں نے ایک دم میں آب کھینچ

غزل کہہ کر ... تنبیہ و جلسہ خاص میں سُنائی۔ اور خلوۃ میں اتنا ہی کہا کہ ان تواتی دور ان کے مضامین کو دیکھئے جو ان سے بڑھ کر کہے گا تو میں پھر دیکھونگا۔

نواب نے کہا۔ ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اُس میں پڑھیئے یہ سن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہوگئے۔ نواب نے سن کر آدمی دوڑایا۔ وہ ہوڈل نیا پہنچے تھے آدمی نے جاکر پیغام پہنچایا۔ اور ناکام پھر آیا قسمت سے اس ... ایک ... میرے ہاتھ آگیا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ غیر ... ہے:

[illegible]

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ ... قطروں سے پر عرق کے ہے ... کی شاخ
اُس قد کو کیونکر کہیے نہال چمن کی شاخ ... لائیگی وہ کہاں سے ادا ... کی شاخ
... کی مثال ہے کیا داغ شوق چشم ... سمجھا ہے اپنی شاخ نشیمن ہرن کی شاخ
دکھلائی اس کے ... دنبالہ دار نے ... آنکھوں سے ہم کو ... کی شاخ
... کی ہے کولی نسترن کا پھول ... سینہ پہ ہے نسترن کی شاخ
دل باغ و عشق نخل کہ جس میں ہزار رہا ... حسرت کے برگ ... کی شاخ
بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پُر جفا ... ممکن نہیں کہ ... کی شاخ
کہتی تھی چوب تیشہ مری طرح ایک دن ... سوکھے گی نخل آرزوئے کوہکن کی شاخ
جب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لئے ... ممنون باغ میں ہے نہایت ... کی شاخ
جھکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز ... جنباں ہو جوں نسیم چمن ست ... کی شاخ
حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروئے یار پر ... گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکر ہرن کی شاخ
ہے جوش پارہ پارہ دل ہر مژہ پہ یوں ... لائے ... کریلیں جس طرح ... کی شاخ
مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار ... ہے یہ بھی اُس کے ایک شجر ... کی شاخ
دیتی ہے سر پہ بلبل آتش نفس کو جا ... رکھتی ہے کیا چمن میں ... کی شاخ
ہے نعش تیرے کشتۂ بیکس کی دشت میں ... گویا کہ اک نشیمن زاغ ... کی شاخ
جز شمع استخوان صفا کیش زیر خاک ... دیکھی نہ ہے کسی گل ... کفن کی شاخ

کرتی شراب اُس کو ہے تیری نگاہِ مست
جس کو کہ دیکھتی ہے نکوکار با صلاح

یارب ہو دل کی خیر۔ کہ کچھ کر رہے ہیں آج
چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا اصلاح

منظور اگر ہے قتل مرا غیر سے نہ پوچھ
ہے تو صلاحِ نیک میں کیا پوچھتا صلاح

قلّابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو
اُس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح

یہ ہی مرا رفیق ہے۔ یہ ہی مرا شفیق
لوں کس سے واں کے جانے کی دل کے سوا صلاح

اے **ذوق** جانہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح وہی ہے بجا صلاح

# خائے معجمہ

اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خوانین رامپور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے۔ وہ میر عدل صدر الصدور ہوگئے تھے۔ شعر و سخن کے شیدا تھے اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ استاد مرحوم کا عالم جوانی۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعر کی نشست نواب کے ہاں رہتی تھی۔ استاد کی اُن سے شناسائی تھی۔ مگر وہ اُنہیں استاد مانتے تھے۔ شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے۔ اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملایا۔ اپنے شعر سنائے۔ اور اثنائے گفتگو میں کہا کہ مبصرانِ سخن کے نزدیک آج فنِ شعر میں تین شیخ ہیں۔ شیخ ناسخ لکھنؤ میں۔ شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں۔

نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی۔ اور ناسخ کی غزل سنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر استاد کو بلایا۔ حال بیان کیا۔ اور غزل کی فرمائش کی۔ استاد نے کہا کیا حاصل؟ عبث کاوش ہے۔ اور انجام کاوش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو استاد نے

لکھ ذوق اُس کی مدح کہ جس کی ثنا سے ہے
سرسبز تیرے گلشنِ باغِ سخن کی شاخ

وہ کون؟ شاہ اکبرِ ثانی کہ جس کو روز
مُجرا کرے ہے جھک کے نہالِ چمن کی شاخ

اُس کی دعائے حرز پڑھے جوشِ غنچہ سے
تسبیح ایک لے کے عقیقِ یمن کی شاخ

کردے جو وہ نہال تو لائے ابھی نکال
پروین کا خوشہ تاکِ سپہرِ کہن کی شاخ

پھر تصدق آئے زرِ گل کو لے صبا
کرنے لگے نثار گہر یاسمن کی شاخ

پہنچائے اُس کا مژدۂ صحت جو باغ میں
سجدہ میں پھر شکر جھکے نارون کی شاخ

ہمسر ہے آج نخلِ ارم سیرتِ شجر
ہم قد ہے آج یوسفِ گل پیرہن کی شاخ

گرمی عدل اُس کی اگر ہو ستم گداز
پگھلے برنگِ شمع ابھی کرگدن کی شاخ

مطلع وہ پر بہار لکھوں اس کی مدح میں
مصرع کو جس کے سُن کے کرے نسترن کی شاخ

تیرے بہارِ فیض سے نخلِ کہن کی شاخ
سرسبز یوں ہے جیسے کہ سروِ چمن کی شاخ

تیرے سحابِ لطف سے سیراب ہو اگر
ہمسر ہو شاخِ نخلِ ارم سے ہرن کی شاخ

شاہا یہ تیرا دستِ سخا باغِ دہر میں
گویا کہ نکلی ہے کرمِ ذوالمنن کی شاخ

گر تیرا حفظ ہو چمنِ ہندِ روزگار
آبِ مژہ سے سبز ہو سرِ چمن کی شاخ

صرصر کا سارا خاک میں مل جائے زور شور
چھوٹے گر آشیانۂ مرغِ چمن کی شاخ

دیکھے جو تیرا قوتِ بازو تو ٹوٹ جائے
وقتِ کشش کمانِ سپہرِ کہن کی شاخ

تیرے عصا کو اس سے میں تشبیہ کیونکر دوں
ہے شاخِ سدرہ ایک کنارِ کہن کی شاخ

تاثیر تیرا زور ضعیفوں کو دے اگر
توڑے لٹے پیلتن سے بھی نازک بدن کی شاخ

بلکہ کمند مار کے ہاتھی کو کھینچ لے
خرطوم سے لپٹ کے بصورت رسن کی شاخ

منظور گر خزانہ میں ہو تجھ کو شاخِ زر
طیار ہو وہیں زرِ خور سے کرن کی شاخ

ہاتھی کو تیرے چاہئے لکڑی تو دشت میں
خرطوم سے اکھاڑ لے وہ کرگدن کی شاخ

نہ برگ ہے نہ غنچہ۔ نہ گل ہے نہ ہے ثمر — ہیں خشک طالعی سے ہوں گویا ہرن کی شاخ
ریشم کا لچھا ہاتھ میں اس کے نہیں دلا! — یہ یاسمن کا سانپ ہے وہ یاسمن کی شاخ
چھوٹے جلانے والوں سے وحشی نہ مر کے بھی — اکن شے کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ
تشبیہ کیونکہ دوں مژہ خوں فشاں سے میں — مرجاں کی شاخ کب ہے بھلا اس پھبن کی شاخ
صیاد میں چمن سے ہوں مایوس۔ چاہیے — چوب قفس بھی ہو تو نہال چمن کی شاخ
باریک ہیں بتاتے ہیں جسکو تری کمر — یا کوئی موئے تن ہے و یا موئے تن کی شاخ
گل خوردتن مرادم روئیدگی، مو — ہے آشیان بلبل گلشن وطن کی شاخ
دیوے خراش دل کو نہ کیونکر وہ نازنیں — رکھتی ہے خار سینکڑوں نازکبدن کی شاخ
دکھلائے باغ میں قد رعنا جو اپنا تو — قمری کے حق میں دار ہو سرو چمن کی شاخ
موذی کو سرکشی سے میسر ہو اعتبار — نکلے ہے طول عمر سے مار کہن کی شاخ
ہوتی ہے وحشیوں پہ پس از مرگ بھی شکست — زور آزمائیوں کے لئے ہے ہرن کی شاخ
شاخ نبات کانے تلیاں نہ منہ لگائے — ایسی مصاحبت ہے لگی اس دہن کی شاخ
ہے فیض سے وقار کے میری نگاہ میں — جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لاکھ من کی شاخ
آخر یہ دستگیری تیشہ نے پھل دیا — کی قطع نخل آرزو سے کوہکن کی شاخ
بد خصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک — اونچی ہے آشیانہ زاغ و زغن کی شاخ
رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پر جفا — آخر کو زیر ارہ گئی کرگدن کی شاخ
بیمار چشم دلبر آہو نگاہ کو — شاخیں بھی گر لگائیں تو لیکر ہرن کی شاخ
ہر صید کی کمر سی گئی ٹوٹ جس گھڑی — ٹوٹی کمان دلبر ناوک فگن کی شاخ
تاثیر بیکسی سے ہو سارا درخت خشک — ڈالے جو سایہ نعش پہ اس بے کفن کی شاخ
یہ سیب باغ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی — جب سے مشابہت ہے لگی اس ذقن کی شاخ
سوفار کا دہن جو ہوا خون دل سے سرخ — تیر اس کا بن گیا ہے گل خندہ زن کی شاخ

ٹ نازک بدن ایک قسم کا بیر ہوتا ہے اس کے درخت کو بھی نازکبدن کہتے ہیں۔

کل اُس سے ہم نے ترکِ ملاقات کی تو کیا / پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد
کہتا رہا کچھ اُن سے عدو دو گھڑی تلک / غماز نے پھر اور جڑی دو گھڑی کے بعد
تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے / ساری وہ شیخی ان کی جھڑی دو گھڑی کے بعد
پروانہ گرد شمع کے شب دو گھڑی رہا / پھر دیکھی اُس کی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد
تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر۔ دیکھ جلد آ! / آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد
گو دو گھڑی تک اُس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا / آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد
کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوقؔ کس طرح / پھر تو نہ ٹھیرے پاؤں گھڑی دو گھڑی کے بعد

ایک قدیم الخدمت محمد بخش نام استاد مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ بڈھا بھی تھا مسخرا بھی تھا۔ سامنے بورچی خانہ میں سب کا اتالیق بنا بیٹھا رہتا تھا۔ اور باتیں بنایا کرتا تھا۔ اور یہ حق ہے کہ استاد مرحوم کی اور ان کے والد کی خدمتیں کرتے کرتے وہ بھی ایک رتن ہو گیا تھا۔ سب کے کاموں کو اصلاح دیتا تھا۔ ہمیں عہد شباب میں پہنچ لیا تھا۔ پھر بھی اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جس طرح بچپن میں مجھے کھلاتا تھا اور ہنساتا تھا۔ استاد کا وہ عالم اب تک آنکھوں کے سامنے ہے۔ خاموش اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ کوئی بات اس کی بھی کان میں جاتی ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی خوش ہوتے تھے تو دو ایک گالیاں بھی دیدیا کرتے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ایک آدھ دھول بھی لگا دیتے تھے۔ اسے پرانے استادوں کے بہت شعر یاد تھے استاد مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے۔ جوانی میں سورج مکھی پر شعر پڑھا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے اپنے شیخ سے چرچا سنا کہ رات کو فلاں بازار میں سورج مکھی پر استاد ذوقؔ کے نوکر نے بھی شعر پڑھے۔ بڈھا تھا۔ پھر بھی خوب پڑھا۔ اور شعر بھی خوب تھے۔ ایک بولا آخر استاد کا نوکر تھا صاحب۔ خوب کیوں نہ پڑھتا۔

میں حسب معمول شام کو استاد کے پاس گیا۔ وہ حرم سرا میں گئے تھے۔ میں نے پوچھا محمد بخش! کل سورج مکھی پر شعر پڑھتے تھے؟ پہلے تو مکر گیا۔ پھر بڑی مشکلوں سے قبولا

دانتوں کو اسکے دیکھ جو لرزاں ہے شاخ بید
صدقہ کو جو آتی پیکر و البرز تن کی شاخ

گلشن سے تیرے بڑھ نہ سکے یکقدم صبا
سوتا ہے پانے اسے نہال چمن کی شاخ

تولد

ہو تیرا فیض گر چمن آرائے باغ دہر
آب تبر سے سبز ہو نخل کہن کی شاخ

نالاں ہیں تیرے عدل سے خونریز اسقدر
مانند نے ہو گرم فغاں کرگدن کی شاخ

برسائے جبکہ لعل و گہر تیرا دست جود
محتاج ابر ہو نہ نہال چمن کی شاخ

شاداب آب لطف یمن سے ہو شاخ گل
سیراب ہووے آتش تر سے عدن کی شاخ

یا تنگ ہے پاس شرع ترے عہد میں کہ آب
ساغر بکف نہ ہو دے گل خندہ زن کی شاخ

پیدا ہو بادہ خوار کی تعذیر کے لئے
نخل لدے تاک میں سو تیرزن کی شاخ

یہ ذوق کی دعا ہے کہ تا باغ دہر میں
سرسبز شعر تیرے ہو نخل سخن کی شاخ

جب تک کہ ہووے گردن مینا کی طرح سے
خم ہو نشاط ساقی پیماں شکن کی شاخ

نخل حیات تیرا تر و تازہ ہو مدام
جوں موسم بہار میں نخل یمن کی شاخ

## دال مہملہ

پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ ان کی غزل لکھ کر بیٹھے تھے۔ دل لگ گیا۔ اور چند قافیے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھے نظر آئے۔ فرمایا ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سنائی:۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا روکا ہم نے گریہ کو اپنے کہ لگ گئی
پھر وہ ہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھے پھر ایک کڑی دو گھڑی کے بعد

اس لعل لب کے ہم نے لئے بوسے اس قدر
سب اڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینہ سے ہر آہ بے اثر
لب تک جو پہنچی بھی تو چڑھی دو گھڑی کے بعد

# ذال معجمہ

۱۸۵۲ء میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں یہی طرح ہوئی تھی۔ شاگرد آئے اصلاحیں لے گئے مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں۔ دیکھ کر فرمایا۔ ردیف و قافیہ کو پہلو نہیں بٹھا سکتے زمین ناپتے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا ہم بھی غزل لکھ دیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام بے اصول تو نہ ہو۔

مژدۂ قتل ہے اس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادیِ تن کا کاغذ

گوشہ پوش ہو جب دفتر تن کا کاغذ
ہو سیاہ کو سفیدیِ کفن کا کاغذ

بن گیا عکس سے اس شوخ گلستاں رخ کے
صفحۂ آئینہ تصویر چمن کا کاغذ

کیا کرے خانۂ گیتی کا کوئی دعویٰ ملک
نام پر کس کے ہے اس دہرِ کہن کا کاغذ

لکھیں اس چشم کے وحشی کے لئے گر تعویذ
اہل تسخیر کریں پوست ہرن کا کاغذ

رقعۂ شادیِ شہادت کا ہو خوں سے رنگیں
ایسی شادی کو ہوا ایسا ہی پھبن کا کاغذ

سینۂ صافوں کو زمانہ کے ہے ہاتھوں سے شکست
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

ورق چرخ ہو گو نسخۂ آشوب۔ نہ ہو
سرمۂ چشم مہ سیم بدن کا کاغذ

یوں قفس میں کوئی ہم تک ہے پہنچا گل برگ
جیسے غربت میں شفیقانِ وطن کا کاغذ

ظاہر آرا نہ کتابوں سے ہو۔ در دوزخ (جلنے)
گر نہ آتش میں لباس اپنے بدن کا کاغذ

جعلسازی پہ زمانہ کی گواہی دے ہے
مہری و سادہ مہ چرخ کہن کا کاغذ

مہر دہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آئے ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب اسکے دہن کا کاغذ

ذوق دل سوختہ دیوان لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیِ سخن کا کاغذ

حال دل کا مجھے کیا دیتے ہو لاکر تعویذ
اس کا خط لاؤ کہ رکھوں میں بنا کر تعویذ

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج
لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بنا کر تعویذ

میں نے پوچھا۔ کیا کیا پڑھے تھے؟ بڑے غمزوں سے سودا کی ایک غزل سنائی۔ میں نے کہا استاد کے شعر بھی تو پڑھے تھے! کہا یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے۔ میں نے کہا۔ کون؟ کہا۔ یہی میاں ابراہیم۔ میں نے کہا۔ بھول کیونکر گئے۔ کہا پہلے اچھے کہتے تھے۔ اب تو کچھ اور ہی ڈھب کے کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ خیر۔ جو شعر تو نے وہاں پڑھے وہ سنا دے۔ کہنے لگا۔ لڑکوں کے سامنے شعر نہیں پڑھا کرتے میں نے کہا اچھا ایک ہی پڑھ دے۔ بڑی خوشامدوں سے یہ مطلع پڑھا۔

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند
لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

اتنے میں استاد آئے۔ میں نے یہ مطلع سنایا۔ فرمایا۔ تمہارے ہاتھ کہاں سے آیا۔ میں نے کہا۔ محمد بخش نے ابھی پڑھا ہے۔ حضرت! آج رات کو سورج مکھی پر اس نے شعر پڑھے تھے۔ مسکرا کر بولے۔ کیوں بے گنجے فلاں فلاں تو ہمارے شعر سورج مکھی پر پڑھا کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو کوئی شعر اس کا یاد ہے فرمایا مدتوں کی باتیں ہیں۔ اب کہاں یاد۔ پھر کہا۔ یادداشت کے جزو میں لکھ لو۔ کتاب میں نہ لکھنا۔ میں نے کہا۔ حضرت! کیوں؟ فرمایا لڑکپن کی باتیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی فرمائش سے کہہ دیتے تھے۔ فرصت میں بیٹھیں گے تو اپنے رنگ میں لے آئینگے میں نے وہی لکھ لیا۔

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک
دم گھٹتا ہے سینہ میں دم شدت گریہ

دیکھا نہ کبھی ہم نے دل اہل صفا بند
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہوا بند

ایک دن والد مرحوم کے پاس آئے۔ ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں جن میں نہیں۔ ان کے لئے طرحیں تجویز ہوں۔ ردیف دال کے لئے۔ یہ مصرع بھی طرح ہوا۔ ع

پنبہ داغ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید

خوب روئے رات ہم سنسان ہاموں دیکھ کر
یاد آیا ہم کو مجنوں بید مجنوں دیکھ کر

اڑ گئے اک آن میں جادوے بابل کے دھوئیں
سرمہ آلودہ تری چشم پُر افسوں دیکھ کر

دیکھ کر غیروں میں مہتابی پر اس مہوش کو رات
آہ کی اک دل سے ہم نے سوئے گردوں دیکھ کر

سچ کہا ہے آگے کالے کے نہیں جلتا چراغ
چھپ گیا مہ رُخ پہ تیرے زلفِ شبگوں دیکھ کر

بل بے میرے ساغر سرشار وحشت کا نشا
چھپ گیا خم میں مری صورت فلاطوں دیکھ کر

آ گئیں ہم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں
نوکِ مژگاں پر مرے اشکِ جگر گوں دیکھ کر

بوٹے نالہ اپنا۔ وہ اک سرو غیرت ہے جسے
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قدِ موزوں دیکھ کر

قتل کو کس کے چڑھائی تیغ تو نے سان پر
اترا آنکھوں میں جو خنجر کی خوں دیکھ کر

لے گیا دل کون میرا ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتا دوں دیکھ کر

کہا پتنگ نے یہ دار شمع پہ چڑھ کر
عجب مزا ہے جو مرئے کسی کے سر چڑھ کر

مرے خیال پہ وہ چشمِ فتنہ گر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ نئی آئی لڑنے گھر چڑھ کر

دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اتر چڑھ کر

ستمگروں کی کشاکش سے آبرو ہو ہوا
کہ ہوتی سان پہ ہے تیغ تیز تر چڑھ کر

الٰہی خیر ہو مانندِ شعلۂ سرکش
پھر آیا باد کے گھوڑے پہ وہ ادھر چڑھ کر

ہنر شناس کو دکھلا ہنر کہ خوبیٔ زر
اگر کھلے ہے تو صراف کی نظر چڑھ کر

کہیں فلک پہ نہ چڑھ جائے چاند جھومر کا
کہ دور آپ کو کھینچے ہے تیر سے سر چڑھ کر

ترا مکان تو ہے کیا لامکاں میں کود پڑیں
امید وصل نہ ہم بام عرش پر چڑھ کر

بنائے نفس کو۔ اور کر لے اپنے غصہ کو زیر
بنائے سانپ کا کوزہ وہ شیر پر چڑھ کر

ہماری خاک پہ برپا ہے ذوق فتنۂ حشر
سمندِ ناز پہ کون آیا فتنہ گر چڑھ کر

جاں ہوا یوں ہوئی اس خال کا بوسہ لیکر
جیسے اُڑ جائے دہن میں کوئی گڑکا لیکر

تم نے تعویذ نشانی جو دیا تھا اپنی
لے گیا کوئی موکل وہ اڑا کر تعویذ
اب تلک جوش میں ہے خون شہیدِ غمِ عشق
دیکھ لو تم سرِ مرقد سے اٹھا کر تعویذ
جلتوائی نہ پڑی یار میں اور غیروں میں
سینکڑوں خاک کیے ہم نے جلا کر تعویذ

## راے مہملہ

نگہ نہیں جرأت دلنشیں تھا۔ دہن کی تنگی سے تنگ ہو کر
نکل کے رستے سے چشم بتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر
پھر آیا لو وہ نگار نخوتی ادھر کو سرگرم جنگ ہو کر
کہ جس کے ہاتھوں سے اڑ گئے سر ہزاروں سیدھی کا رنگ ہو کر
وہ چشم مخمور اک نظر سے چبھوئے لاکھوں خون میں نشتر
تو ہو رواں ہر رگ جگر سے لہو۔ مئے لالہ رنگ ہو کر
جو رنگ الفت سے آشنا ہیں۔ وہ گر برے بھی ہیں خوشنما ہیں
جو رنگ ہی سے گراں بہا ہیں۔ عقیق و یاقوت سنگ ہو کر
جو سمجھیں عشق بتاں کو ایماں انہیں رہا فکر دیں ہے یکساں
پہنچتے کعبہ میں وہ مسلماں ہمیشہ چین و فرنگ ہو کر
صفائی دل کی یہی ہے صورت۔ کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائینگے بالضرورۃ۔ اس آئینہ میں یہ زنگ ہو کر
غزال رم دیدہ بن گیا ہے۔ جو خواب آنکھوں میں تو کیا ہے
کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے۔ پلنگ تجھ بن پلنگ ہو کر
ہوئے جو یکرنگ۔ ان کو زیبا۔ نہیں جہاں میں رعونت اصلا
کہ پایا گل نے ہے نام رعنا تو اس چمن میں دو رنگ ہو کر
حلاوت شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوق رنج و خواری
مزے سے گزری اگر گزاری کسی نے بے نام و ننگ ہو کر

نہ: نکل کے آیا جو راہ آنکھوں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہو کر

کام یہ تیرا ہی تھا رحمت ہے اے ابرِ کرم
ورنہ جائے داغِ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر؟

جس نے ہو لذت اٹھائی زخمِ تیغِ یار کی
کب وہ مرہم داں کو ڈھونڈے نمکداں چھوڑ کر

صیدِ دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ نہ کھلائے ہے تو
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جاں چھوڑ کر

سرد مہری سے کسی کی آگے ہی دل سرد ہے
یاں سے ہٹ جا دھوپ لے ابرِ بہاراں چھوڑ کر

دیکھئے کیا ہو کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو لے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

اے دل آ سکے تیر کے ہمراہ سینے سے نکل
دیکھ پچھتائیگا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر

کیوں نہ رم کر جائیں آہو ایسے وحشی سے ترے
شیر بھاگیں جس کے نالوں سے نیستاں چھوڑ کر

سرخیٔ پان دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیحِ مرجاں چھوڑ کر

پیش خیمہ لے کے نکلا گرد بادِ دودِ آہ
ہے جو سرگرمِ سفر تن کو مری جاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہِ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو نہ آدمی آدھی ناں چھوڑ کر

ساغرِ دل پیتا آیا ہوں کہ مت ہاتھ سے
چوکتا ہے کیوں یہ تیغِ دستِ گریاں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالمِ مضموں میں طرزِ تفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھ کو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

میں وہ مجنوں ہوں جو نکلوں کنجِ زنداں چھوڑ کر
سیبِ جنت تک نہ کھاؤں سنگِ طفلاں چھوڑ کر

پیوے میرا ہی لہو مانی جو لب اس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے خونِ شہیداں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہ گیا بس منشیٔ قدرت جگہ واں چھوڑ کر

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

ہو گیا طفلی ہی سے دل میں ترازو تیرِ عشق
بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراقِ میزاں چھوڑ کر

اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

شوق ہے اسکو بھی طرزِ نالۂ عشاق سے
دمبدم دیکھے ہے منہ سے دودِ قلیاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگیگا حوریانِ عدن سے
باغِ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

تیرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا[1] لے کر
چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لے کر

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب
تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑیگا بدلا لے کر

ذبح کرنے کو مرے پوچھتے کیا ہو تکبیر
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لے کر

کھینچتی روز قیامت ہی سے آپ کی دیر
تیری زلفوں کی بلائیں شب یلدا لے کر

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں
گرچہ ڈھونڈو گے چراغ رخ زیبا لے کر

جبکہ دیکھا نہ ملا مجھ میں کہیں میرا پتا
پھر گیا نامہ بر یار خط الٹا لے کر

رہ گیا اپنا سا منہ لے کے وہ آئینہ رو
تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لے کر

تیرے پرزے نہ کئے نامہ کی طرح اے قاصد
شکر کر چھوڑ دیا اس نے نوشتا لے کر

میرے قدموں ہی میں جا بیٹھینگے جا بیٹھینگے کہاں
دشت میں میرے قدم آبلہ پا لے کر

واں سے یاں آئے تھے اے ذوق تو لائے تھے کیا
یاں سے تو جائینگے ہم لاکھ تمنا لے کر

دیوان چندو لعل مدار المہام دربار حیدر آباد نے کئی ہزار روپئے بھیج کر بلایا تھا۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا۔ حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں یہ غزل لکھ کر بھیج دیا۔ اور روپیہ نہ لیا۔ میں نے ایک دن نہ جانے کا سبب پوچھا۔ فرمایا۔ بھئی اپنی ہی جگہ بھاری ہے۔ میاں وہاں جاتے خدا جانے کیا ہوتا۔ اور کیا کیا نہ ہوتا۔ اپنی دلی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے۔ خدا کا شکر کیا اور یہیں بیٹھے رہے۔

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اٹھا کوچہ چاک گریباں چھوڑ کر

کیونکہ نکلے تیر اس کا دل میں پیکاں چھوڑ کر
جائے بیضہ کو کہاں یہ مرغ پراں چھوڑ کر

[1] سنبھالا لینا۔ بعض دفعہ بیمار قریب المرگ ہوتا ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے ایسا سنبھل جاتا ہے گویا اچھا ہو گیا۔ سب کو صحت کی امید ہو جاتی ہے۔ پھر دفعۃً حالت بگڑ کر پہر دو پہر میں کام تمام ہو جاتا ہے۔ اس وقت کہتے ہیں کہ جو صحت معلوم ہوئی تھی وہ سنبھالا لیا تھا۔

سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد دی کہ وہ اس سے بھی زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔ پھر سب چپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

دل سینہ میں کہاں ہے؟ نہ تو دیکھ بھال کر
اے آہ کہہ دے تیر کا نامہ[1] نکال کر

ہوں سرد ہو چکا۔ نہ دوبارہ حلال کر
میں! اور دم چراؤں لگا یہ تو خیال کر

عاشق کے خوں سے اپنا پرِ تیر لال کر
دکھلا دے شاخِ خشک میں کوپل نکال کر

تیرے مریض نے کئی نقلِ مکاں کئے
آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر

شہرگ پر اپنی زندگی و موت ہے لاگ
آ تیغِ یار! قصہ یہ تو انفصال کر

اترے گا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے
خاکِ دلِ شکستہ نہ صرف اے کلال کر

لے کر بتوں نے جان جب ایماں پہ ڈالا ہاتھ
دل کیا کنارہ ہو گیا سب کو سنبھال کر

سینہ ہمارا وادیٔ وحشت سے اے جنوں
ہر داغ پر تصورِ چشمِ غزال کر

گر چاہتا ہے مثلِ مہ چاردہ فروغ
آ مہر کے شہر شہر میں کسبِ کمال کر

پوچھو چلے ہیں کوئے نکہ سے تو دلِ زرد
ملکِ فنا ہے۔ جائیں ذرا دل بحال کر

تصویر ان کی حضرتِ دل کھینچ لائے گر
رکھ دیں گے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر

قاتل ہے کس مزے سے نمک پاشِ زخمِ دل
بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

دل کو رفیقِ عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
ٹل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ڈال کر

[1] نامہ نکالنا۔ وہی مشہور عمل ہے جسے عوام اب بھی ناواں نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کچھ چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام کبھی صورت۔ کبھی اور اتا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کاغذ کے پرزوں پر نام لکھ کر کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھ کر کبھی تیر کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تیر میں بھی یہ اشارہ ہوتا تھا کہ ہی چور کے کلیجہ میں لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے۔ دیکھ بھال نہ کر۔ ہاں اے آہ دل تو تیر کا ناواں نکال کر بتا دے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (اے یار)

گھر سے بھی واقف نہیں سکے کہ تب کے واسطے
بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر

جس میں گر تجھکو ہووے رویتِ ماہِ رجب
روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

بندۂ آزاد بھی ان دنوں حاضرِ خدمت ہونے لگا تھا۔ ایک دن مومن خانصاحب استاد کے پاس آئے۔ اثنائے گفتگو میں کہا آجکل کا کوئی شعر سنائیے۔ استاد نے فرمایا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں۔ جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقومۃ الذیل کا مطلع انہی دنوں کہا تھا وہی سنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کہیگا۔ رستہ بند ہے:-

بلبل ہوں صحنِ باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشتِ گم شدگی میں مجھے کہ ہے
عنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

اس مرغِ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہ گیا
مرغانِ کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر

ساقی بطِ شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

خود اُڑ کے پہنچے نامہ۔ جو ہو مرغِ نامہ بر
اُس شوخ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کہاں دار تیرِ آہ
پر ہے نشانِ داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوق میرے طائرِ دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سنا کہ اس میں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے۔ استاد مرحوم سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا عالمِ شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کر
ایما ہے یہ کہ بھیج دے آنکھیں نکال کر

یہ دفعتہً مشہور ہو گیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیرِ نظر رکھتا ہوں میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہہ دیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ ذکو

کہا یہ سو بار دل کو رو کر۔ حریف مت ترک چشم کو کر
سو آخرش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔ بہا ہے مژگاں کی بر سناں پر
وہ چشم ابرو تمہارے زیبا کہ۔ قاب قوسین جن سے ادنےٰ
یہ خال پیشانی کیوں تمہارا۔ نہ فرق سے جائے فرقداں پر
کہے ہے داغ جنوں کہ چمکوں۔ جو تیرے سر پہ بدشت و ہاموں
چراغ وحشت سرائے مجنوں۔ کروں میں روشن چراغداں پر
بنا بگولے کو برج آسا۔ قریب ناقہ کے قیس پہنچا
پر اُترے محمل سے کیونکہ لیلےٰ کہ پردہ کھلتا ہے سارباں پر

کہاں رہی مجھ میں جاں سب ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آتی
بو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی۔ ہمارے داغِ دلِ تپاں پر

جبیں پہ پوچھے کہ نقش کون مرے پتوں پر
جو ترے دوست پہ گزری بے گزری ظالم
تیرے دندان سی زیب کی دیکھی جو بہار

میں کہوں میں۔ تو کہے میں کے چھری گردن پر
وہ مصیبت نہ ہو دنیا میں کسی دشمن پر
پڑ گئی اوس ہی گلشن میں گلِ سوسن پر

---

اے دل وہ سرِ غمزۂ پنہاں عیاں کر
آہ و نالے دودِ دل جو نکالوں تو وہ کہے

آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں کر
او تفتہ جاں! ہوا ہو۔ یہاں سے دھواں کر

ایک غزل کے دو مطلعے مجھے ایک مجہول آدمی نے سنائے اور کہا کہ استاد کے ہیں میں نے یاد کر لئے اور استاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا۔ اُہو۔ لڑکپن کے ہیں بھی۔ بلکہ بچپن کے۔ اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کرینگے۔ وہ بھی عجب تھے۔ ہم مشاعرہ میں آ گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم ثناء اللہ خاں فراق۔ برہان الدین خاں زار۔ میر غالب علی خاں سید تشریف لائے یہ بزرگ اس زمانہ میں اراکین مشاعرہ بلکہ اراکین شہر شمار ہوتے تھے۔ لوگوں

استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے۔ طبیعت سے واقف تھے اہل دربار میں سے کوئی سُنا دیتا تو جو پسند آجاتا خوشی حضور کی تھی کہ یہ ہمارے نام سے مشہور ہو۔ چنانچہ اس پہ خود غزل کہنے اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسودہ اُستاد کے پاس بھیج دیتے کہ اصلاح دے دیں۔ اس حالت میں استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچا کر اُن کے شعر درست کریں۔ چنانچہ جب غزل مرتب کر کے حضور میں پہنچاتے تو بادشاہ زبان سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اسی طرح میں پھر ایک مسودہ بھیج دیتے ابتدا میں دو تین دفعہ ایسا ہوا۔ استاد سمجھ گئے آخر یہ ہو گیا کہ جب ایسا موقع ہوتا تو اپنی غزل میں اُن کا تخلص ڈال کر بھیج دیتے۔ وہ خوش ہو جاتے تھے جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپ کر آیا۔ تو مجھے یاد ہے والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھ کر مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دیدی۔ یہ رنگین کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی:-

مزا چکھایا ہے کوہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحاں پر
کہ لایا تو جوئے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر
خدنگ دنبالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر
کہ بوسہ اُس چشم سرمہ سا کا ہے مہر گویا مری زباں پر
لگا کے باتوں میں اُن کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہدیں ٹھکانا جس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر
تپ محبت میں سخت جانی کا یہ اثر ہے دل طپاں پر
کہ شکل سوہان پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زباں پر
اٹھائے سوز غم ہر نمط ہیں۔ یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کرشن قط گیر خط پہ خط ہیں۔ ہنوز باقی ہر استخواں پر
خلش یہی خار خار غم کا رہا تو مرقد پہ میرے سبزہ
یقیں ہے مانند برگ خرما اُگے گا نشتر لئے زباں پہ

[illegible]

خط کہاں آغاز سے ہے پشتِ لبِ دلدار پر
ہیں جنابِ خضر آئے عیسیٰ مریم کے پاس

مردمک کے پاس ہے یا اشکِ خونیں کا ہجوم؟
یا دھرے یاقوت ہیں یا دانۂ نیلم کے پاس

روح اس آتشِ بجاں کی بعدِ مردن جوں پتنگ
آئیگی اُڑ کر چراغِ خانۂ ماتم کے پاس

کس کی قسمت ہے کہ زخمِ تیغِ قاتل ہو نصیب
جان سے جائیں۔ نہ جائینگے گر مرہم کے پاس

لٹیا مزے رے لے کے گل کھائیں اگر آجائے ہاتھ
یہ جو چھلا آپ کی انگلی میں ہے خاتم کے پاس

زلف سے بے وجہ خطِ سبز ہم پہلو نہیں
ہے لپکتا عشقِ پیچاں سنبلِ پُرخم کے پاس

واہ صیاد اجل۔ اور واہ صیادی کا پیچ
کھچ کے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس

دیکھو فیاضِ ازل نے کیا دیا آنکھوں کو فیض
کاسۂ رکعت ہو کے ہم آتے ہیں انکے نم کے پاس

ہے جو قسمت میں تو دریا ہی کبھی ہو جائے گا
آ لگا ہے اپنا قطرہ بھی کسی قلزم کے پاس

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور اک غزل
بیٹھ کو ہی دم تو اے ذوق اور اس پُرغم کے پاس

تیر و کماں ہے گر بتِ ناوک فگن کے پاس
آہ و قدِ خمیدہ ہے اس خستہ تن کے پاس

شب جانِ زار رک گئی لب پہ دہن کے پاس
پھر اُٹھ کے رہ گیا یہ مسافر وطن کے پاس

یہ جوئے خوں رواں نہیں۔ دیکھو ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھ کے سرِ کوہکن کے پاس

اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لے کے جام
پہنچوں کبھی لبِ بتِ پیماں شکن کے پاس

انگشتِ شمع کیوں نہ اٹھے بہرِ فاتحہ
یہ ڈھیر ہے پتنگ کا پائے لگن کے پاس

میں تو اسی جھجک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے لا کر دہن کے پاس

چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ
چاکِ جگر میں دیکھنا چاکِ کفن کے پاس

میں نے کہا کہ بوسہ بھی دو یا ادب سے میں
ق
لا سکتا اپنا منہ نہیں چاہِ ذقن کے پاس

ہنس کر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں پہ آپ
یا جاتا ہے کنواں کسی تشنہ دہن کے پاس

اے ذوق صدقے جائیے پیکِ خیال کے
کیا لے گیا اُڑا کے بتِ سیم تن کے پاس

نے اُن سے کہا۔ اُنہوں نے پھر ہمیں پاس بلایا۔ دل بڑھایا۔ اور فرمائش کرکے دوبارہ غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نامۂ شوق کو مرے باندھے جو بال و پر
مصحفِ روئے یار میں دیکھا ہے ہو جو خال پر
کیوں ارے مرغِ نامہ بر جھکو ہوئے وبال پر
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

---

ہیں ہما کے سر پہ افسر ان ہوا گیروں کے پر
اُن کو بے پر عرشِ اعظم پر اڑاتے ہیں مہر
ٹل گئے جن طائروں کو ہیں ترے تیروں کے پر
کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پردوں کے تیر

---

شرحِ بختِ برگشتہ گر کروں رقم پھر کر
تیر بازگشتی ہو ہاتھ میں قلم پھر کر

---

رکھ لیا اُس نے چمن میں گل جو سر پہ توڑ کر
میں تبھی حاضر ہوں کہا غنچہ نے یوں منہ موڑ کر

---

بعد مردن آ چکے رونے کو سن کر گور دور
جیتے جی کہتے ہو چل صورت تری درگور دور

---

دلِ شوریدہ سے نے خاک اُڑا کر
بیاباں رکھ لیا سر پہ اٹھا کر

---

خفا تو ہو نہ وقتِ ذبح میرے تلملانے پر
کیوں کیا لوٹتا ہوں میں ترے بازو دبانے پر

## سین مہملہ

یہ دو غزلہ انہیں مسودوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔

کونسا ہمدم ہے تیرے عاشقِ بیدم کے پاس
ہم کو کیا ساقی جو تھا جامِ جہاں میں جم کے پاس
غم ہے اسکے پاس ہمدم اور وہ ہے دم کے پاس
تیرا جامِ بادہ ہو۔ اور تو ہو اس پُرغم کے پاس

د ساقیا ہے کیا جو تھا جامِ جہاں میں جم کے پاس

محضر خوں میرا سارا ہے کتر کر پھینکا — دیگی اس ظلم کی محشر میں گواہی مقراض
پاس کیا قطع تعلق میں کہ یکساں سمجھے — قطع میں جامۂ درویشی و شاہی مقراض

رشتۂ عمر کیا قطع سراسر اے ذوق
کھو سکی شمع کے دل کی نہ سیاہی مقراض

اس غزل میں ایک شعر اور بھی کہا تھا:-

اڑنے پرزے مرے جگر کے بھی پڑھتا ہوں جو آہ — ہوتا حق میں ہے مرے مطلع آہی مقراض

اسے میں نے لکھ کر تامل کیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری ابتدا تھی۔ کچھ نہ بولا۔ فرمایا آہی سبزواری بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا۔ کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں؛ ہم تو سب ہی کے لئے کہتے ہیں۔

## عین مہملہ

ذوق کیونکر ہو اپنا دیواں جمع — کہ نہیں خاطر پریشاں جمع

## قاف

پھر کر ادھر ادھر بھی نہ اپنا گیا تملق — لفظ ملق کی طرح سے ہوں ہی رہا تملق

## کاف

جو کھل کر ان کی زلفیں بال آئیں سر سے پاؤں تک — بلائیں آ کے لیں سو سو بلائیں سر سے پاؤں تک
ہم ان کی چال سے پہچان لینگے ان کو برقع میں — بزار اپنے کو وہ ہم سے چھپائیں سر سے پاؤں تک
یہ جتنے سرو ہیں سب ان کے قد پر زہر کھاتے ہیں — چمن میں سبز کیونکر ہوتے جائیں سر سے پاؤں تک
مژول ایک دو دن خوش ادا کی کس ادا کو میں — کہ ہیں واں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پاؤں تک
سراپا شوق جائیں سر کے بل ہم جن کے جلسہ میں — مثال شمع وہ ہم کو جلائیں سر سے پاؤں تک

مجھ میں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آن کے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

---

چمن سے بعد ہیں جیسے میم قاف قفس
قفس میں بند ہیں ہم جیسے فائے ناف قفس

لڑکپن کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اُس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہ گئے۔

لبِ شیریں کو ترے جان کے رنج شمع مگس
بیٹھی نظروں میں ہے بانے ہے لبِ سبز مگس

بوالہوس جیفۂ دنیا سے بھرا دل نہ ترا
تو مگس اور تری چشم ہوس چشم مگس

## صاد مہملہ

سب مذاہب میں یہی ہے نہیں اسلام میں خاص
کہ جہاں عام ہے ہوتا ہے وہاں عام میں خاص

ساغرِ دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے
دیکھ عکسِ رخِ ساقی ہے اسی جام میں خاص

خضر باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیواں جاں بخش
ہے یہ خاصیت اسی کے لبِ دشنام میں خاص

شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصانِ خدا
خدمتی اُن کے ہیں جو زمرۂ خدام میں خاص

کام دن رات ہے عاشق کا ترے ناکامی
کر دیا تو نے لگا اس کو اسی کام میں خاص

عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن
یہ مرض کرتا ہے شدت انہیں ایام میں خاص

ذوقؔ اسمائے الٰہی میں سب اسمِ اعظم
اُس کے ہر نام میں عظمت ہے نہ اک نام میں خاص

## ضاد معجمہ

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض
ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض

بحر و بر میں نہیں کس کو ہوسِ قطع و برید
ناخنِ شیر ہے خنجر دمِ ماہی مقراض

گل کترتی ہیں ہزار دل تری آنکھیں کافر
ہے عجب طرح کی اِک تیز نگاہی مقراض

کب زباں چلتی ہے اس بزم میں بدگویوں کی
ان کے منہ میں یہ زباں ہے کہ الٰہی مقراض

اگر نہ جبر کروں اختیار اے ناصح
تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل

اڑے گا مثلِ شرر ٹکڑے ہو کے سنگ مزار
رہا اگر یونہیں گرمِ تپش مزار میں دل

برنگِ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
ہوا شگفتہ نہ اپنا کسی بہار میں دل

فلک کے رنگ سے ظاہر ہیں ماتمی آثار
خوش اپنا کیونکہ ہو اس نیلگوں حصار میں دل

برنگ بیضۂ نوروز۔ توڑے دل اُس نے
ہزاروں۔ ایک بنا آکے اس قطار[1] میں دل

ہزار دشمن جاں سے ہے ایک دوست بُرا
جو پوچھو کون ہے وہ؟ میں کہوں ہزار میں دل

نہ ہوں میں خلد میں حوریں تو رہتا خلد میں کون؟
لگے ہے صحبتِ خوبانِ گلعذار میں دل

یہ جسم زار ہے یا میرے پیرہن میں ہے تار
گرہ ہے تار میں؟ یا میرے جسم زار میں دل

اٹھا بھی لائے اگر ہمنشیں مجھے لے ذوق
رہیگا میرے ملوث یہ اکوے یار میں دل

ازل سے یوں دلِ عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرش خدائے غفور کی قندیل

مجھ وہ دُرِ بناگوش نور کی قندیل
تجلی ہے اختر صبح نشور کی قندیل

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے باب کمالِ ظہور کی قندیل

جہان ہے خانۂ عشرت، تبھی ہو اسکا فروغ
کہ لٹکے اس میں سرِ پُر غرور کی قندیل

رہے ہے جوں ثمرِ منخسف سدا بے نور
سیاہ بختوں کے بالینِ گور کی قندیل

پڑے جو عکس ترا جام میں تو ہو روشن
حباب بادہ تجلی سے طور کی قندیل

عیاں ہے یوں مرے روزِ سیاہ میں خورشید
کہ جیسے شب کو نظر آئے دور کی قندیل

سوائے دل کے ہو نارنج باغِ خلد سے بھی
کبھی پسند نہ اس رشکِ حور کی قندیل

[1] قطار۔ بہار نوروز میں لوگ بازیوں پر انڈے لڑاتے تھے۔ اس کے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی بتا بتا ہم انڈے لے کر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑائے جاتا تھا جس کا انڈا اخیر کو ٹوٹتا اس کی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ثابت سب انڈے لے لیتا تھا اسے قطار لڑانا کہتے تھے۔ یہ رسم ایران، توران، افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آ گئی تھی۔"

نہ ہوں بے پردہ تو بھی وہ کھڑے دیکھوں شوخی سے
چھپن چلمن سے وہ پردہ دکھائیں سر سے پاؤں تک

بنایا اس لئے اس خاک کے پتلے کو تھا انساں
کہ اس کو درد کا پتلا بنائیں سر سے پاؤں تک

سراپا پاک ہیں دھوئے جنہوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پاؤں تک

مزا اتنا ہی ذوق افزوں ہو جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخم تیغ عشق کھائیں سر سے پاؤں تک

کچھ تو آئے خیر سے ہم جا کے اس مغرور تک
پر اچھلتا ہی رہا اپنا کلیجہ دور تک

---

صفحۂ دہر پہ یک دل نہ ہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں پر کہتا ہے خدا ایک سے ایک

# گاف

پرانی غزل ہے۔ یہ شعر نکلے۔ دو یاد رہ گئے وہی لکھ دیتا ہوں۔

بینی و عارض تو پردے میں ہیں شاخ و گل و برگ
یوں عیاں اس چمن رو سے ہیں شاخ و گل و برگ

بینی اور وہ دہن خندہ زن اور تارک لب
لکھے گویا قلم مو سے ہیں شاخ و گل و برگ

# لام

چھٹے نہ حلقۂ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو نوالہ دہان مار میں دل

بغل میں جیسا مرا دل بغل کا دشمن ہے
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

نکل نہ جائے دم اضطراب سینے سے
برنگ شعلہ کہیں آہ شعلہ بار میں دل

ہمیشہ روزن سینہ سے کیوں ہے چشم براہ
اگر نہیں کسی مہوش کے انتظار میں دل

ترا خدنگ نگہ ہے وہ بلا کہ جائے گھر
پروئے زلف مسلسل کی تار تار میں دل

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل

بغیر مارے نہ چھوڑے گی دل کو کافر زلف
کہو یہ دل سے کہ جائے نہ مار مار میں دل

شمع نازاں نہ ہو اک رات بہا آنسو گرم ۔ برسوں یاں آنکھ سے یکلخت گرے لوہو گرم

اے جنوں ہے خبر موسمِ گل ہر سو گرم ۔ دم تو لے لینے دے مجھ کو نہ کر اتنا گرم

آتشِ رشک سے اُس کاکلِ مشکیں کے صبا ۔ جل گیا نافہ میں اس درجہ ہوا لوہو گرم

آبلے سینۂ دریا میں ہوئے جل کے حباب ۔ دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

اے صبا نکہتِ گل لے کے چمن کو پھر جا ۔ کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے خوشبو گرم

آتشِ حسن کا پُتلا ہے تو اے رشکِ پری ۔ تابِ رخ تیرے بھبوکا ہے بلا ہے تو گرم

توسنِ ناز ترا ہر قدم اے رشکِ غزال ۔ کیوں نہ ہو تیز کہ رکھتا ہے مزاج آہو گرم

فاختہ سوزِ محبت سے ہوئی جل کے ہے خاک ۔ کھینچے ہے دل سے پر اب تک نفسِ کوکو گرم

مشعل افروزِ جنوں کون ہو مجنوں کے لئے ۔ گر نہ ہو گرمیٔ وحشت سے دلِ آہو گرم

ق سردمہری کا تری ہو جو خنک دل کشتہ ۔ ہووے گلگشت سے کیا اُسکا دلِ لے گلرو گرم

تابشِ نارِ جہنم سے سوا اسکو لگے ۔ بھرے بادِ سحر بوئے گلِ شبو گرم

ق سردمہری سے رکھا اپنی خنک دل تو نے ۔ گرمجوشی سے کیا تو نے بہت دلجو گرم

اپنے کشتے کی کرامت کو ذرا دیکھ آکر ۔ ایک پہلو ہے اگر سرد تو اک پہلو گرم

ذوقؔ دل میں یہ تپِ عشق کلام ایسا خنک
عاشقانہ ہی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

جل بے اے آتشِ غم دل کو کرے یہ تو گرم ۔ کہ زمیں پُشت سمک تک ہو تہ پہلو گرم

لطفِ بوسہ نہ رہا ہم پہ ہوا جب تو گرم ۔ شربتِ قند دیا کر کے پر آتش خو گرم

تن رہا یوں ہی تپِ غم سے اگر گرم مرا ۔ سیخِ آہن کی طرح ہونگے بدن پر مو گرم

نیشتر جل کے وہیں کشتۂ فولاد ہوا ۔ نکلا یہ آتشِ سودا سے مرا لوہو گرم

کٹ سکا صیدِ محبت کا نہ قاتل سے گلا ۔ اُس نے پتھر پہ یہ رگڑا کہ ہوا جب تو گرم

آتشِ دل سے پس از مرگ برنگِ شعلہ ۔ خاکِ عاشق سے نکلتا ہے گلِ خودرو گرم

مہوشِ جل بے ترے حسنِ جہانتاب کی تاب ۔ رخ سے گرم آئینہ ہو آئینے سے زانو گرم

اڑے جو آہ کے ہمرہ نکل کے پارۂ دل
ہوئے ہوا میں وہ صورت طیور کی قندیل

وہ تیر ہیں یہ مرے نالۂ قیامت زا
کہ اُن کے رکھنے کو لازم ہے صور کی قندیل

نسیم کیا ہے کہ روضہ میں تفتہ جانوں کے
نہ گُل ہو باد سے آوازِ صور کی قندیل

سمجھتا قدر ہے ناقص کب اس غزل کی ذوق
یہ روشن آپ نے کیوں پیش کور کی قندیل

یہ غزل لڑکپن کی ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

[illegible]

دیوانہ ہوں ترا نہ یا کام کہ لوں گُل
زیبائش سر کو ہیں مرے داغِ جنوں گُل

ہوں زیرِ قدم خار ہے سر داغِ جنوں گُل
یا ہے یہ جنوں بودل سا افا جنوں گُل

میں کشتہ ہوں اُس لبِ پاں خوردہ کا کس کے
نکلے ہیں مری ناک سے آغشتہ بخوں گُل

سو نکڑے ہیں ایڑی کے برنگِ گلِ صدبرگ
کیا دشت نوردی میں کترتا ہے جنوں گُل

اس گُل میں نہ پایا اثرِ بوئے محبت
سو بار سنگھائے اُسے پڑھ پڑھ کے فسوں گُل

ہے روشنی خانۂ دل سوزِ محبت
زاہد تو بتا شمعِ حرم کیونکہ کروں گُل

پیکاں تو ہے دلدوز سر سینہ ہے سوفار
اُن تیر سے ہے دل میں دڑا غنچہ پڑں گُل

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے
گلدستے بھی ہیں مرے ہاتھوں پہ فزوں گُل

آئینۂ فلک میں ہے عکسِ چراغِ دل
خورشید ہو نمود ہوا ہل ہے داغِ دل

## میم

عالمِ نوجوانی کی غزل ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقومہ الذیل طرح ہوئی آغازِ شباب تھا۔ ہم نے کہا کہ زمین تو گرم ہے۔ مگر تاثیر ٹھنڈی ہے۔ میر مشاعرہ نے کہا کہ خیر اب تو ہو گئی۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم تو دو غزلیں کہدینگے۔ مگر دیکھنا سب کیا کہینگے۔ جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آیا نالاں آیا۔

اُس خالِ رخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق
ہندوا سیر دیکھیں ذرا ائدوں میں ہم

سینہ کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
مصروفِ زخمِ دل کی نمکسرانیوں میں ہم

بیمِ کدورتِ دلِ صیاد گر نہ ہو
کیا کیا اُڑائیں خاک پر افشانیوں میں ہم

دکھلائیں روزِ حشر کو بین السطور سے
اپنے سیاہ نامہ کی طولانیوں میں ہم

جا سکتے ضعف سے نہیں کوچہ میں اُسکے ذوق
بہہ جائیں کاش گریہ کی طغیانیوں میں ہم

# نون

[illegible]

بے یار روزِ عید شب سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پُرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جام جس کے ہاتھ میں تو جم سے کم نہیں

اُس زلفِ فتنہ زا کے لئے اے مسیح دم
کچھ دستِ شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں

زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں
اپنے خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

سرعت سے نبض کی رگِ سنگِ مزار میں
دل کی تپش کچھ اب بھی تپِ غم سے کم نہیں

وحشی کو تیری چشم کی مژگانِ ہر غزال
صحرا میں تیز ناخنِ ضیغم سے کم نہیں

ہوتی ہے جمع زر سے پریشانی آخرش
درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

ساقی ملے ہزار فلاطوں ہیں خاک میں
جو خم بنے ہے قالبِ آدم سے کم نہیں

اُس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں

شورابۂ سرشک میں ڈوبا ہوا ہے دل
تیزاب میرے زخم پہ مرہم سے کم نہیں

ہاتھوں سے تیرے پارۂ الماس زخمِ دل
مجھ کو تو جلوۂ گل و شبنم سے کم نہیں

اے ذوق کس کو چشمِ حقارت سے دیکھئے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں تامل دمِ ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

کیا کہوں نامۂ جانسوز کی اپنے تاثیر
جل گیا بس یہ۔ کبوتر کا ہوا بازو گرم

سرِ مجروح کو ٹھکرا کے گیا وہ۔ اور میں
چو لکا اُس وقت کہ جب منہ پہ بہا لہو گرم

دست خورشید کی۔ رعشہ سے سپر جا چھوٹ
کھینچ کر تیغ کو جب ہو وہ ہلال ابرو گرم

دلِ عاشق کے جلانے کا ہے سارا ساماں
بنی شعلہ ہے تری رنگ بھبوکا۔ رو گرم

کونسا سوختہ جاں صبح سے ہے گرمِ فغاں
کہ ہوا آتی ہے کوچہ سے ترے گلرو گرم

ہم تو سنتے تھے سدا کُل حمُوضٍ بارِدٍ
ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش ابرو گرم

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کس کی زلف کے زندانیوں میں ہم

ہوتی نہ یاد زلف تو خط آشکستہ میں
لکھتے الف خطوں کی نہ پیشانیوں میں ہم

زنجیر میں بھی نالۂ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم

پائی نہ تیغ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھل من مزید بھول
لائیں جو آہ کو شررافشانیوں میں ہم

پاکوبیوں کو مژدہ ہو زنداں کو ہو نوید
پھرتے ہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

تم بھی نہیں جگر پہ رہی۔ اس قدر رہے
سرگرم سوزِ عشق کی مہمانیوں میں ہم

مطلب ہے اپنے کون ہے آگاہ جز خدا
جو خطِ سرنوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

ہیں آئینہ میں صورتِ تصویرِ آئینہ
آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

ہو وہ عزیز سورۂ یوسف سے بھی سوا
رکھدیں تری شبیہ جو کنعانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو۔ بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندہ یار سے
اب مر رہے ہیں اس کی پشیمانیوں میں ہم

پردہ میں چشمِ مست کے سرخوش ہیں جو مدام
شرب[1] الیہود کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

[1] شرب الیہود۔ یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں کمزور رہتے ہیں۔ اور اسی واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں خوشحالی نہیں ظاہر کرتے۔ عیسائیوں سے زیادہ تر دبے رہتے ہیں۔ شراب کم پیتے ہیں اور چھپ کر پیتے ہیں۔ اہل ایران نے شرب الیہود اصطلاح مقرر کر دی۔ یعنی کم پینی اور چھپ کر پینی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے۔ چشم مست کی یاد میں در پردہ سرخوش رہتے ہیں۔ گویا ہماری مے خواری یہودیوں کی شراب خوری ہے۔

استاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کے لیے کہتے تو اپنی غزل اس طرح میں نہ کہتے تھے اور کبھی کہنی بھی پڑتی۔ تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھ دیتے کہ حضور کی غزل پھیکی نہ پڑ جائے اب بھی نہ لکھی تھی۔ شمع سامنے آئی تو کہا مجھے تو فرصت نہیں ہوئی۔ کیا کہوں۔ غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب اور اور اشخاص نے فرمائش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھیے سب نے بہت کہا تو میں ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ دے کر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی تعریفوں کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سنائی نہ دیتا تھا۔ در و دیوار بول رہے تھے۔ ع

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں

حضور کی غزل جو اس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ایک شعر اس کا مجھے اب تک نہیں بھولا اور نہ بھولے گا۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو / ہم بیکسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

دلی میں تو پشت بہ پشت خاندان زیرِ زمین آباد ہے۔ سکندرہ میں اکبر۔ آگرہ میں شاہجہاں اورنگ(آباد) میں عالمگیر۔ اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی۔ پسند کہاں؟ رنگون جلّ شانہٗ جلّ جلالہٗ

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں / اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
مردار ہیں وہ طائرِ سدرہ ہی کیوں نہ ہوں / تیرِ نگاہِ یار کی جو دُور زد سے ہیں
خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ / روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں
وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تمناً / بنیادِ میکدہ مری خشتِ لحد سے ہیں
جاں دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ / اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

لہ غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی۔ مذکورہ بالا شعر جب اس کا مجھے یاد آتا ہے تو دیدۂ عبرت سے لہو ٹپک پڑتا ہے۔ دیکھو افسانہ سیر باد کا واقعہ بھی انہی پسند پہ ہوا۔ کابل میں موا ہوتا۔ بابر دادا کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں موا ہوتا تو اورنگ آباد میں عالمگیر کا مقبرہ تھا۔ اکبر آباد بھی دارالسلطنت تھا۔ وہاں مرتا شاہجہاں کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا وہاں مرتا اکبر کے دامن میں سوتا۔ لاہور میں آن مرتا جہانگیر کی خوابگاہ حاضر تھی۔ موا تو کہاں؟ رنگون میں۔ استغفرت کرے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا۔

لاشے کو دفن کیجئے میرے کہ پھینک دیجئے
مردہ بدست زندہ ہو چاہے سو کیجئے

تشنۂ دشت محبت کے لیئے اِس لب سے
کوئی دنیا میں عقیقِ یمنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اس عالمِ تصویر میں سب
اک مگر ناز ہے یہ کم سخنی خوب نہیں

چشم کہتی ہے تری جنبشِ مژگاں سے کہ دیکھ
سر پہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے ہے کسی میخوار کا دل
محتسب دیکھ نہ کر دل شکنی خوب نہیں

تاب دنداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنس کر
کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

خارشِ خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ گل دعوے نازک بدنی خوب نہیں

اُٹھ ہی جائیگا اس دل سے دھواں آہ کے ساتھ
جب تلک جلنے کا یہ سوختنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گزرا
آج جو سردِ نسیمِ یمنی خوب نہیں

سنہ ۱۸۵۱ء میں مرزا خدا بخش ایک معزز شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا۔ حضور سے بھی غزل کا وعدہ لیا۔ استاد مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ ان سے بھی بہت کہا اور اقرار لیا۔ مطلب یہ تھا کہ آئینگے تو سینکڑوں آدمی سننے کو آئینگے۔ مشاعرہ کو رونق ہو جائے گی شاہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر استاد کو مانتے تھے۔ غرضکہ مشاعرہ میں گئے۔ غالب مرحوم مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص آئے۔ حضور بالا بالا تشریف لائے۔ اور پس پردہ بیٹھے۔

حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بڑے شائق سخن تھے۔ اور سخن شناس تھے۔ اُنہوں نے استاد سے کہا۔ کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ استاد نے کہا بسم اللہ۔ چنانچہ بموجب آئینِ مشاعرہ پہلے شمع مشاعرہ وسط مجلس میں رکھی گئی۔ ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس باادب بیٹھا اور حضور کی غزل سنائی۔ (اکثر مشاعروں میں یہ غزلیں خلیفہ اسمعیل پڑھا کرتے تھے۔)

نہ جنبش نبض میں جس کے ۔ نہ گرمی جس کے لمس میں ۔
دکھائے چیرہ دستی آہ بالا دست گر اپنی
تو مارے ہاتھ دامانِ قبا سے چرخ اطلس میں
جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیال بیت ابرو میں
وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں
کرے لب آشنا حرف شکایت سے کہاں یہ دم؟
ترے محزونِ بے دم میں ۔ ترے مفتون بیکس میں
ہوائے کوئے جاناں لے اُڑے اس کو تعجب کیا
تنِ لاغر میں ہے جاں اس طرح جس طرح بو خس میں
مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے
ہزاروں دے چکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضموں ذوق ایوانِ دو عالم میں ہوئے موزوں
جو اس خمسہ میں انساں کے وہ بند مخمس میں

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں
ہم اُن کی زلف سے سودا جو دام لیتے ہیں
تو اصل و سود وہ سب دام دام لیتے ہیں
ترے خرام کے پیرو ہیں جتنے فتنے ہیں
قدم سب آن کے وقت خرام لیتے ہیں
شبِ وصال کے روزِ فراق میں کیا کیا
نصیب مجھ سے مرے انتقام لیتے ہیں
ترے اسیر جو صیاد کرتے ہیں فریاد
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیرِ دام لیتے ہیں
ہم اُن کے زور کے قائل ہیں زور بازو ہیں
جو عشق میں دل مضطر کو تھام لیتے ہیں
جھکائے ہے سرِ تسلیم ماہِ نو ۔ پر وہ
غرور حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں
ترے قتیل بتاتے نہیں تجھے قاتل
جب اُن سے پوچھو اجل ہی کا نام لیتے ہیں
قمر کا داغ بھلا آئے کس حساب میں داغ
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

چشم غرض ہے مروت اُنکو جو چاہو قوت
رکھتے امید دوستی اس سرو قد سے ہیں

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی ہے آپ کی
رکھتے نقیہ کام نہیں رد و کد سے ہیں

برتیں خنک دلوں کے ہو لو خرقہ فقیر
سمجھو کہ کرتے بدن کی پوشش نمد سے ہیں

وہ ایک دم کہ جس میں میسر ہو وصلِ یار
بہتر سمجھتے ہم اسے عمرِ ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یاں بروشِ نشۂ شراب
بڑھ جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ہرچند ناتواں ہیں مگر رکھتے دل قوی
ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

جاں ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہر داغِ عشق
ہم کرتے **ذوق** عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

ہے چشم تیری مست قدح گیر باغِ حسن
عارض پہ خط ہے طوطیٔ تصویرِ باغِ حسن

ہو جاتا دل ہے بیٹھ کے خود گلرخوں میں گل
تاثیرِ باغِ خلد ہے تاثیرِ باغِ حسن

تحریرِ سرمہ ہے تری آنکھوں میں رشتۂ آب
اے غیرتِ چمن دو روز تغییرِ باغِ حسن

پانِ مسی و سرمہ و رخ ہو گئے لالہ زار
مشاطہ باغباں ہے یہ تدبیرِ باغِ حسن

تنہا لب پہ گرمیٔ بوسہ سے ہے کہاں
ہے گلرخوا یہ غنچۂ دلگیرِ باغِ حسن

اے رشکِ باغ طاقِ دو ابرو کا تیرے عکس
دریائے آئینہ میں ہے تعمیرِ باغِ حسن

سیرِ خزاں جو چاہے تو اے **ذوق** دیکھ لے
اس نازنیں کا جلوۂ تغییرِ باغِ حسن

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں
پڑا جس دن سے دل بس میں ترے اور دل کے ہم بس میں
کبھی ملنا کبھی رہنا الگ مانندِ مژگاں کے
تماشہ کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص آپس میں
توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمارِ ہجراں کی

کھائے زخم تیغ قاتل جو بجا لائے نہ شکر
کوئی بھی اُس سے زیادہ کافر نعمت نہیں

خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت مثل ریگ شیشۂ ساعت نہیں

خانۂ ہستی کا اپنے صحن ہے وسعت عدم
روز کرتے ٹہل قدمی مگر فرصت نہیں

سیر کی وحشت پاؤں پھیلا سکے نہ پھیلاؤ تو جہاں
ہوں اگر یکے نہ میداں تو کچھ وسعت نہیں

ایک دل اور سیر اتنے بارِ غم اللہ رے دل
اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

ذوق اُن سے آئینہ ہیں ہزار دلبریں
کوئی صورت اپنے صورت گر کی بے صورت نہیں

[illegible]

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو
دلِ خانہ خراب کی باتیں

واعظا چھوڑ ذکر نعمت خلد
کہ شراب و کباب کی باتیں

حرف آیا جو آبرو پہ مری
ہیں یہ چشم پُرآب کی باتیں

مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

مجھکو رسوا کریں گی خوب اے دل
تیری یہ اضطراب کی باتیں

جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

جام مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

سنتے ہیں اُس کو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھا دل نہ چھیڑ قصۂ زلف
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوشِ عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ایک موقع پر دو فرقوں میں اختلاف کا رنگ بگڑا۔ استاد نے ایک فرقہ کے لوگوں کو حق بجانب دیکھ کر طرف ثانی کے سرگروہوں کو سمجھایا۔ مگر وہ اپنی جمعیت اور کاسازیوں کے گھمنڈ میں تھے۔ نہ سمجھے (قلعہ میں ان نابکاروں کی کارروائیاں دیکھ کر زمانہ کے

[illegible]

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقت مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانہ میں
شمع ہے اک سوزن گم گشتہ اس کاشانہ میں

میں ہوں وہ خستہ کہن مدت سے اس ویرانہ میں
برسوں مسجد میں رہا۔ برسوں رہا بتخانہ میں

مستی و ناآشنائی وحشت و بیگانگی
یا تری آنکھوں میں دیکھی یا ترے دیوانہ میں

میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب
جوش کیفیت سے میری خاک کے پیمانہ میں

ہوش کا دعویٰ ہے بیہوشوں کو زیر آسماں
خم نشیں ہیں مثل افلاطوں سب اس خمخانہ میں

پتھروں میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق یہ تب
پوچھو کیا لے جائے گی آکر مرے ویرانہ میں

عشق کو اے حسن اگر نشو و نما منظور ہو
سبز نخل شمع ہو خاکستر پروانہ میں

برق خرمن سوز ہے عالم میں ناحقی تری
ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں ہر دانہ میں

کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن و عشق
زلف اُس شانے نے کھینچی درد ہے یاں شانہ میں

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے
ذوق ہر بت قابل بوسہ ہے اس بتخانہ میں

اس گلستان جہاں میں کیا گل عشرت نہیں
سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہیں

علم جس کا عشق۔ اور جس کا عمل وحشت نہیں
وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابل صحبت نہیں

خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک
پر کہیں زیر فلک سر منزل راحت نہیں

بسمل تیغ محبت کا لب ہر زخم دل
ہوتا وا۔ بے شور واویلا و واحسرت نہیں

منہ میں گر پانی چوا دے یار اپنے ہاتھ سے
مرگ کی تلخی سے شیریں تر کوئی شربت نہیں

دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال
چشم وہ کیا جس کو تیری دید کی حسرت نہیں

کہتے ہیں مر جائیں گر چھوٹ جائیں غم کے ہاتھ سے
پر ترے غم سے ہمیں مرنے کی بھی فرصت نہیں

ایک حسرت تو برستی ہے کبھی برسی کے دن
ورنہ روتا ابر بھی اپنے سر تربت نہیں

ہے نوشتہ میں ترے بیمار کی صحت کہاں؟
اُس کے نسخہ میں دوا کے لفظ کو صحت نہیں

بنا کے چتر کے دنبالہ پردہ خال سیاہ
سنانِ ترکِ نظر پر سپر کو دیکھتے ہیں

عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اس رخ پہ
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں

الٰہی آگ یہ سینہ میں ہے کہ آفت ہے
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنرور اپنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

زیادہ سر سے ہو جو دشمن تو ہم سمجھتے ہیں
تڑپتا خاک پہ بار دوسر کو دیکھتے ہیں

نگیں کو دیکھ لیں چاہیں جو نام عالم میں
کہ سینہ کاوی میں یاں نامور کو دیکھتے ہیں

خراشِ ناخنِ وحشت سے چارہ گر سیرے
شکستہ بخیۂ زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اٹھائی آنسوؤں نے کس پہ آج ہے تسبیح
سفر ہے جاں کا جو فال سفر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوشِ مژگاں سے ہر سرِ مژگاں
ٹپکتا قطرۂ خونِ جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں کے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

دکھا دو تم لبِ میگوں پہ خندۂ تلخیں
کہ یاں تو ساغرِ مے میں شکر کو دیکھتے ہیں

عیارِ نقدِ محبت کا دیکھ تحقیق پر !
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

کسی دوست نے فرمائش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے۔ آپ بھی غزل کہیے۔ آغازِ شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق۔ غزل کہی۔ اس کا جا بجا چرچہ ہوا۔ یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرام گاہ ان دنوں بادشاہ تھے۔ انہوں نے فرمائش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو۔ ہمیں خود آکر وہ غزل سنائیں۔ یہ ولیعہد یعنی مرزا ابوظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ ایک قصیدہ ان کی مدح میں کہہ کر شامل کر دیا۔

سے ملا کر ساقیانِ سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

زلفِ افعی وش کو دھو دے گرہ پر فن آب میں
ہوں بجائے موج پیدا مار رہزن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا پائے نگاہ
اس طرح جاتے ہیں دیکھا پاک دامن آب میں

دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا اہلِ تالیف بیچاروں کو کیا خبر۔ سب کو خدا مغفرت کرے

سلام کرتے ہیں اُن کو جدھر کو دیکھتے ہیں
اور اُن کو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج تری ہم اثر کو دیکھتے ہیں

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
انہیں تو دیکھیں ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی برش تیغ نظر کو دیکھتے ہیں
ہم اُن کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

نہ چشم و شہ کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
جدھر کو آپ نہ ہوں ہم اُدھر کو دیکھتے ہیں

میں چپکا دیکھ رہا ہوں تماشے داغوں کا
کہ چارہ گر انہیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اُن آہوؤں سے کہو دیکھیں میری آنکھوں کو
جو آب جو میں گلِ نیلوفر کو دیکھتے ہیں

ہے اُن کی چشم کی گردش پہ گردشِ عالم
جدھر ہو اُن کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

ہماری وصل کی شب ہے وہ یا شبِ محشر
کہ اُٹھ کے صبحِ قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

ہوا کے گھوڑے پہ کس برق وش کو دیکھا تھا
کہ طمطراق پہ ہم کرّ و فر کو دیکھتے ہیں

پڑے گا سایۂ زلف اُس پہ بھی ضرور کبھی
کہ پیچ و تاب تمہاری کمر کو دیکھتے ہیں

ہم اُن کے کوٹھے پہ چڑھ کر ہیں ڈھونڈتے چھید
کدھر کو چاند ہے اور ہم کدھر کو دیکھتے ہیں

خدا کا بندہ ہو زاہد خدا کو دیکھ ذرا
کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں

اُدھر شفق میں ہے شام اور اُدھر ہمیں دیکھو
ابھی سے دم بدم اُٹھ کر سحر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھو شغل اسیری میں ہم غریبوں کا
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

وہ دن تو عید کا ہوتا ہے دن ہمارے لئے
تمہارا اُٹھ کے جو منہ ہم سحر کو دیکھتے ہیں

یہ کس کو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھا کر
پڑا زمیں پہ جو نورِ قمر کو دیکھتے ہیں

سوال جوہر آئینہ ہے یہ چشم پُر آب
کہ منہ پہ خاک ملے کیوں ہنر کو دیکھتے ہیں

بہار کو ہیں دکھاتے ستارہ سحری
تمہارے کان میں جب ہم گہر کو دیکھتے ہیں

فنا کی راہ میں پتھر جو بن کے بیٹھے ہیں
اُنہی کو دیکھ کے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں

وہ خاک اُڑائینگے بازارِ عشق میں آ کر
کہ پہلے آن کے سود و ضرر کو دیکھتے ہیں

یہ جب اپنے رونے پہ سوزِ جگر کو دیکھتے ہیں۔ دھوئیں پہ اُڑتا ہوا خشک و تر کو دیکھتے ہیں۔

پڑھ کے بسم اللہ مجریہا و مرسیہا دلا
جوں شناور پھر ہوا ہیں دست و پا زن آب میں

مطلعِ روشن لکھا جس سے کہ بحرِ نظم میں
صورتِ اختر درِ معنی ہیں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو حیکہ تو سن آب میں
نورِ حق ہو ازل برہاں پر مبرہن آب میں

اے شہِ الیاس رتبت اے شہِ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

نام حق لیکر جو مارے تیغ راہ حق میں تو
غرق جوں فرعونیاں ہو فوج دشمن آب میں

تو شہِ دریا نوال اور دل ترا موجِ کرم
ہے سخاوت سے تری دست تلاطم زن آب میں

تیرا نیسانِ عطا جس دم گہر باری کرے
گوہر ترے بھریں جوں کے دامن آب میں

علم تیرا جستجو جا ہے تو گم ہونے نہ پائے
مثل ابراہیم ادہم ایک سوزن آب میں

تیرے حکم شرع سے جب کفر دریا برد ہو
غرق ہووے تا بہ انشائے برہمن آب میں

ہو ترے سینہ میں جب بحر معانی موجزن
قطرہ سے روشن ہو نسمہ معنی روشن آب میں

ہو ترا فیض سخن گر مسیحی نطقِ فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوا زن آب میں

تیرے آگے گر کریں اعدا سر عصیاں بلند
مثل قوم نوح ہووے سب کا مدفن آب میں

تو مہم آرا ہو جو دریا میں تو ایک اک کرم آب
ہو عدوے قتل کر یوں سو تہمتن آب میں

روئے دریا پر بناتے ہیں ہم موج و حباب
پھر سر بازان لشکر خود و جوشن آب میں

نور ظلمت ہمد گر دشمن ہیں پہ حیراں ہو ہمیں
تیرے خنجر تک ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں

ق
باد پا تیرا ہے یوں آتش قدم بر روئے خاک
ہووے جوں برق درخشاں سایہ افگن آب میں

عکس اس کا دریا میں ہے اور تن سے اڑ جاتا ہے یوں
روح گویا اڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں

تیرا فیلِ کوہ پیکر بسکہ دریا سیر ہے
ڈالے وہ کوہِ رواں جب اپنا دامن آب میں

مثل ابر آئے و لیکن سرعتِ رفتار سے
اوپر اوپر جائے مثل ابر بہمن آب میں

نسر طائر نسر واقع چرخ پہ تا ہوں شہا
اور زمیں پر ہوئے تا ماہی کا مسکن آب میں

ہو ہوائے شوق میں سر پر ہما اقبال کا
ماہیِ دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

بچتا ہے سیلِ حوادث سے کوئی مردِ خدا — شیر رہ جاتا ہے تِرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

صحبتِ اہلِ صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں — زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اب بھی گریہ سے مجھے فرصت نہیں تلوار وار — گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

لی مس نمایاں میں رکھا سب اس نے اپیرہ کو — ڈوب مر رو رو کے تو اے بے بہن آب میں

دیکھنا آبی دوپٹہ منہ پہ اس کے وقتِ خواب — بُرجِ آبی میں ہے مہ یا مہرِ روشن آب میں

میں ہوں وہ تفتیدہ دل کر جائے اک دریا کو جذب — گر پڑے گر ذرہ میری خاکِ مدفن آب میں

یوں رہا میں زندگی بھر تشنۂ دیدارِ یار — جیسے مستسقی کا دم ہوتا ہے مردن آب میں

سایۂ سروِ چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے — اژدہا بن بن کے شعلے رشکِ گلشن آب میں

وعدہ ہے آنے کا اس کے ابر کھل جائے تو آئے — ڈالتا ہوں دمبدم اٹھ اٹھ کے روغن آب میں

شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے امڈے اشک — بہہ گیا خط لکھتے لکھتے مثلِ شفق من آب میں

ذوق تو اس بحر میں ایسے گلِ مضموں بہا
جا بجا لگ جائے اک پھولوں کا خرمن آب میں

ہووے تو اے مہروش جب پرتو افگن آب میں — ہو سراپا فلسِ ماہی ماہِ روشن آب میں

عکسِ زلفِ یار اور آئینۂ رخسارِ یار — کھینچے ہیں شام و سحر تصویرِ سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو غیاں شرم سے — پانی پانی ہو گیا اے شوخِ پُرفن آب میں

مردمِ دیدہ ہیں اپنے زندہ آبِ اشک سے — مردمِ آبی ہیں ان کا ہے نشیمن آب میں

بھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک — ناؤ کاغذ کی بہے اے طفلِ کودن آب میں

تو لبِ دریا ہنسے آکر جو اے رشکِ بہار — ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

لے تو اپنے منہ سے پھر ذرا آبی نقاب — نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا کیا سبزہ ہے کیا گل ہے کیا ابرِ بہار — لطف ہے گر ہوئے فیضِ ربِ ذوالمن آب میں

مدح کر اس شاہِ دریا دل کی اے دل جس کا فیض — لعل و گوہر ہے بہاتا وقتِ گفتن آب میں

شاہ اکبر خسروِ غازی کہ آبِ تیغ سے — رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بہ گردن آب میں

ہے میکشوں کے واسطے میخانہ تخت جم — یاں جام مے ہے سامنے گر جام جم نہیں
چمکا یہ آتش دل پروانہ کا ہے رنگ — جلے شمع رو عیاں شفق صبحدم نہیں
ہے لوث حب زر سے یہ دامن ہمارا پاک — گر چھینٹ بھی پڑے تو سجدہ درم نہیں
گر آب دیدہ شربت کوثر بھی ہے تو کیا — جب تک کہ اس میں چاشنی درد و غم نہیں
حالت ہوا ب یہ زار ترے دلفگار کی — ہے چشم زخم منہ پہ کہ جو چشم نم نہیں
ہاتھ آئے کس طرح سے دل گمشدہ کا کھوج — ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں
ہاتھوں سے چرخ تفرقہ پرداز کے کبھی — کر سکتے آہ دست تاسف بہم نہیں
سرباز عشق کے لیے دارالاماں کہاں — [illegible] قطع ہے سر شمع ستم نہیں

جاتا ہے آنکھیں بند کیے ذوق تو کہاں
یہ راہ کوئے یار ہے راہ عدم نہیں

عالم شباب کی غزل ہے یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی (دیکھو صفحہ ۱۱۲) ارشش کی مقاطیس بہت لگائی مگر استاد نے یہی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خان طبیب شاہی تھے اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں وہی دیوان ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے۔ مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا۔ سخن کے جوہر شناس تھے۔ استاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے انہیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے ان ہی کی زبان سے نکل گئی تھی۔ حکیم کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے مگر خلیفہ صاحب کے سبب کھٹکتے تھے خیال تھا کہ حضور پھر انہیں نہ تیں سپرد نہ کردیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اختیار ضعیف ہو جاتے تھے۔ آپ ہی میرزا نوشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا حالانکہ استاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے گئی [illegible]

ہم سے ظاہر و پنہاں ہوا میں غارت کرنے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظروں نظر کے جھگڑے ہیں

درِ مشاعرہ کی غزل ہے۔ جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اس پر صرف ہوئی۔

غمنامہ اپنا صفحۂ محشر سے کم نہیں
ہے شور الغیاث صریرِ قلم نہیں

وہ دل ہے کونسا کہ ستم پر ستم نہیں
گر یہ ستم ہیں روز تو اک روز غم نہیں

مضموں کے پیچ و تاب سے تابِ رقم نہیں
ہے زلفِ یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں

بعد از فنا بھی جوشِ جنوں میرا کم نہیں
کس وقت راہ لے سرِ دشتِ عدم نہیں

گو اضطرابِ دل کو عیاں کرتے ہم نہیں
ہر جو رگ ہے رگِ بسمل سے کم نہیں

جوشِ شگفتگی سے محبت کا خم نہیں
یہ خونِ خراشِ دل میں تبسم سے کم نہیں

آتش میں آپڑا تو ہے میری طرح سپند
لیکن کہیں بھی جائے کا ثابت قدم نہیں

یہ دل مجھے ڈبو کے رہیگا کہ سینہ میں
وہ کونسا ہے داغ جو گردابِ غم نہیں

منظور دل کو کاوشِ غم کی ہے مشق اگر
بہتر مژہ سے یار کی کوئی قلم نہیں

ہیں آمدِ بہار سے پھولائے منہ میں خوں
یہ زخمِ دل تبسمِ غنچہ سے کم نہیں

ہم کافرانِ عشق کو ہے یہ بڑا عذاب
دوزخ میں آتش آتشِ سنگِ صنم نہیں

مجھ روسیہ کا کب نہ ہوا سجدہ سرخرو
کب گردنِ تجلیاتِ محراب خم نہیں

مشکل ہے میرے عہدِ محبت کا ٹوٹنا
اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اہلِ صفا کا رنگیں نہ دامن کسی نے تر
گو ہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

وحشی کو تیرے وحشت ہی ہے عرصۂ بہشت
آہو کی شاخ شاخ سے طوبیٰ کے کم نہیں

اللہ رے ضبطِ دل کہ ہی برسرِ مزار
گیسوئے دودِ شمع میں بھی پیچ و خم نہیں

اے عہدِ یار ہے تو نہیں یہ کہ اٹھ گیا
ڈھونڈوں کدھر سراغ کہ نقشِ قدم نہیں

منصوبہ ہارنے کا صرف کرتے ہیں حریف
اور مجھ میں شکل بازیِ شطرنج کم نہیں

تو نے جو ہاتھ قتل سے کھینچا تو کیا ہوا
رکتی کسی طرح تری تیغِ ستم نہیں

صاحب پرنسپل سے مدرسہ دلی مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ رات کے ۹ بجے شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان صاحب سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن دروازہ ۲ بجے رات تک کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے اُٹھا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے رؤسا اور تمام نامی شاعر اور علماء موجود ہوتے تھے مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کیطرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل پڑھی۔

| | |
|---|---|
| ہم پھڑک کر توڑتے سارے قفس کی تیلیاں | پر نہیں اے ہمت غیر اپنے بس کی تیلیاں |

دوسرے مشاعرے کے لیے یہی طرح ہوگئی۔ استاد مرحوم نے دو غزلہ لکھا اس میں کچھ تکرار ہوئی اس پر جوش میں آکر استاد نے فرمایا کہ برس دن تک علاوہ غزل طرحی کے ایک غزل اسی زمین میں اور ہوا کرے۔ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ تیسرے جلسہ میں انہوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ چوٹیں کیں۔ استاد مرحوم کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ وجیہ الدین منیر یعنی شاہ صاحب کے صاحبزادے نے یہ شعر بھی پڑھا۔

| | |
|---|---|
| گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا | ڈھانچ میں تو ہیں وہی اگلے برس کی تیلیاں |

اس پر گفتگو زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند ہوگیا۔ استاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہیں پہلے مشاعرہ کی غزل بہت خوب تھی۔ دو مسودے ساتھ آگئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدہ کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے۔ غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ ۶۰ برس گذرے اب تک اس مشاعرہ کی باتیں زباں بزباں یادگار چلی آتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| آفت جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں | ورنہ ہیں یاں بال و پر تار نفس کی تیلیاں |
| استخواں ہیں جس تن لاغر میں جس کی تیلیاں | تیلیاں بھی وہ کہ جو ستر برس کی تیلیاں |
| رخصت پرواز گر دیویں قفس کی تیلیاں | جا کے دیکھ آئیں جو کچھ رکھتی تھیں خس کی تیلیاں |
| دل کے شعلوں سے قفس کے پیش و پس کی تیلیاں | یوں جلیں اڑ جائیں جیسے خار و خس کی تیلیاں |

جیسے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے اِدھر سے جب کے چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں

کیا مومن کیا کافر کون ہے صوفی۔ کیا رندے
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں

ایک ایک جور و ستم پر اُسکے سَو سَو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں۔

غم کہتا ہے دل میں رہوں میں اِسلوئے جاناں کہتا ہے میں!
کس کو نکالوں کس کو رکھوں! یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں

بحر میں موتی پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں۔
دیکھو لب و دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں

دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر
دل کا ذکر رہا کیا باقی۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں

حضرتِ دل کا دیکھنا عالم۔ ہاتھ اُٹھائے دنیا سے
پاؤں پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جن دنوں شاہ نصیر مرحوم سے معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض[1] پارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا۔ لکھنؤ سے آکر مشاعرہ قایم کیا۔ وہ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے انہی دنوں دلی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا۔ اُنہوں نے اُسے مدرسے کے سلسلہ میں لے لیا اور انشائے اردو کی ترقی کا جزو اعظم قرار دے کر

[1] منشی صاحب مغفور میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر دلی کالج سابق میں مدرس سیاق ہو گئے تھے میں نے بھی ابتدائی حساب اُن سے سیکھا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں مرے +

سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالم معنی سے **ذوق**
ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں

اس غزل کے دو شعر لڑکپن سے یاد تھے۔ ایک دن میں نے پوری غزل مانگی۔ فرمایا عالمِ شباب تھا۔ ایک مکان ہمسایہ میں بکنے لگا۔ ہم نے لے لیا۔ بعض اشخاص دعوےدار تھے۔ اُنھوں نے نالش کر دی۔ مولوی فضل حق عدالت میں سررشتہ دار تھے۔ بڑے بااختیار تھے۔ ہمارے مشاعرے کی شناسائی تھی۔ ضرورت لگی کہ مقدمہ کا حال سناویں خیال ہوا کہ وہ شعر کی فرمائش کریں گے کچھ اُنھیں کے رنگ میں کہنا چاہئے۔ اللہ اللہ وہ زمانہ اُن کی فضیلت فلسفی کا شہرہ۔ اور ہم بھی اُن دنوں یہی کتابیں دیکھ رہے تھے عجب ولولہ طبیعت میں پیدا ہوا۔ وہ خود بھی شاعر تھے عربی شعر کہا کرتے تھے۔ اُن کا گھرانا شاعر تھا۔ بلکہ خیرآباد کے بہت لوگ شاعر تھے اردو فارسی سب کہتے تھے۔ ان دنوں بہت لوگ دلی آگئے تھے۔ مولوی فضل حق کا بھی شباب تھا مرزا نوشہ اُن کے بڑے یار تھے۔ غرض سب ہی نے یہ غزل لکھی تھی۔ خدا جانے اب کہاں پڑی ہوگی۔ شکر ہے آزاد کے لئے اللہ نے دو دو تین تین شعر کرکے ۱۹ شعر دیئے۔

آج اُن سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں
پر نہیں معلوم کیا کہویں گے کیا کہنے کو ہیں

وصف چشم و وصف لب اُس یار کا کہنے کو ہیں
آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں

ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
شاید اُسکو دیکھ کر صلِ علیٰ کہنے کو ہیں

بھرے شبنم سے نہ بھر سیماب گل کے کان میں
بلبلیں احوال دل کچھ اے صبا کہنے کو ہیں

دیکھے آئینہ بت چین خاک میں ناصاف سب
یہ کہاں اہل صفا اہل صفا کہنے کو ہیں

دمبدم رُک رُک کے جو منہ سے نکل پڑتی زباں
وصف اُسکا کہہ چکو تو ارے یا کہنے کو ہیں

اب تو رات آخر ہوئی میری طرف دیکھو ذرا
مسجدوں میں لوگ اذاں اے مہ لقا کہنے کو ہیں

میں ترے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا مارے ہیں تیر
سب دہانِ زخم منہ سے مرحبا کہنے کو ہیں

میرے دل کو آپ نے دیکھے تو منہ فق ہو گئے
زردیوں ہی وا ہنسے کہربا کہنے کو ہیں

گر سر سیلا بھی رکھتے ہو خس کی تیلیاں
لیجئے مژگاں کی مجھ بے دسترس کی تیلیاں

گر رگ گل سے ہوں بلبل کے قفس کی تیلیاں
کانٹے آنکھوں میں چبھوئیں اسکے خس کی تیلیاں

طائرانِ رنگ گل کا فکر کیا اے باغباں
ہیں یہی گلہائے گل اسکے قفس کی تیلیاں

اے مہندس مرغ ساعت کو اگر کرتا ہے بند
لے ہوا میں اڑ کے آوازِ جرس کی تیلیاں

میں ہوں دیوانہ کسی کے سبزۂ رخسار کا
خار و پھولوں کی جگہ تم مجھ کو خس کی تیلیاں

سوز غم سے ہیں سلگتے جسم و جانِ ناتواں
تپ کا یہ کوڑا تھا یارب کے برس کی تیلیاں

کشتۂ مژگاں کو گنبد کا ہے مرقد اے صبا
جا لگا اس پر عوض زریں کلس کی تیلیاں

طائر رنگ حنا کا شوق گر ہو اے پری
تیرے ہاتھوں کی لکیریں ہوں قفس کی تیلیاں

پنجۂ مژگاں جو جاروب تمنا ہے
تاب اب لائیں لگدکوب ہوس کی تیلیاں

پھیلاو نیا ہے دل یا کاسۂ روغن حریص
اس میں کیوں رکھتا ہے جاروب ہوس کی تیلیاں

چشم گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائینگی سب میرے قفس کی تیلیاں

شیخ کی داڑھی تو حاضر ہے لگا دے ساقیا
گر نہیں شیشہ کو ہیں درکار خس کی تیلیاں

ہے دوانی اس شجر کیواسطے تازہ خزاں
پتے جھڑ کر رہ گئیں خالی سرس کی تیلیاں

موئے مژگاں ہیں کہ رکھتے ہیں ترے شہباز چشم
آشیاں کے واسطے چن چن کے خس کی تیلیاں

سینہ ہے مرغ دل بلبل رگ گل کا قفس
اس سے نازک اور کیا ہونگی قفس کی تیلیاں

ق

گر نہیں اے صیاد واں تک لے کے جانیکا شوق
مت بنا بلبل کو تاروں سے قفس کی تیلیاں

جو ہیں مرغ تردماغ ان کے قفس کیا چاہئے
ہاں نہیں صندل کی چوبیں اور خس کی تیلیاں

اڑ کے جا پہونچے بہانے شوق میں [illegible] کی طرح
نفس جو لائیں صدائیں زودرس کی تیلیاں

طرز نالہ مجھ سے گر سیکھیں بلا دیویں ابھی
صورت ققنس بنکے آوازیں جرس کی تیلیاں

شیخ تل شکری جو لائے لعل لب کے سامنے
گل کا دونا تھا مگر شاخ عدس کی تیلیاں

آگے ان نالوں کے ہیں یوں خار و خس ہو تو رقیب
جیسے ہوں [illegible] اژدر آتش نفس کی تیلیاں

کارواں حیرت کا تھا شب تک کا تنکا دشت میں
رہ گئیں بن بن کے آوازیں جرس کی تیلیاں

کیا بگولے کیطرح خاک کا پتلا اے ذوق
اڑتا پھرتا ہے بھری جیب سے ہوا ہے اس میں

کرے وحشت بیاں چشم سخنگو اسکو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں سحر چڑھ بولے جادو اسکو کہتے ہیں

سوال بوسہ کو نالا جواب چین ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخ آہو اسکو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا۔ مل گیا سارا
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اسکو کہتے ہیں

عدو سے نیش زن ہر دم ہے میرے در پے ایذا
یہ موذی زہر کی ہے گانٹھ بچھو اسکو کہتے ہیں

گوارا تلخئ مے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو
کہ دارو تلخ ہی بہتر ہے۔ دارو اس کو کہتے ہیں

گرہ کھولی ذرا اُس نے جو اپنی زلف مشکیں کی
معطر ہو گیا آفاق خوشبو اس کو کہتے ہیں

جو پوچھے عقل یہ دل سے۔ بتا کیا نام ہے تیرا
کہوں دیوانہ چشم پری رو اسکو کہتے ہیں

کبھی شیریں نہ دل سے کوہکن نے کوہ کو کاٹا
محبت یہ نہیں ہے زور بازو اسکو کہتے ہیں

اجل سو بار آئی ذوق پر جب تک نہ وہ آئے
نہ پایا دم نکلنے میرا قابو اسکو کہتے ہیں

عنقا کیطرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہوں اس طرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

اُس در پہ شوق سجدہ سے فرش زمیں ہوں میں
مانند سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

ہوں طائر خیال نہ پر ہیں نہ میرے بال
پر اُڑ کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں

سرگشتگی بخت نہ دے مجکو اتنے پیچ۔
کچھ چین زلف کچھ شکن آستیں ہوں میں

یارب[1] کوئیں کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں
نام آسماں پہ میرا ہے زیر زمیں ہوں میں

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
چشم پر آب سے آئینے وضو کرتے ہیں

کرتے اظہار ہیں در پردہ عداوت اپنی
کیوں مرے آگے جو تعریف عدو کرتے ہیں

دل کا یہ حال ہے پھٹ جائے ہے سو جائے سے اور
اگر اک جائے سے ہم اسکو رفو کرتے ہیں

[1] کوئیں کا تارا - دیکھو صفحہ ۵۵

دیکھ تو لے پہنچے کس عالم میں کس عالم میں ہیں
نالہائے دل ہمارے نارسا کہنے کو ہیں

گاہ دامن گیر باد و گہ بیاباں گرد خاک
اب تو تیرے عاشقوں کے دست و پا کہنے کو ہیں

وہ جنازے پر مرے کس وقت آئے دیکھنا
جب کہ اذنِ عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

ہے جہاں مانند مجمر اور ہم مثلِ سپند
اب چلے جائیں گے آئے اک صدا کہنے کو ہیں

پوچھو قاتل سے کریگا قتل آخر کب تلک
اپنی تاریخ آج ہم پیش از قضا کہنے کو ہیں

میرے سودا کا اطبا کر نہیں سکتے علاج
یونہی خبطی۔ خبط و مالیخولیا کہنے کو ہیں

مٹ گئے جوہر وفا کے اٹھ گئے سب اہلِ دل
اب نہ فاست نام کو اور با وفا کہنے کو ہیں

ہے صفا دل وہی جس میں عیاں ہو شکلِ یار
یوں تو آئینوں کے دل بھی با صفا کہنے کو ہیں

کیا تماشا ہے کہ ان کے کان میں اٹھا ہے درد
ہم جو آئے دردِ دل اپنا ذرا کہنے کو ہیں

بے سبب سوفار اُن کے منہ نہیں کھولے ہیں **ذوق**
آئے پیکِ مرگ پیغامِ قضا کہنے کو ہیں

گر ترا نور نہیں چشم میں کیا ہے اس میں
کہنا فیہ نظرٌ عین خطا ہے اِس میں

دِل کو کیا دیکھیگا تو چیر کے کیا ہے اِسمیں
اب تو قطرہ بھی نہیں خوں کا رہا ہے اس میں

رسن اندازیِ چاہِ ذقنِ یار میں زلف
نہیں معلوم کہ دل کس کا گرا ہے اِس میں

عشق کی تلخیِ حسرت کے جو ہونے کے مزے
بے مزہ رہتے ہیں ہم کچھ تو مزا ہے اِس میں

تو نگیں توڑ نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اِس میں

کبھی کرتا ہوں فغاں اور کبھی ضبطِ فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اِسمیں ہے یا ہے اِس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں۔ گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آبِ بقا ہے اِس میں

دے چکے عشق میں جاں وامق و قیس و فرہاد
اور ابھی دیکھئے کس کس کی قضا ہے اِسمیں

اس جفاکیش کی نامہ کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اِس میں

شیشۂ سبز فلک سے نہ طلب کر مے عشق!
مے کہاں اس میں ہے زہراب بھرا ہے اِس میں

جا پڑا پاؤں پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
سرد ہونے پہ بھی گرمیِ وفا ہے اِس میں

عجب عالم ہے اُس دل کا کہ اُن کے اک اشارہ پر ۔۔۔ کھٹک جاتے ہمارے دل میں سو نشتر ہے اوپر ہیں
پسِ دیوارِ گلشن ہم پڑے ہیں ناتوانی سے ۔۔۔ ابھی طاقت کرے یاری تو اڑ کر فرشِ اوپر ہیں

---

تم وہ غضب کہ ہوتے بھی کم ایسے شخص ہیں ۔۔۔ اور ہم تمہیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں
صاحب دلوں نے کعبۂ دل پر کیا مقام ۔۔۔ کب کرتے قصدِ دیر و حرم ایسے شخص ہیں
دیوانے تیرے دشت میں رکھیں گے جب قدم ۔۔۔ مجنوں بھی لے گا آگے قدم ایسے شخص ہیں
دیں لیا ہے بلکہ دیجئے ایمان بھی انہیں ۔۔۔ زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

چاروں شعر مرحوم انشاء اللہ خاں لکھنوی کا کلام ہیں۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ بتاں کا لفظ بے اضافت محاورہ میں عام تھا۔ میر و سودا کے دیکھنے والے موجود تھے۔ دلی کی زبان یہی تھی اسی محاورہ میں انہوں نے شعر کہا۔ بگی کی سواری اور فرنگی زاد کا مضمون اس وقت نیا معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فرنگی دلی میں نظر آتا تو ایک عجیب صنعت الٰہی سمجھ کر ہم باہم دکھایا کرتے تھے۔ کہ دیکھو وہ فرنگی جاتا ہے۔ زمانہ کا مزاج اور اس کی طبیعت کا ایک عالم ہے کہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ جو لفظ آج سماعت کو ناگوار ہے۔ اسوقت خوشگوار تھا۔ ورنہ آسان ہے۔ کہہ دیتے۔ مصرع

ہیں صنم محوِ خودنمائی میں

ہیں بتاں محوِ خودنمائی میں ۔۔۔ غیر ہے پر خودی خدائی میں
ہو کے اک بوسہ پہ ترش ابرو ۔۔۔ بات کو ڈالنا کھٹائی میں؟
نہیں بگی میں وہ فرنگی زاد ۔۔۔ ماہ ہے منزلِ ہوائی میں

ذوق ہے ایک رندِ شاہد باز
اس کو کیا دخل پارسائی میں

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں ۔۔۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں ۔۔۔ کیا جانئے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں

توڑیں اک نالے سے اس کاسۂ گردوں کو مگر
نوش ہم اس میں کبھی دل کا لہو کرتے ہیں

قدرِ دل جو کو تمہارے نہیں دیکھا شاید
سرکشی اتنی جو سرو لبِ جو کرتے ہیں

ایک دن حافظ ویران اور میں استاد کے ہاں بیٹھے تھے اور بعض شعرائے عصر کے ہندی مضمونوں کے باب میں گفتگو کر رہے تھے۔ ع

ہے کاٹنے کو دوڑتا کتا تفنگ کا

اور ع

میڈھا حلال کرتے ہیں دریائے تیل کا

استاد نے فرمایا ایسے مضامین کو استعارہ و تشبیہ میں اتنا زیادہ زور دینے سے کلام بدمزہ ہو جاتا ہے۔ بعد اسکے غزل مرقومۃ الذیل کے اشعار سنائے۔

رکھتا ز بسکہ جیفۂ دنیا سے ننگ ہوں
پارس بھی ہو تو جانتا مردار سنگ ہوں

ہوں وہ شگفتہ دل کہ نہ دوزخ سے تنگ دل
آہن تو آگ میں ہوں مگر لالہ رنگ ہوں

ہیں سب سے پہلے میرے اٹھانے کی فکر میں
محفل میں اُن کی میں کسی جو سرکا رنگ ہوں

دل بیٹھا محو ضبط ہے اور مجھ کو اضطراب
دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں دل سے تنگ ہوں

پروانہ گر نہیں تو نہیں پر ہوں شعلہ دوست
مکھی بھی ہوں تو خالِ دہانِ تفنگ ہوں

---

جنوں نے کچھ نہ چھوڑا آخر اپنے جیب و داماں میں
نفس اک تار ہے سینہ میں سمجھو یا گریباں میں

کہاں ڈھونڈے کوئی دل کو ہجوم داغ سوزاں میں
ملے کھوج ایک پروانہ کا کیا گنج چراغاں میں

نہ ہو لیگی کبھی ہمدم شکایت تشنہ کامی کی
ہے آب اسکے جو تیغ میں خنجر میں پیکاں میں

تمہارے تیر ہیں شاداب کرتے دل کے زخموں کو
ہمیشہ آب پیکاں سے ہے شبنم اس گلستاں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہو تا خضر تو [illegible] بھی
[illegible] حیواں [illegible] جیواں میں

---

مرے نالے کہیں ہیں گنبد نیلے سے اوپر ہیں
ہوا کیوں بند [illegible] بادل [illegible] اوپر ہیں

گذر جاتے ہمارے نالے آگے مر سے [illegible] ہیں
[illegible] سنتے نہیں دیتے اڑا اُڑ دیتے اوپر ہیں

کہتی ہے باہی بریاں کہ دبیرانِ قضا
داغ دیتے ہیں اُسے جس کو درم دیتے ہیں

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہوں میں

سمجھو نہ سہل تم خفقاں کو حکیم جی
حضرت اسے بھی جانئے ہمزادۂ جنوں

## واؤ

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قایم ہوا اس میں یہی طرح تھی۔ استاد نے یہ دو غزلہ پڑھا تھا۔ جوانی کا عالم تھا۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ قافیہ پیمائی سے دق ہو کر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے۔ جس شعر پر سب ان میں شاہ نصیر مرحوم کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ اور بعض اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے کہیں کہیں ان کی طرف بھی اشارے ہیں ہر ایک کی طرح طولانی ہے۔ اور فائدہ کچھ نہیں۔ قطع انداز کرتا ہوں۔ بر سر معرکہ واقفانِ حال موجود تھے انہوں نے مزے لئے۔

دانۂ خرمن ہے ہیں قطرہ ہے دریا ہم کو
آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو
کہ فلک آیا نظر غال سے چھوٹا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو
اور جوں خیمۂ لیلےٰ ہے سویدا ہم کو

اُس نے خط جو قلم سرمہ سے لکھا ہم کو
لکھا ایمائے خموشی ہے یہ گویا ہم کو

رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو
ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو

شوقِ ہستی ہے سبب گلگشتِ چمن کا ہم کو
چاہئے جائے عصا گردنِ مینا ہم کو

ہو دیگا کشتیٔ طوفان زدہ تابوت اتنا
آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو

بستگی دل کو ہے کیوں اس گرہ زلف کے ساتھ
کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معما ہم کو

ہیں وہ دیوانے کہ حق کو بیڑیاں درکار ہیں
ہم اسیرِ زلف ہیں۔ کافی ہیں دو تار ہیں !

---

کمندیں اور بھی یوں تو کمند انداز رکھتے ہیں
تری زلفوں کے خم کچھ اور ہی انداز رکھتے ہیں

---

کیا صوفی کیا شیخ۔ قائل مرے دونوں ہیں
پر مذہب و مشرب سے۔ غافل مرے دونوں ہیں

---

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آتے ہیں
بے وفا پوچھے ہے۔ کیا دیر ہے لیجانے میں

---

جس جگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

---

کہتے تھے آپ کو خاطر سے ہماری پرسوں
ہوئے برسوں۔ نہ ہوئی پر وہ تمہاری پرسوں

---

یہ طوق اس واسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی گردن کا۔ پڑا قمری کی گردن میں

---

رخصت جو ہو کے ہم سے۔ جاتے وہ اپنے گھر ہیں
گھبرا کے پہنچے واں۔ ہم ان سے پیشتر ہیں

---

زاہد گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں
وہ کہے اللہ ہو۔ اور میں کہوں اللہ ہوں

شعرِ قوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدا کے مرثیہ میں لکھا تھا
کئی بند اس کے بندۂ آزاد کو یاد ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہونگے۔

کرتے اپنے سر کو جو نوک سناں پر تاج ہیں
عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں

---

کیا کر اپنا سر نوک سناں پر تاج کرتے ہیں
حصول اس طرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں

دل میں تھے قطرۂ خوں چند سو مانند انار
نہ بہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو

مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے اُن کا خیال
کیوں نہ فانوس خیالی ہو بگولا ہم کو

ہم وہ ہیں وحشی لاغر کہ چھپا لیتی ہے
زیر دامن نگہِ آہوئے صحرا ہم کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوق اُسکی تو زلفوں کو نہ چھیڑ
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھ کو تعلق یا ہم کو

---

آسماں اور وہ انسان بناتا ہم کو
خاک میں تھا مگر اس وحدت سے ملاتا ہم کو

ذبح کیوں کرتے ہی فتراک سے باندھا ہم کو
چھوڑ رہنے دے تڑپ کر ابھی ٹھنڈا ہم کو

دل شکستہ مگر اُس یار نے سمجھا ہم کو
خط بھی جو خطِ شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

باعثِ رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو
تجھ پہ بن دیکھے ہے غش جس نے کہ دیکھا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سبک ایسا ہم کو
لے گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اُس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہے وہی جنبشِ لب بلکہ جراحت میں قتل
کس لبِ تیغ کے بوسہ کا ہے لپکا ہم کو

ہم وہ ہیں گرمِ رہِ راہِ فنا جوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ٹپکا مژگاں سے لہو ہو کے جگر آخر کار
ایک مدت سے اسی ٹپکے کا ڈر تھا ہم کو

خالِ سرمہ کا نہیں چاہئے زیبائش کو
اخترِ سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

یہ تو یوں مضطرب اور سینہ میں لاکھوں روزن
دل کا رہنا نظر آتا نہیں اچھا ہم کو

خطِ توام سے لکھو گو یہ تاریخ وفات
کر دی وصل کی تا مرگ تمنا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاک بسر کو پہ تیری
خواب شب بستر مخمل پہ نہ آیا ہم کو

جس کی آواز سے ہوں رونگٹے سو بال کے کھڑے
وہ محبت نے دیا سلسلہ پا ہم کو

اک حلاوت ہے عداوت میں بھی اُس ظالم کے
کر دیا زہر بھی گر اُس نے تو میٹھا ہم کو

دیکھا آخر نہ کہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

ٹپکے ہے جائے عرق ہر بنِ مو سے پیکاں
یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ گردِ رمِ آہو کی طرح
بھاگے ہے دور ہی سے دیکھ کے صحرا ہم کو

کس سے تدبیرِ درستی ہو ہماری جوں زلف
کہ شکستوں سے بنایا ہے سراپا ہم کو

جا بجا نام تو جوں نقشِ قدم چھوڑ گیا
خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈھنے عنقا ہم کو

اور ہمدرد کہاں۔ ہو نہ ہوا ے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو

پھینک کر شیشۂ دل ہاتھ سے کہتا ہے وہ مست
کہ بنانا تھا ہتھیلی کا پھپھولا ہم کو

اثرِ کفر ہے طاعت سے بھی اپنی پیدا
نقش سجدہ کا ہے پیشانی پہ ٹیکا ہم کو

نخلِ خرما کی طرح باغِ محبت میں ملا
کثرتِ زخم سے اک خلعتِ زیبا ہم کو

ایک دم تنگ وہ آئے تھے بغل میں اس پر
غمِ دوری نے کیا تنگ ہے کیا کیا ہم کو

دم میں دم اب نہ رہا ہے جو ٹھہریں کوئی دم
ہاں مگر ہو ترے آنے کا بھروسا ہم کو

آن پہنچی سرِ گردابِ فنا کشتیِ عمر
ہر نفس بادِ مخالف کا ہے جھوکا ہم کو

ہو سکے لاغری و ضعف کہاں مانعِ شوق
تیری جانب پرِ پرواز ہیں اعضا ہم کو

ہو گئے جس کی طرح جوں گُلِ بازی اُس نے
پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو

رشک تھا اپنے نوشتہ پہ کہ اس نو خط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو

ہر قدم پاؤں میں سر رکھتے ہیں خارِ سرِ دشت
اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو

کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت
پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہے گا ہم کو

اپنا ہے کعبۂ مقصود فقط گوہرِ دل
طوفِ گرداب صفت چاہئے اپنا ہم کو

لگ گئی آنکھ جو سودے میں تری زلفوں کی
شبِ سیاہی نے کئی بار دبایا ہم کو

حرفِ تلخ اس لبِ شیریں سے ہر اک بات پہ آہ
ناصحا سنتے ہیں ہم کچھ تو ہے میٹھا ہم کو

خاک سے کیونکہ ہماری گلِ رعنا نہ اُگے
کہ کسی گُل کی دو رنگی نے ہے مارا ہم کو

ایک دم عمرِ طبیعی ہے یہاں مثلِ حباب
فکرِ امروز ہے نے ہے غمِ فردا ہم کو

جتنے عاشق ہیں ہم ایک کا ہے ایک عزیز
شمع سے چاہئے ہے خون کا دعوے ہم کو

کیا ستم ہے کہ پئے قطعِ رہِ عشق فلک
آرہ ساں دیتا ہے دنداں عوضِ پا ہم کو

اے زاہد دو رنگ نہ پھیر آپ کو بنا
مانند صبح کاذب ابھی ہے ادھیڑ تو

اے صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر
دامان و آستیں نہ لہو میں لتھیڑ تو

جو سوتی بھیڑ اپنے شر و شور سے جگائے
دروازہ گھر کا اس سگِ دنیا سے بھیڑ تو

چھٹتا ہے کوئی مر کے گرفتار دامِ زلف
تربت پہ اس کی جال کا پائے گا پیڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزلِ فراق
غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت سے ہاتھ اٹھا
اے ذوق یہ اٹھانہ سکے گا کھکیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو
یاں کہاں راحت جراحت پر جراحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
تیں غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شورِ قیامت جس کو وہ اے چشمِ یار
تیرے مستوں کی صفیرِ خوابِ غفلت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

انتظارِ یار میں جو چشم ہو جائے سفید
مردمک اس میں کہاں ہو داغِ حسرت ہو تو ہو

دستِ ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہوئے پست قامت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گذری زندگانی عمر بھر
جانِ شیریں کے دینے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
لگے مکتوبوں میں کچھ اس سے کتابت ہو تو ہو

رات اک بگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رند سے
ذوق وہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

غزل مرقوم الذیل اور اس کے بعد کی غزل ابتدائی مشق کی تحریریں ہیں جب ان میں سے پہلی غزل لکھی اور دوستوں کو سنائی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی آواز گئی۔ سب خوش ہوئے۔ اور تعریفوں نے جوانی کا دل بڑھایا۔ فرماتے تھے کہ ابتدائے عمر طبیعت کی امنگ۔ دل باغ باغ تھا کہ آج ہم نے وہ غزل لکھی جواب تک

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

ہم وہ ہیں رند کہ اس عالمِ پیری میں بھی ہے
اُنس میخانہ سے جوں پنبۂ مینا ہم کو

سنگدل تین دن اب گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سوم میں جو ترے آنے کا دھڑکا ہم کو

تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشکِ مسیحا ہم کو

پھرتے ہی آنکھ کے پھیرینگے گلے پر خنجر
ہو چکا آپ کا معلوم ہے ایما ہم کو

گرمیٔ تپ سے ہوا سوزِ دروں جو افشا
آگیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

حسرت اے خواریٔ وحشت کہ گریباں کا تار
ہو گیا ضعف سے تارِ رگِ خارا ہم کو

کھا لے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ ہے زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو

نہ اٹھیں شورِ قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کہے جب تک کہ نہ تم قم لبِ مینا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں
سر پہ چھپتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

وصل کا اُس کے تصور جو بندھا رہتا ہے
تو مزے ہجر میں بھی آتے ہیں کیا کیا ہم کو

واہ قسامِ ازل صدقے ہم اُس قسمت کے
جامِ عشرت اُسے اور داغِ تمنا ہم کو

دل میں نشترِ نگہِ یار کا آ ہی کھڑکا
وہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

کشتہ ہی ہوتا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
کچھ کشندہ سے نہیں خون کا دعویٰ ہم کو

ق

رہی ہر طرح سے عیدی کے کبوتر کی طرح
ہاتھ سے اُس بتِ بیدرد کے ایذا ہم کو

صید ہی میں نہ وقفۂ ذبح کا کچھ قصد رہا
صبح بھی ٹھیری تو چھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوق بازیگہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں
دے گا تمام عقل کے بخیے ادھیڑ تو

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہووے گا
سو بار جڑ سے پھینک دے اُس کو اکھیڑ تو

عمرِ رواں کا توسنِ چالاک اس لئے
تجھ کو دیا کہ جلد کرے یاں سے ایڑ تو

بھی دے دیا۔ یعنے پہلے کہا تھا۔ ع زلف بنے وہ دست موسےٰ۔
اب پڑھا۔ ع۔

پھر زلف بنے وہ دستِ موسےٰ جس میں اخگر آتش ہو

شاہ مرحوم خوش ہوگئے اور یہ ترمیم ایسی بدا نئہ ہوئی کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ نوجوان کی شوخی طبع تھی۔ عمداً پہلے پھر کا لفظ نہ سنایا تھا۔ یہاں آپ ہی چوٹ کھائی۔ آپ ہی اس کا توڑ کیا۔

## غزل اول

تمنا نہیں ہے کہ امداد دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدہ قلق ہو۔
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پاؤں پر جان حق ہو
جو مے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو۔ تو سرخی نہ کیوں اُسکے رخسار پر ہو
غروب آفتابِ درخشاں اگر ہو۔ تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو
کتاب محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو
کہ جب آن کر تم کو دیکھا تو وہ ہی۔ لئے دست افسوس کے دو ورق ہو
کرو زو نو آنکھوں کے تلتے یہ روشن کہ ہو جاؤ رشکِ مہ چاردہ تم
سنا ہے کہ تم نور سے اپنے کرتے۔ منور یہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
یہ کشتوں کا اُس مانگ کے اِک پتا ہے کہ اُن تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی
اگر سنگِ موسیٰ کا تعویذ رکھدے۔ تو رکھتے ہی بس درمیاں سے وہ شق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر مسیحائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرایا تو نے تو یہ تھا سمجھ کر۔ نکل جائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو
اگر رشکِ گلشن نہ ہو مجھ سے باہم۔ تو گلشن میں ہو دے یہ وحشت کا عالم
چٹکنا ہو غنچوں کا آواز ضیغم چمن مجھ کو اک وادیٔ لق و دق ہو
اگر زخم سینے سے پھاہا اٹھاؤں۔ تو خورشید محشر کو میں تپ چڑھاؤں۔

کسی نے نہ لکھی تھی۔ اللہ تیرا شکر کہ تو نے یہ نعمت دی۔ ساتھ ہی دوسری غزل اور بحر میں لکھی۔ زمانہ کے ناموروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آتی تھی۔ دوسری غزل پر ناخوشی کھوٹ بہی۔ اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی۔ یہ جائز نہیں۔

آغاز عمر، ابتدائے مشق، کوئی تقویت دینے والا ساتھ نہیں۔ گھبرا گئے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اُن دنوں زندہ تھے۔ اُن سے جا کر حال بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ معترض بے خبر ہیں۔ فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ اور خوش آئندہ بحر کا نکالنا حسنِ طبع ہے نہ کہ عیب۔ اُستاد نے کلیاتِ بیدل دیکھا تو بہت غزلیں نئی نئی بحروں میں نکلیں۔ انہیں دیکھ کر دل قوی ہوا۔

وہ زمانہ کچھ اور تھا۔ اس وقت کی باتیں نئی روشنی والوں کو عجب معلوم ہوتی ہیں۔ شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح بند تھی۔ مگر آمد و رفت اُسی آدابِ تعظیم کے ساتھ جاری تھی جو کہ اہل سعادت کی عادت ہے۔ اور وہ بھی شفقتِ بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ بموجب معمول کے ایک دن اُن کی خدمت میں گئے اور سب حالات سنا کر دونوں غزلیں سنائیں۔ اُنہوں نے بھی کہا کہ خوب غزلیں لکھیں بلکہ یہ بھی کہا کہ دوسری غزل بہت خوب ہے۔ اسے مشاعرہ میں پڑھنا۔

استاد مشاعرہ میں گئے تو تعمیل فرمائش کا خیال کر کے اُس غزل کو بھی لے گئے اور غزل طرح کے بعد شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ اجازت ہو۔ فرمائش کی تعمیل کروں۔ انہوں نے فرمایا۔ ہاں بھئی سناؤ۔ جگہ تو یہی ہے۔ اب کچھ تو ابتدائی مشق۔ کچھ بحر نئی۔ غرض اتفاق یہ کہ غزل دوم کے مطلع میں مصرع دوم پر پھر کا لفظ نہ تھا۔ جب استاد نے مطلع پڑھا تو شاہ صاحب نے اس کی تعریف معمول سے کچھ زیادہ کی اور کہا کہ بھئی! اس مطلع کو پھر پڑھنا۔ استاد مرحوم رُکے کہ یہ بات کیا ہے؟ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا۔ اور لفظ

گر کلکِ آہ کو گردش دوں تو دودۂ شمع دل سے مرے
طاؤس فلک کا سینہ ابھی۔ جوں سینۂ باز منقش ہو

جب ضعف سے مجھ کو غش آیا تو طنز سے وہ کیا کہتا ہے
بس غش نہ کرو ہم جان گئے تم مرنے پر از حد غش ہو

کیا خون کے دریا جذب کئے ہیں خاکِ کوچۂ قاتل نے
مدفن کو بھی اُس کے ستم کش کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

بس چھوڑو دامن قاتل کا لو ہاتھ بہائے خون سے اٹھا
جب اپنا بہا خوں پاؤں پہ اُس کے دل کیوں اُسکا مشوش ہو

کیا رجز کو کر مقطوع و مرفل تم نے یہ غزل لکھی ہے
ذوقؔ اس کی بحر کو سن کر شاداں روح خلیل و اخفش ہو

دن کنا جائیے اب رات کدھر کاٹنے کو
جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو

ہائے صیاد! تو آیا مرے پر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو

اپنے عاشق کو نہ کھلواؤ کنی ہیرے کی
اس کے آنسو ہی کفایت ہیں جگر کاٹنے کو

دانت انجم سے نکالے ہوئے تجھ بن مجھ پر
منہ فلک کھولے ہے اے رشک قمر کاٹنے کو

وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں
باغباں نے ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو

سر و گردن جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر
چاہے دل یار کا جو رنگ اگر کاٹنے کو

شام ہی سے دل بیتاب کا ہے ذوقؔ حال
ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

چرخ ضدی ہے کوئی ضد نہ دلادے اسکو
کہ نہ خود کو غرض تو جلادے اُس کو

دیکھیں تم کیسے بھلکڑ ہو جسے کرتے ہو یاد
بھول تو جاؤ بھلا میرے بھلاوے اُس کو

قالبِ خاکیِ انساں کو بنا کر کچا
عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکا وے اُس کو

آبرو خاک میں دی اس نے ملا آئینہ کی
مجھ سا ہو آئینہ تو منہ دکھاوے اُس کو

اگر پنہ یہ داغ دل کو دکھاؤں ۔ تو صبح قیامت کا منہ دم بہ نفق ہو

یہ بحر و قوافی غزل کی بدلکر ۔ رقم اک غزل کر کرائے ذوق حسیں
نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق ۔ جو فی الجملہ کچھ ہے تو مضمون نازک ہو

## غزل دوم

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے ۔ گر اس پہ نہ زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دست موسے جس میں اخگر آتش ہو
اے قاتل تیغ برہنہ دست ۔ رگ شعلہ دل گر سرکش ہو
تو روشن حلقہ جیب کا میری مشعل تنور آتش ہو
ہو تیرا اسیر روز صبح ہجراں ۔ رخصت مجھ سے وہ مہ وش ہو
کیوں کھینچوں آہ کہ خود بھی نہاں زیر دود آتش ہو
لبریز شراب ناز دکھا تو ۔ ساغر چشم کافر کو
تا زاہد پاک ملوث ہو ۔ یا صوفی دم کش مے کش ہو
تم وہ وہ زخم دل پہ میرے کرتے ہو دکھلانے کو
پر ترکش تیغ ناز سے اپنے دل میں کرتے غش غش ہو
دل نخل میں قد کے جوں ذکریا چھپ کر چشم کافر سے
اب اترہ جنبش ابرو سے کیونکر نہ بزیر کشاکش ہو
لبیک و اذاں ۔ ناقوس و جرس ۔ یا قلقل مے یا نالۂ نے
دل کھینچنے کو اے ہمنفسو! کوئی تو نوائے دلکش ہو
بن تیرے گھر کی آرائش ۔ جب دشمن جاں ہو عاشق کی
محراب طاق کماں بن جائے ۔ دستہ نرگس ترکش ہو
مانند نمک داں چرخ پہ انجم حق نے بنائے اپنے لئے
تا ہر لب زخم حسرت میرا ہجر کی رات نمک چش ہو

سرد مہری سے تری گر خونِ دل یخ بستہ ہو
پھر نہ ٹپکے۔ کوزۂ دل گرچہ سب اشکستہ ہو

کیونکہ قابو میں فلک کے عاشق وارستہ ہو
یہ تو جب ہو گر کماں کے بس میں تیرِ جستہ ہو

ہر قدم پر ہے خراشِ پائے مجنوں گُل فشاں
تا کہ اک اک خار صحرائے جنوں گلدستہ ہو

کیا ہوا داغِ محبت سے ہوا دل سر بمہر
یہ نہیں ممکن کہ میرا رازِ دل سر بستہ ہو

کیا لگائے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس
جتنی یہ کاوش کرے اتنی ہی یہ پیوستہ ہو

مُنہ سے جو نکلے مزا جب ہے کہ ہووے دلنشیں
آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعہ برجستہ ہو

جانے کیا بیدردِ اندازِ کلامِ دردمند
ذوقؔ میرا ہم سخن گر ہو کوئی دل خستہ ہو

ایک دن عرفی کے قصیدۂ نعتیہ کے اشعار پڑھ کر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا۔

اقبالِ کرم میگزد اربابِ ہمم را
ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے استادوں کے قصیدے اس زمین میں ہیں۔ اُس مرحوم نے بھی معرکہ میں لکھا تھا۔ اور عقیدت سے لکھا تھا۔ ہم اپنی زبان میں عرض حال کرینگے۔ چنانچہ اُسی دن شروع کیا۔ اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہ ہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واؤ کے ۱۲ شعر ہیں۔ بابِ قصائد میں لے جانا کیا ضرور ہے یہیں لکھدیتا ہوں

بِتھرا دیا جلوہ نے ترے چشمِ صنم کو
چکرا دیا غمزہ نے ترے طوفِ حرم کو

جب سے کہ لکھا ہے ترا وصفِ رخِ زیبا
چومے ہے قلم لوح کو اور لوح قلم کو

رونق ہے بہارِ گُلِ رخسار سے تیری
گلزارِ حدوث و چمنستانِ قدم کو

جلائے نہ کجی طبعِ جفا پیشہ سے ہرگز
کس طرح نکالے کوئی شمشیرِ کے خم کو

کیا ڈھونڈتا ہے تو عملِ بغض و محبت
جلتا ہوا تعویذ سمجھ نقشِ درم کو

ہیں اشکِ کباب اشک ترے سوختہ جاں کے
پر کرتے ہیں خوں شبنمِ گلزارِ ارم کو

دیوانہ ترا قید سے ہستی کے جو چھوٹا
چڑھ جائے گا اک زلزلہ صحرائے عدم کو

جس دن سے زمیں پر ہے فلک خاک سے اڑتی
دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو

منہ ہے کیا شمع کا ہو بزم میں تجھ سے دلکش
چٹکیوں میں ابھی گلگیر اڑا دے اُس کو

آئے تصویر ہی اسکی وہ نہ آئے تو نہ آئے
پر مرے پاس کوئی کھینچ ہی لا دے اُس کو

پیار کی بات یہ مجھ سے نہیں اک اور سے ہے
تیری یہ خو ہے کہ مجھ کو سنا دے اُس کو

وہ عیادت کو مری آئے تو کیونکر آئے
مر بھی جاؤں تو ذرا رحم نہ آوے اُس کو

مشت خاک اپنی ہم اُس کوچہ میں کل پھینک آئے
اب وہ **ذوق** آپ اٹھائے نہ اٹھائے اُس کو

سگِ دنیا بس از مردن بھی دامنگیر دنیا ہو
کہ اُس کتے کی ہڈی سے بھی کتا گھانس پیدا ہو

ہجوم آور جو آنکھوں میں ترا شوقِ تماشا ہو
تو شاخِ ہر مژہ سے چشم نرگس وار پیدا ہو

ترے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک سن کے ہنستے ہنستے شادی مرگ عیسیٰ ہو

نہ ہووے دسترس دامانِ وصلِ یار تک ہرگز
اگرچہ سر سے عاشق پاؤں تک دستِ تمنا ہو

مجھے کیا چاہیے عقدہ کشا سوزِ محبت میں
گرہ میری سپند آسا مری فریاد سے وا ہو

درازی میں شبِ غم کی اگر بہلائے دل مجنوں
خیال زلفِ لیلیٰ اس کے حق میں الف لیلہ ہو

کرے پرواز مرغِ جاں اگرچہ شاخِ طوبیٰ تک
پر اس تارِ نظر سے مثلِ مرغِ رشتہ برپا ہو

حلاوت یاں کہاں جب ہوکے آبِ شور کا دریا
زلالِ خضر کا اک چشمہ سو بھی سب سے اخفا ہو

تصور یوں کبھی غفلت میں آجاتا ہے مرنے کا
کہ جیسے عالمِ رویا میں چشمِ کور بینا ہو

مجھے جلوہ میں مارا ہے نگاہِ ناز و مژگاں کے
بتاؤں کس کو قاتل کس سے میرے خوں کا دعویٰ ہو

یہ شہرت نام کی بھی وہ بلا ہے پیچ ہستی کا
کہ صحرائے عدم میں گردنِ عنقا کا پھندا ہو

مرے صحرا میں وہ وحشت برستی ہے کہ مجنوں کے
گرے گر سر پہ قطرہ آبلہ زیرِ کفِ پا ہو

کہیں کیا دل کی وسعت اپنی ہم اللہ رے وسعت
اگر نُہ آسماں ہوں جمع اک خالِ سویدا ہو

اکیلا رہ گیا یاروں کے یوں ہوں ناتوانی میں
کہیں شاخِ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتا ہو

جو ذکر اللہ کو ہو **ذوق** مانع مایۂ عشرت
تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشہ میں صہبا ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو میخانہ کو چلتے ہیں
مبارک اس کو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو

نشہ ٹوٹے ترے ساغر کش وحشت کا کیا ممکن
اگر سو ٹکڑے سنگِ کودکاں سے کاسۂ سر ہو

بجائے حق تعالیٰ ان یزیدی شمر مشرب سے
کہ خوں سید کا جس بیرحم کو خونِ کبوتر ہو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ میں وابستۂ زنجیرِ جوہر ہو

مجھے صحنِ چمن بھی عرصہ گاہِ حشر ہو تجھ بن
گلِ خورشید میرے واسطے خورشیدِ محشر ہو

جو کھوئے آپ کو وہ منزلِ مقصود کو پہنچے
تری گم گشتگی اس راہ میں اے **ذوق** رہبر ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اس کو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمرِ رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

سمجھ تو کور سوادوں کو ہو جو علم نہ ہو
اگر سمجھ بھی نہ ہو کورِ بے عصا سمجھو

نہ سمجھو دشت۔ شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

پڑے کتاب کے قصوں میں کیا کرو دل صاف
صفا ہو دل تو بہ از روضۃ الصفا سمجھو

زہے نصیب کہ ہنگام مشقِ تیرِ ستم
ہمارے ڈھیر کو تم تودۂ خاک کا سمجھو

بنے وہ رونے پہ میرے تو پھر صفِ مژگاں
نہ سمجھو چشم یہ دیوارِ قہقہہ سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

تمہاری راہ میں ملتے ہیں خاک میں لاکھوں
اس آرزو میں کہ تم اپنا خاکِ پا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغِ قاتل کو
لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا مرا خوں اس نے اپنے کوچے میں
اسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سن کے کیا سمجھو

نہیں ہے نام سے کیا کام مثلِ آئینہ
جو روبرو ہو اُسے صورت آشنا سمجھو

نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیٔ رخسار
تم اپنے عشق کو اے **ذوق** کیمیا سمجھو

خوبی سے نہیں رونقِ بازار کہ یوسف
اس شکل و شمائل پہ بکا چند درم کو

کیا دے گا دم آ کر کسی بے دم کو مسیحا
اللہ سلامت رکھے اس تیغ کے دم کو

دے جام مجھے چشمِ عنایت سے جو ساقی
دکھلاؤں تماشا ابھی کیخسرو و جم کو

بد ہو کوئی یا نیک رقم کام ہے اس کا
احوالِ بد و نیک سے کیا کام قلم کو

---

منزلِ گم گشتگاں بالکل الگ دنیا سے ہو
آسماں بھی ہو اگر واں بیضۂ عنقا سے ہو

سایہ افگن جب تو اپنے قدِ رعنا سے ہو
گردباد اس خاک پر ہمسر قدِ طوبیٰ سے ہو

گر کرے معجز نمائی جلوۂ رخسار پر
وہ کفِ آئینہ سے ہو جو یدِ بیضا سے ہو

میں وہ مجنونِ بیاباں مرگ ہوں جس کے لئے
جو ہو چادر یا کفن وہ دامنِ صحرا سے ہو

سبحۂ صد دانہ بھی پڑ جائے گر میرے گلے
دانۂ انگور تار پنبۂ مینا سے ہو

دشت کو سیراب کر دے آبلہ پائی مری
ہر قدم پر چشمہ جاری چشمِ نقشِ پا سے ہو

ثابت اک ٹانکا نہ چھوڑے دل کا میرے اضطراب
چاک سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گر مری دیوے چکھا شوراب اشک
ذوق شور العطش پیدا لبِ دریا سے ہو

---

صفا میں رخ سے ترے آئینہ کیا خاک ہمسر ہو
نگاہ چشمِ سرمہ آلود سے بھی جو مکدر ہو

مری تاثیرِ وحشت وہ ہے مضطر جس سے پتھر ہو
نگیں پر نام لکھ دوں تو نکل کے گھر سے باہر ہو

ترا دیوانۂ دل سوختہ آتش قدم گر ہو
جلا دے زیرِ پا گر خارِ مژگاں سمندر ہو

قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستمگر ہو
ابھی قصہ نہ ہو آخر کہ آخر روزِ محشر ہو

جو تو دریا میں دھووے ناخنِ پا گلبدن اپنے
تو ہر اک فلس ماہی شکلِ برگِ گل معطر ہو

ڈبو دیں آشنا کو گر سبک دوش اپنی صحبت میں
تو آہن ساتھ کیوں لکڑی کے دریا میں شناور ہو

کھٹکتے ہی رہیں دل میں ترے مژگانِ برگشتہ
ہجومِ نیشِ کژدم سے اگر دل گنج نشتر ہو

کیا یہ سوختہ جاں تو نے مجھ کو سرد مہری سے
کہ آہ سرد میری شمع کافوری سے ہمسر ہو

نبان سے رشک کے نہ زباں تلی جاتیں
کہ ہائے تم نے قلیاں کو منہ لگاتے ہو

ق ہماری لاش پہ آواز قم باذن اللہ
تم آ کے حضرت عیسیٰ کی عبث سناتے ہو

اٹھنگے یار کی ٹھوکر سے بے چلو تشریف
نہیں تو پھر کوئی صلوات سنکے جاتے ہو

جلاتے ہیں سویدا سے دل کو ہم اپنے
نظر گذر کو تم اسپند کیا جلاتے ہو

ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئینہ میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر
دکھلا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

ق ہمیشہ صدقہ اس ابرو کے ہو کے حضرت دل
یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو

دیا طواف حرم میں ہے سامنے محراب
اور اس میں نعرۂ لبیک تم سناتے ہو

وہ آئے بام پہ ہیں ہمدمو نہ بیٹھو اب
اٹھاؤ میرا جنازہ اگر اٹھاتے ہو

یہ صید بستۂ فتراک کھل پڑے نہ کہیں
سمند ناز کو تیز اتنا کیوں اڑاتے ہو

ق مرے لئے تو ہر اک طرح سے قباحت ہے
یہ تم جو دشمنوں کو دردسر بتاتے ہو

لگاؤں گھس کے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے
لگاوٹ اتنی بھلا کس لئے دکھاتے ہو

جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو
کہ دیکے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا کونسا انداز گفتگو ہے **ذوق**
کہ جس پہ زور طبیعت تم آزماتے ہو

جو کہوے قد یار کی تصویر دکھا دو
تم لکھو الف اور وہی تحریر دکھادو

دیکھو! سر مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھادو

حالت طپش دل کی مرے پوچھیں اگر وہ
تم ان کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھادو

گر دیکھ لے زاہد تو پھر ایمان ہی لائے
تم مصحف رخ اسکو بہ تدبیر دکھادو

گر چاہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں
جھمکوں کو تہ زلف گرہ گیر دکھادو

اس چشم کو ہے ناز بڑا تیر نگہ پہ
اے حضرت دل! آہ کی تاثیر دکھادو

وہ برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم
اس نالۂ جانسوز کا اک تیر دکھادو

ز ایسا نہ جو مقتل میں کہیں چھوڑ دے بسمل

یہ چار غزلیں مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہیں۔ اور انہیں غزلوں میں سے ہیں جنہیں استاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض شہزادوں کی فرمائش سے اُن کے شغل موسیقی کے لئے لکھدی تھیں۔ باوجود اس کے اہل نظر ان کے مضامین کو۔ اور قوافی کے پہلو کو دیکھینگے کہ کس رتبہ پر ہیں:

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو — اِک نظر دل سے ادھر دیکھو لو گر دیکھتے ہو
ہے دمِ بازپسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو — آئینہ منہ پہ مرے رکھ کے کدھر دیکھتے ہو
ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال — ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو
پر پروانہ پڑے ہیں شجرِ شمع کے گرد — برگ ریزیٔ محبت کا ثمر دیکھتے ہو
بیدِ مجنوں کو ہو جب دیکھتے اے اہلِ نظر — کسی مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو
شوقِ دیدار مری نعش پہ آکر بولا — کس کی ہو دیکھتے راہ اور کدھر دیکھتے ہو

لذتِ ناوکِ غم ذوق سے ہو پوچھتے کیا
لب پڑے جاتے ہیں زخمِ جگر دیکھتے ہو

عبث تم اپنی رکاوٹ سے منہ بناتے ہو — وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو
لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو — یہ ہم کو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو
چھپا کے پان یہ کس کے لئے بناتے ہو — ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اٹھاتے ہو
تم اپنے رُخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو — کہ میرا اخترِ بختِ سیہ دکھاتے ہو
اگر دباؤ کسی کا تمہارے دل پہ نہیں — تو ہم کو دیکھ کے تم کان کیوں دباتے ہو
ملاپ جانیں جبھی ہم کہ دے کے تم بوسہ — کہو کہ آؤ زباں سے زباں ملاتے ہو
مریضِ عشق کو تم پوچھ کر طبیبوں سے — مدام شربتِ عناب کیا پلاتے ہو
ہوں خاک چاٹ کے کتنا ابھی شفا ہو جائے — جو شربتِ لبِ میگوں ذرا چٹاتے ہو
بگڑ کے تبلے جو پھوڑتے ہو حضرتِ عشق — ہماری جھینکیوں میں ہم کو تم اڑاتے ہو
گلو! یہ کہہ گئی کیا کان میں تمہارے صبا — کہ بولے جاتے ہو بھولے نہیں سماتے ہو

پڑھو سو آج اسی پہ بھی فاتحہ چلو دافع سیئات ہو

ترا حسن وہ بتِ مہ جبیں کہ ہے ساقی لب پہ زباں نہیں
جو دکھائے رخ تو ہو دن وہیں جو چھپائے منہ تو ابھی رات ہو

جو ہیں مرتے حسنِ صفات میں وہ رہیں گے اپنی ہی بات میں
تو فنا ہو ذوق اسی ذات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

| | |
|---|---|
| کوسوں کیا تنگی زمانے کو | کہ نہیں جائے سر اٹھانے کو |
| قصد کعبہ کا تھا پھرے الٹے | چوم کر اس کے آستانے کو |
| تو ملندر نہ ہو تو عشق میں ہم | ایک آندھی ہیں خاک اڑانے کو |

---

| | |
|---|---|
| یہاں تک لاغری ہے اس ترے بیمار کے تن کو | عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشمِ سوزن کو |
| زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امارہ | یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کو |
| کمندِ نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی | لپٹ کر شکلِ طوقِ فاختہ عنقا کی گردن کو |

---

| | |
|---|---|
| تصور کس طرح بھولے ترا اس چشمِ گریاں کو | نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو |
| نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیرِ جاناں کو | نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو |
| رکھا پنہاں بہانہ سے ترے اس ماہِ تاباں کو | بڑے ہی وقت کام آیا مرے رحمت ہے باراں کو |

---

| | |
|---|---|
| دیکھا دمِ نزع دل آرام کو | عید ہوئی ذوق ولے شام کو |

---

| | |
|---|---|
| تم سی مل کر نہ غرفہ سے نکالا منہ کرو | اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو |

---

| | |
|---|---|
| اشکباری مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو | کتنے پانی میں ہیں یہ تو ارے جھنا دیکھیں تو |

گر وہ نہیں آسکتے یہاں تک تو بلا دے
لا کر کوئی ان کی مجھے تصویر دکھا دو

دیتے ہیں خبر غیب کی گر شیخ جی صاحب
کہہ دو کہ ہمیں تم خطِ تقدیر دکھا دو

اک جان ہے اک دل ہے سو ہیں پیشِ خنجر
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
ذوق آج انہیں تم یار کی تحریر دکھا دو

مجھے ابتدا سے سن رسیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہیں تمہارے استاد کی ایک غزل یاد ہے۔ اُن کے لڑکپن کی ہے۔ وہ بیچارہ بے علم تھا۔ اور طول عمر نے بدحواس کر دیا تھا۔ غلط سلط جو کہتا گیا میں نے لکھ لیا۔ اُستاد کو لا کر سنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے۔ کہاں سے ہاتھ آگئی۔ سرسری طور پر درست کر کے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کبھی فرصت میں بتائینگے۔ (بندہ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھے ہیں۔ اور مضمون بھی صاف بچپن کے معلوم ہوتے ہیں ؛

دمِ ذبح تیغِ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو
تو شہیدِ ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعدِ ممات ہو

جو مذاق شعر کو اے پری میں چکھاؤں تیری شکرلبی
قلم انگلیوں میں جو ہے مری ابھی رشکِ شاخِ نبات ہو

جو ہیں کرتے میرے لئے دعا کہ ہو دامِ عشق سے دل رہا۔
تو ہے دل یہ کہتا کہ اے خدا نہیں اس جنوں سے نجات ہو

مجھے کہتے سب ہیں کہ صبر کر جو نہیں تو صبر سے درگذر
سرِ حسن و عشق پری میں پر۔ نہ وہ بات ہو نہ یہ بات ہو

سرِ راہ کشتۂ ناز کا وہ مزار ہے نظر آ رہا

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سُن کر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا مگر لڑکپن ہی تھا۔ بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وہ اور ہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا:۔

جتنا چھٹے نمک سب مرے زخموں میں کھپاؤ ۔۔۔ پلکوں سے اٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اللہ مغفرت کرے کیا باانصاف طبیعت۔ اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھ لو۔ ویسا ہی حسنِ قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دیدیا ہے۔

انہی میں بقا کا بھی مطلع پڑھا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ دیکھو اس کا بھی جواب نہیں ہوا:۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں ۔۔۔ اُس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ایک دن نئے اور پرانے الفاظ کے استعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم ٹک اکثر بزرگوں سے سنتے تھے۔ خود بھی کہہ دیتے تھے۔

ٹک دیکھیو اُس لذتِ پیکاں کے اثر کو ۔۔۔ جنبش مرے اب تک ہے لبِ زخمِ جگر کو

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے نقطوں کو بچایا ہے کہ ایک کو جنبش نہیں ہو سکتی ؛

مطلع مرقوم الذیل لڑکپن کا کہا ہوا ہے۔

دریا میں ترے حسن کے بالے ہیں بھنور دو ۔۔۔ اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں مگر دو

## ہائے ہوّز

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ ۔۔۔ تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

دیں کیونکہ نہ وہ داغِ الم اور زیادہ ۔۔۔ قیمت میں بڑھے دل کی درم اور زیادہ

ساتھ اپنے ہے اب فوجِ الم اور زیادہ ۔۔۔ کر تو بھی بلند آہ علم اور زیادہ

تیز اُس نے جو کی تیغِ ستم اور زیادہ ۔۔۔ مشتاقِ شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

لہ ایک مسئلہ لوگوں میں عام زبان زد ہے کہ نمک کو پھینکنا۔ یا بے پروائی سے گرانا منع ہے۔ استاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ۔ گراؤ گے تو آنکھوں سے اٹھانا پڑے گا ؛

یا تو پاسِ دوستی تجھ کو بتِ بیباک ہو
یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

غیر نے ایسا پڑھایا کچھ مرے محبوب کو
لاکھ ہجوں سے پڑھا اُس نے مرے مکتوب کو

پوشاک آبی آپ کو گر دل پسند ہو
دریا پری حباب کے شیشہ میں بند ہو

خبر کر جنبشِ نوفل کی۔ تو مجنوں اہلِ ہاموں کو
کیا وہ تا صبا کچھوا سے شاخ بید مجنوں کو

جاتے ہیں اب تو کوئے بتِ لالہ فام کو
اپنا تو بس سلام ہے دار السلام کو

فرماتے تھے کہ یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسی طرح کیا کرتے ہیں۔

حق نے تجکو اِک زباں دی اور دئیے ہیں کان دو
اس کے یہ معنی کہے اِک اور سُنے انسان دو

سے کہے ایک جب سن لے انسان دو
کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو
یہ ہنستے ہنستے نکلے گل کے آنسو

ایک دن کئی استادوں کے مطلع سنائے اور فرمایا ان کے جواب نہیں۔ لاثانی ہے انہی میں جرأت کا مطلع پڑھا۔

رتبہ گلبازی کا دل[1] کاش تو پاتا
ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اٹھاتا

[1] ہندوستان کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دوبار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لے کر چند قدم کے فاصلہ پر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ اُس پر پھینکتا ہے وہ اس پر۔ ۱۰-۱۵ دفعہ برابر ردوبدل رہتی تھی جس کے ہاتھ سے پھول گر پڑتا وہ ہار جاتا۔ ہارنے کی سزا یہ تھی کہ کہتے تھے اٹھاؤ آنکھوں سے جرأت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے کاش میرا دل یار کی گلبازی کے کام آتا۔ اگرچہ بہت سی چوٹیں کھانی پڑتیں اور گرتا لیکن یکے ہاتھوں اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا۔

گر سرمہ کرے خاکِ خرابات کو صوفی
سوجھیں اُسے پھر لوح و قلم اور زیادہ

اے ابروئے خمدار نہ برش میں کمی کر
ہاں تجھ کو مرے سر کی قسم اور زیادہ

کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رُکے ہے
اُتنا ہی اُسے چاہتے ہیں ہم اور زیادہ

جاتا ہے شہیدانِ محبت کا جنازہ
دو تم بھی اٹھا چند قدم اور زیادہ

یارب یہ مری نبض ہے یا موجِ رمِ برق
کیا ہوگا جو ہوگی تپِ غم اور زیادہ

کہتا ہے مرا شوقِ جراحت کہ صد افسوس
اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ

کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور
مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ

کہتا ہے گلے لگ کے مرے وہ دمِ خنجر
خوش کا بھر تو کوئی دم اور زیادہ

ق
اس عاشقِ بیچارہ کا ہے آج یہ کیا حال
گریہ سے ہے آنکھوں پہ ورم اور زیادہ

پیے بستر پہ پڑا پاؤں کہانتک
بس پاؤں نہ پھیلا شبِ غم اور زیادہ

ق
ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی
کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر اُنہیں کم اور زیادہ

اے ذوق وقتِ نالہ کے رکھ لے جگر پہ ہاتھ
ورنہ جگر کو روئے گا تو دھر کے سر پہ ہاتھ

میں ناتواں ہوں خاک کا پردانہ کی غبار
اُٹھتا ہوں رکھ کے دوشِ نسیمِ سحر پہ ہاتھ

خط دیکھ کے دل میں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے
رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ

کھاتا ہے اس مزہ سے غمِ عشق میرا دل
جیسے گرسنہ مارے ہے حلوائے تر پہ ہاتھ

جوں پنج شاخہ تو نہ جلا انگلیاں طبیب
رکھ رکھ کے نبضِ عاشقِ تفتہ جگر پہ ہاتھ

اے شمع دیکھ بزمِ فنا میں سنبھل کے بیٹھ
مارے گی دم میں صبح ترے تاجِ زر پہ ہاتھ

چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے شکیب
تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

قاتل ہے کیا ستم کہ اٹھاتا نہیں کوئی
آکر مزارِ کشتۂ تیغِ نظر پہ ہاتھ

سرکشت کے سر افراز نہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

گر شرح جنوں کیجیے رقم اور زیادہ
ہو چاک ابھی جیب قلم اور زیادہ

دیتا ہے وہ دم بازجو دم اور زیادہ
شیشے کی طرح پھولے ہیں ہم اور زیادہ

گھبراتا جو یاد آیا ترا ہو کے ہم آغوش
گھبرانے لگا سینے میں دم اور زیادہ

کچھ کی رقم شوق نے تاثیر جو پیدا
اُٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

لذت سے محبت کی ہے ہر زخم جگر کو
ذوق نمک درد و الم اور زیادہ

کرنے کو سیہ نہ ورق چرخ کو اے دل
نالے سے نہیں کوئی قلم اور زیادہ

کیا ہووے گا دو چار قدح سے مجھے ساقی
میں لوں گا ترے سر کی قسم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بار محبت
ہو پشت فلک میں ابھی خم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جوں تیغ
سیدھی ہے تو اک اس میں ہے دم اور زیادہ

ہو جس کو پس از مرگ بھی یاد دہن تنگ
تنگ اُس کو کرے کنج عدم اور زیادہ

اُس زلف کے مارے کی اگر خاک کو چھانے
پیدا دم افعی میں ہو سم اور زیادہ

اس شوخ ستمگر کو مری مرگ ہے منظور
ہے زہر نہ کھانا مجھے سم اور زیادہ

ہستی تنک مایہ جو پھونکے گی اسی طرح
ابھرے گا حباب لب یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چُرانے
یاروں کا گیا اُن پہ بھرم اور زیادہ

کرتی ہے مری خاک جلا کر مجھے پامال
کیونکر نہ اٹھا دے وہ قدم اور زیادہ

دکھلائے جو وہ صید فگن چشم کی شوخی
ہو آہوئے رم دیدہ کو رم اور زیادہ

آخر مے عشق آنکھوں سے ٹپکائی کسی نے
بھڑکے ہے جو یوں آتش غم اور زیادہ

ہے نکہت ریحاں کا دماغ اب کسے مجھ بن
آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب اُن سے
روکیں تو ابھر جائے شکم اور زیادہ

مہمیز سر خار سے نکلا سر صحرا
کچھ توسن وحشت کا قدم اور زیادہ

صید دل عاشق میں ہے مصروف وہ کافر
بے خوف ہے اب صید حرم اور زیادہ

جلد آکے مر نہ جائے کوئی خانماں خراب
ٹکرا کے اپنا سر در بیت الحزن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دام علایق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو علاقہ بدن کے ساتھ

---

جنوں کے جیب دری پر ہیں خوب چلتے ہاتھ
سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کرلے چلتے ہاتھ

ملا جو غیر نے عطر اس کو واں تو یاں میری
لکیریں مٹ گئیں ہاتھوں کی ملتے ملتے ہاتھ

نہ آیا گور پہ میری وہ بے وفا ورنہ
گلے لگانے کو تربت سے بھی نکلتے ہاتھ

جو چھیڑے برق کو یہ تفتہ جاں تو کہتی ہے
کہ دیکھو مجھ کو لگانا نہ جلتے جلتے ہاتھ

اٹھائے وجد میں جب ہاتھ ہم نے عالم سے
تو پہنچے عرش تلک کودتے اچھلتے ہاتھ

مریض سوز محبت کی دیکھتا گر نبض
تو پھر طبیب کے بھی آبلوں سے جلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پاؤں سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

---

رقعہ ہے چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ
یا الٰہی کہیں پڑ جاوے نہ درباں کے ہاتھ

---

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ
ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

---

اے نگاہِ مہر سے دل مت بچشم قہر دیکھ
گڑ دیئے ست جو مرے تو نے نہ اسکو زہر دیکھ

---

کر دعا میرے لئے شیخ مناجات میں یہ
کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

---

نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ
اور اس کی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

---

زیادہ ہوگا توکل سے بھی کہیں روزہ
کہ اس میں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اک ناز سے کھڑے تھے وہ رکھے کمر پہ ہاتھ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ
اک زخم تازہ روز ہے زخمِ کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئی نگہِ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس کس پھبن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو اک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا ترا قدِ رعنا جو باغ میں
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں بھر رہا تھا قلانچیں ہرن کے ساتھ

دستِ جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کہ تو
ٹکڑے اڑا دے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

پایا درِ اثر نہ کہیں شب کو آہ نے
سر ماری پھری ہے سپہرِ کہن کے ساتھ

بزمِ صنم میں حضرتِ دل ذکرِ کعبہ کیا
تھی جس چمن کی بات گئی اس چمن کے ساتھ

ان ناتوانیوں میں بھی یہانتک ہے شوقِ دل
گویا چمن میں اڑ کے نسیمِ چمن کے ساتھ

دوزخ میں بھی پڑیں تو نہ سیدھے ہوں کج سرشت
آتش میں پیچ و خم ہیں رسن کے رسن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاکِ فراقِ بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوتی محبت وطن کے ساتھ

لب پر ترے پسینہ کی بوند اے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سہیلِ یمن کے ساتھ

وحشت تو دیکھو بعد فنا بھی مرا غبار
باتیں کرے ہے سقفِ سپہرِ کہن کے ساتھ

دل وہ بلا ہے اژدرِ دوزخ کو کھینچ لے
مارے اگر کمند دمِ شعلہ زن کے ساتھ

چشم و دہانِ حرص سِیے کون غیرِ مرگ
بخیہ کا تارِ تن کے ہے تارِ کفن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہتِ گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

ہوں زلفِ عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا
لحد و کفن سیاہیٔ مشکِ ختن کے ساتھ

منظور تجھ کو کب ہے یہ اے میرے آفتاب
ہو کوئی تیرہ بخت ترا سایہ بن کے ساتھ

داغِ دلِ فسردہ پہ پھاہا نہ ہو نہ ہو
کام اس چراغِ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

اُٹھ چکا وہ ناتواں جب رہ گیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

توبہ توبہ کہتا استغفار ہے
وقت توبہ میری استغفار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو
برق میرے وادیٔ پُرخار سے

جا ہے بحرِ محبت میں تمیں
کشتی اُس کی تیغ لنگر دار سے

اب وہ آئے جب نگہ کو ضعف ہے
کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے

تیرے ہی پاؤں پہ اے قاتل گرا
سر مرا اُڑ کر تری تلوار سے

اُس دہن کا نکتۂ موزوں بھی اک
منتخب ہے مخزنِ اسرار سے

ابر ہے لیکن شفق آلود ہے
زلف اس کی سرخیٔ رخسار سے

خاک عاشق پر اُٹھے جا ہے غبار
فتنۂ محشر تری رفتار سے

۴ ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں
اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے

زلف کی پیچی سے دل ڈرتا نہیں
بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے

ق
دل کے آئینہ کو گر کر دے گداز
یار اپنی گرمیٔ رخسار سے

جوہر اُس سے یوں اٹھا لیں جس طرح
حرف قرطاس غلط بردار سے

بے تمیزوں کی ہے الفت نقص تام
لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہے خبر آتی نفس کے تار سے

دو برس ہوئے تھے کہ بہادر شاہ بادشاہ ہوئے تھے۔ اُدھر سے فرمائش زور پر اور ادھر سے طبیعت شور پر۔ کرشنا ئے دہلی میں سے ایک شخص نے مشاعرہ کیا۔ سخن فہم و سخن شناس تھے۔ اہل سخن سے ارتباط رکھتے تھے۔ بڑے اشتہار و اعلام سے شہرت دی۔ اُستاد کے پاس آئے۔ اور باصرار آنے کا اقرار لیا (میاں صابر بخش کی سرا کے پاس ان کا مکان تھا۔ وہیں مشاعرہ ہوا تھا) استاد مع رفقا کے تشریف لے گئے۔ ہم بچہ تھے ایسے جلسوں میں جانے کے قابل نہ تھے۔

# یائے تحتانی

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ۶ والے شعر کو دیکھو وارستگان جمع ہے۔ اور بے اضافت۔ بے صفت باندھ دیا ہے۔ جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ اور آخر میں ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
دل میں آئینہ کے جوہر خار سے

شرحِ فرطِ حسرتِ دیدار سے
جو نگہ ہے کم نہیں طومار سے

کھانے داغِ آتشیں رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل کو تیرِ یار سے
ہے مشابہ زخم بھی سوفار سے

میرے طرزِ نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجرِ یار سے
کم نہیں تارِ رگِ گل خار سے

آئینہ اُس شعلۂ رخسار سے
گرم ہے دکانِ آتش کار سے

بے نصیب اسکے ہیں گر دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

مارے گر سیلی وہ زلفِ پُرعرق
جھڑ پڑیں دنداں دہانِ مار سے

خنجرِ موجِ تبسم سے ترے
گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

وائے قسمت تلخ کامی ہو نصیب
ہم کو اس کے لعلِ شکر بار سے

کرتا ہے دستِ جنوں جب کشمکش
جی اُلجھتا ہے نفس کے تار سے

سُن کے میری جانکنی کو کوہکن
جوں صدا اُلٹا پھرے کہسار سے

یہ بھی اس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے

نقطۂ خال اُس کا سوداخیز ہے
پھرتے ہیں اک پاؤں ہم پرکار سے

اور والد مرحوم سے بھی پڑھا ہوا تھا۔ انہیں جب وہاں میرا حال معلوم ہوا تو مل کر بہت خوش ہوئے۔ اکثر آتے تھے اور وقتوں کے حال کہانیوں کی طرح سُناتے تھے میں کسی حال میں ہوں کام سے کام تھا۔ اس مشاعرہ کا بھی ذکر آیا۔ انہوں نے ماجرائے مذکور من و عن بیان کیا۔ اور کہا کہ بھئی تمہارے والد مرحوم کے سبب سے ہم بھی ہمراہیوں میں تھے۔ حضور کا طلب فرمانا۔ اور استاد کا جانا واقعی سبب تھا۔ اور اہل حسد نے اُس وقت کہا بھی تھا۔ مگر نہیں! بدگمانی تھی۔ ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم تو اِن کے ہمراز میں تھے۔ اس وقت مجھے پھر تحقیق ہوا۔ کہ لوگ ان کی سیدھی بات کو بھی الٹا سمجھتے تھے۔ اور سلٹا دکھاتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ وَارْحَمْ

غزل مذکور یہ ہے:-

ترے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دار الشفا سمجھے
اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیرِ قضا اس کو یہ تیرِ قضا سمجھے

غلط فہمی ہماری تھی جو اُن کو آشنا سمجھے
ہم ان کو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہم کو کیا سمجھے

شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے
بہا خوں کو تہِ قاتل ہیں اسی کو خوں بہا سمجھے

وہی کچھ تلخ کام اس زندگانی کا مزا سمجھے
کہ جو زہراب تیغ یار کو آبِ بقا سمجھے

ہر اُس گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے
فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے

ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے
اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بُت سے خدا سمجھے

بُرائی میں ہماری گر وہ اپنا کچھ بھلا سمجھے
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

تجھے اے سنگدل آرام جانِ مبتلا سمجھے
پڑے پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

وہ ہم سے خاکساروں کو گر اپنا خاک پا سمجھے
ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے

جو کچھ دل پر گزرتی ہے سنائیں گے ہم اس بت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم وہ اپنے دل میں کیا سمجھے

ترے کشتے جو یوں خواب عدم سے یک بیک چونکے
مگر شور قیامت کو تری آواز پا سمجھے

نسیم صبح گلشن میں اگر ہووے دم عیسے
ترا بیمار غم تجھ بن سموم جاں گزا سمجھے

غالب آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے۔ اُستاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کو کچھ سنائیے۔ استاد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے بادشاہ تھے۔ اور رکم سخنی اس بڑھی ہوئی۔ اُن سے کم میں بھی بڑے تھے۔ اتنا کہا۔ خوب! بہت خوب!!

غرض مشاعرہ شروع ہوا اور شمع گردش میں آئی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ حکیم آغا جان عیش طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ مگر خوش کلام اور شیریں سخن۔ شوخ طبع شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزل میں قطعہ پڑھا (روئے سخن غالب مرحوم کی طرف تھا)

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

زبان میر سمجھے۔ اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ابھی استاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص[1] پہنچا۔ کہا حضور نے دعا فرمائی ہے۔ یہ غزل دی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ اسے ہمارے پاس آکر بنا دو۔ کچھ ہم زبانی بھی کہینگے۔ استاد نے میر مشاعرہ کو پاس بلایا اور حال سنایا۔ اُنہوں نے کہا۔ آپ کی غزل ہولی تو مشاعرہ ہو چکا۔ آپ پڑھ کر جائیے۔ غرض جو غزل پیش تھی ختم ہوئی۔ میر مشاعرہ نے استاد کی ایما سے خاص خاص اشخاص سے کہہ بھی دیا۔ اور شمع سامنے لاکر رکھ دی۔ کہ آپ غزل پڑھئے۔ اُستاد نے غزل پڑھی بڑی تعریفیں ہوئیں یہ اُدھر رخصت ہو کر حضور میں گئے۔ اِدھر مشاعرہ برہم ہو گیا۔ ہر شخص یہ کہہ کر اٹھ گیا۔ جو سنا تھا سن لیا۔ اب چلو اور سو رہو۔ مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ میاں۔ یہ تو ایک فقرہ تھا۔ وزن شعر کے لئے! بلانا کہاں تھا۔ اور جانا کہاں تھا؟

اتفاق تقدیر دیکھو کہ مشاعرہ کو سالہا سال گذر گئے۔ دلی تباہ ہو گئی۔ اب ۱۸۹۲ء میں مجھے کار سرکار کے لئے راولپنڈی میں جا کر کئی مہینے رہنا ہوا۔ وہاں میر وصیت علی ایک پیر کہن سال سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے دلی کے پرانے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی

[1] بادشاہی ملازم جو بطور خدمتگار کاروبار کرتے تھے۔ خواص کہلاتے تھے۔ دیکھو! جمع کا صیغہ ہے۔ مگر اراکین دربار کی زبانوں۔ اور دفتر کے کاغذوں میں بمعنے واحد مستعمل تھا۔

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے ناز سے گلشن میں غنچۂ نرگس
ذرا دکھا کے تو چشمِ پُرخواب تو دے

دلِ برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے خونخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزا شراب تو دے

کہاں بجھی ہے تہِ خاک میری آتشِ دل
کبھو ہوا سے ہلا دامنِ سحاب تو دے

تمہارے مطلعِ ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقتِ انتخاب تو دے

درِ قبول ہے دربان نہ بند کر دربار
دعائے تیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

چھپا ہو گو نہ بنے کشتگانِ زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا تو ہونے تڑپ اضطراب تو دے

ملا ہے آپ سے آئینہ یہ آدمی اس کا
گلی آ کے تجھے وقتِ اضطراب تو دے

نگار ... کا مقدور
جو اس پہ تیغ کرے ... حساب تو دے

نشہ تب ... ہو گئے حساب کرے
جو تجھ کو دیتے ہوں ... حساب تو دے

زبانِ خنجرِ قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دلِ شہید تو پھر کیوں نہ پیچ و تاب تو دے

جوابِ نامہ نہیں گر تو رکھ دو نامۂ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کب دریا
کسی کو دیکھ کے ذرا کاسۂ حباب تو دے

ہوا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوزِ جگر
بجھا کے اُن کی ذرا آتشِ عتاب تو دے

ستانے لوگوں کی اگر سرشت خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی اک بار آگ آب تو دے

کرے گا قتل ہوا سے ذوق تجھ کو سرمست
لگے کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہوں گا سرِ منزلِ فنا اے **ذوق**
مثالِ نقشِ قدم کرنے پا تراب تو دے

کب حق پرست زاہدِ جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

دل صاف ہو تو چاہیے معنیٰ پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے

کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے نکہتِ گل کا
چمن بادِ صبا سمجھے کہ آوازِ درا سمجھے

نگاہِ لطف ان کی جب نہ باز آئی تغافل سے
ہم اُن کی نارسائی اپنا بخت نارسا سمجھے

حسابِ عاشقانہ پوچھے تجھ سے میرے دل لیے جو لگا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

اگر دل کو لگا لا چیر کر پیکاں تو رہنے دو
کہ عاشق اپنے پہلو میں اسی کو دل کی جا سمجھے

کرے آہِ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا
تو سینہ کو فلک کے آبلہ سا زیرِ پا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے
تمہی سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

ہنسے ہے زخمِ دل تدبیر پر تاثیر کے بدلے
انہیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے

ہوا جب گرمیٔ الفت سے موم اُس دل شکن کا دل
تو اُس کے دل شکستہ اپنے حق میں تبا سمجھے

عدو آیا ہے بن کر نامہ بر لکھ کر نصیبوں کا
کریں گے لے کے خط کیا مدعی سے مدعا سمجھے

مجھے آتا ہے رشک اس رندِ مے آشام پر ساقی
نہ جو دع ما کدر جانے نہ جو خذ ما صفا سمجھے

نہ آیا خاک بھی رستہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

خبر سنتے ہی قاصد سے ہوئے ہم بے خبر بالکل
ترے پیغام کو گویا کہ پیغامِ قضا سمجھے

نحوست بھی سعادت ہو گئی سودے میں زلفوں کے
گلیمِ تیرہ بختی سر پہ ہم ظلِ ہما سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا
خرد کے تیز ناخن ناخنِ انگشتِ پا سمجھے

ملا اس زلف کے مصرع میں ہے مضمون پیچیدہ
اُسی سے یہ کھلے جو معنیٔ ناز و ادا سمجھے

ہوا نے زلف کو چھیڑا۔ اور اپنا دم اُلجھتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اُس کی
کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

بجھا تا گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے
اور آگ میں یونہی دنیا ہے گر عذاب تو دے

۱؎ جب اس شعر پر پہنچے تو غالب مرحوم سے کہا۔ مرزا صاحب! یہ آپ کے مذاق کا شعر ہے۔ وہ بھی خوش ہوئے اور تعریف کی۔

وادیٔ وحشت میں بھی جا کر نہ دل اپنا کھلا
پنجۂ مژگانِ آہو شیر کا چنگال ہے

دل میں شکلِ یار کب آئے نظر بے اضطراب
دیکھ لو سیماب بن آئینہ بے تمثال ہے

سبکہ ہے نوروز اپنا آفتاب بادہ سے
دورِ ساغر ہم کو ساقی گردشِ یکسال ہے

پوچھتے کیا ہو شکستِ دل کو صورت دیکھ لو
نامہ ہے چیں بر جبیں۔ قاصد شکستہ حال ہے

بارِ عشق اس تن کا سر پر رکھ لیا جو ہو سو ہو
اب کسے پروا ہے سوزن ہے کہ اک مثقال ہے

غم نہیں صیاد کو ورنہ مری فریاد سے
ہے قفس تو سینہ چاک اور دل مشبک جال ہے

کھل گیا مضمون شکستِ دل کا بے خط کے کھلے
نامہ بر کا اسقدر اپنے شکستہ حال ہے

ہے اسیرانِ محبت کی بلا سینہ میں آگ
شعلۂ نالہ ساں طوقِ گلو تک لال ہے

ہوتے ہیں اعضائے بوسیدہ تصور سے جدا
کھینچی تصویرِ مجنوں کی ترے اشکال ہے

روزِ محشر سے کئی دن دیکھنے کو چاہئیں!
گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہے

فرماتے تھے کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسۂ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامہ کے لئے دلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر پنڈارے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسہ میں گئے۔ تمہارے والد وہیں تھے۔ کوٹھے پر جا بیٹھے۔ دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسبِ حال یہ غزل کہی۔ کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسہ میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے انہیں بھی مشاعرہ کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے۔ دوستوں کی فرمائش سے ہم نے یہ غزل بھی پڑھی۔ بچارے برسوں صحرا نوردی میں تھے۔ اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خطِ صلح میں آکر انہیں چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھے۔ اکثر اشعار غزل کے ان کی صورتِ حال دکھاتے تھے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ اور جدا والے شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے بات نہ سنائی دیتی تھی۔

جُز ذلت سوجھتا نہیں اے مرغِ دل تجھے
خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے

دولت کی رکھ نہ مارِ سرِ گنج سے امید
موذی وہ دے گا کیا کہ جو دولت پرست ہے

عنقا نشاں چھپا کے ہے بیٹھا برائے نام
گُم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے

یہ **ذوق** مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے بلا سے لیک محبت پرست ہے

زخمِ دل پر میرے کیوں مرہم کا استعمال ہے
شگن اگر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
لوحِ بالیں پر بھی لکھا سورۂ زلزال ہے

عشق کو گر امتحاں یہ میرے قصدِ نال ہے
جوشِ داغِ دل ہجومِ نقطۂ رمال ہے

اب تو جانِ ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
لب تلک بھی اسکو آجانا رہِ صد سال ہے

ہم نے جانا تھا کفِ پا میں تمہارے خال ہے
لیکن اب دیکھا سویدائے دلِ پامال ہے

ابر برسوں رو چکا پر سوزِ غم سے اب تلک
خاک میرے ڈھیر کی اُڑنے میں جیسے رال ہے

میرے دودِ آہ سے یاں تک زمانہ ہے سیاہ
آفتابِ آسماں زنگی کے منہ کا خال ہے

میں وہ مجنوں ہوں کہ میرا کاغذِ تصویر بھی
مثلِ عیدی باعثِ خوشنودیٔ اطفال ہے

جب سے ہے دل میں کسی کی ناوکِ مژگاں کا خیال
نشترِ زنبور ہے تن پر مرے جو بال ہے

جوشِ گریہ کا مرے تم کچھ نہ پوچھو ماجرا
چادرِ آبِ رواں منہ پر مرے رومال ہے

دل پہ ہوں گر داغِ سوزانِ عشق میں آ کو ہکن
پھر تو خسرو کا بھی گنجِ سوختہ کیا مال ہے

کھاؤں میں بیڑا جو اُس بن کیونکہ دل ٹکڑے نہ ہو
جو رگِ پاں ہے وہ مجھ کو شیر کا سا بال ہے

ہیں جہاں مدفن تمہارے کشتگانِ زلف کے
نخل کی جا بید مجنوں ہے وہاں یا تبال ہے

شوخیٔ قاتل کرے آلودہ کیوں منہ پان سے
خونِ اعجازِ مسیحا سے لبِ اس کا لال ہے

فندقوں سے کس کی دل خوں تھا کہ میری خاک تک
نوکِ برگِ سبزہ جوں منقارِ طوطی لال ہے

اس کی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جس کے پاؤں تک
گردشِ رنگِ پری سے حلقۂ خلخال ہے

آئے وہ شاید عیادت کو کہ با صد ضعف حال
آئی مژگاں پر نظر بھی بہرِ استقبال ہے

[illegible]

غنچۂ تصویر بھی کھل کر جو عقدے وا نہ ہوں
ہائے قسمت وہ ہمارے عقدۂ مطلب ہے

سب سیہ کاری سے نامہ یاں تلک اپنا سیاہ
روز محشر پڑے گر سایہ اسکا شب ہے

سر چشم کو اب کیوں بنا اے دود آہ
ایسا کاجل بن کہ جس سے اسکا نالہ لب ہے

صحبت عیسیٰ بنائیں کیا گدھے کو آدمی
تھا سے جو بہرہ ہو نادانی وہاں کب ہے

موذیوں کو حق نہ دے آنکھیں کہ تا لاویں بلا
عین حکمت تھی کہ بے دم البم عقرب ہے

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جسکے ہاتھ سے
شیخ صنعا سا مسلماں رند بد مشرب ہے

لیتے ہی دل جو عاشق دلسوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

تم چشم سرمگیں کو جو اپنے دکھا چلے
بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے

دیوانہ آ کے اور بھی دل کو بنا چلے
اک دم تو بیٹھو ورنہ کہ کیا آئے کیا چلے

ہم لطف سیر باغ جہاں خاک اڑا چلے
شوق وصال دل میں لئے یار کا چلے

غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقش پا چلے
کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے

دکھلا کے مجھ کو نرگس بیمار کیا چلے
آوارہ مثل آہوئے صحرا بنا چلے

اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے

بل بے غرور حسن زمیں پر نہ رکھے پاؤں
مانند آفتاب وہ بے نقش پا چلے

کیا لے چلے گلی سے تری ہم کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

افسوس ہے کہ سایہ مرغ ہوا کی طرح
ہم جس کے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے

قاتل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہو تو کیوں
رک رک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے

ہے گل کا دل تو سنبل پیچاں کے دام میں
کیا اڑ کے تجھ سے طائر نکہت بھلا چلے

ہو کر سوار توسن عمر رواں پہ آہ
ہم اس سرائے دہر میں کیا آئے کیا چلے

لبریز ہو گیا مرا شاید کہ جام عمر
تم وقت نزع مجھ سے جو ہو کر جفا چلے

سلجھائیں زلفیں کیا لب دریا پہ آپ نے
ہر موج مثل مار سیہ تم بنا چلے

ہوئے سرِ دامانِ سپہ کا ایک سراسر لشکر ہے
اشک نہ تھا اک بارہ سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے

آبلہ ہائے سینہ جو نیمہ سے دکھائی دیتے ہیں
مزرعِ دل پر میرے پڑا کیا غم کا آ کر لشکر ہے

ہوئے دلِ مظلوم ہمارا کیوں نہ شہیدِ دشتِ بلا
در پے اس کے شامیوں کا وہ زلف معنبر لشکر ہے

دیویں موذی زحمت کس کو کیونکہ نہ ایذا جمع ضعیف
دشمن مار زخم رسیدہ مور کا اکثر لشکر ہے

کعبہ کو یہ غداری رکھتے آنچ کہ بوشش ابر نہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوشِ ہوا پر لشکر ہے

ہیں وہ شاہ کشورِ غم ہوں یارو جن کے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں اور بہتا سمندر لشکر ہے

گاہ ہجومِ یاس میں ہے دل۔ گاہ ہجومِ حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی پیشہ۔ پھرتا لشکر لشکر ہے

خالِ چشمِ جاناں کا مژگاں سے تجمل دیکھو تو!!
اترا پشت پہ ماہی کی کیا لے کے سکندر لشکر ہے

ہووے امام برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی
ہوتا گرد اسلامیوں کا جوں سبحہ گوہر لشکر ہے

میری ہی خاکستر اڑی تھی اس سے سب گرد ول
اس میں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے

دل کو رکھ دوں اس دمِ شمشیر پہ گر دم بنے
تا یہ قربانی صراطِ عشق پر مرکب بنے

خال لے خورشید و رخ پہ تمہارے کب بنے
تیرہ روز آ کر افق پر سوختہ کوکب بنے

کیونکہ تعلیمِ نیاز و ناز ہو یک جا بہم
گر نہ مجنوں آ کے لیلیٰ کا ہم مکتب بنے

الگ تا ہو نہ کھنچ کھنچ کر مرا ہر تار دامن سے
نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

خبر لوں جیب کی یا میں رہوں ہشیار دامن سے
جنوں الجھے ہیں ناخن جیب اور خار دامن سے

لگی ہیں اب تمنائیں مرے ہر خار دامن سے
کروں دستار میں گر ہو جدا اک تار دامن سے

لگے اس شعلہ خو کے کون مجھ سا زار دامن سے
کہیں الجھا ہے اب تک برق کے بھی خار دامن سے

کرے گر دھوتے دھوتے تو جدا ہر تار دامن سے
نہ چھوٹے خون میرا تیرے اے خونخوار دامن سے

کیا تو نے کنارہ ہم سے اور ہاتھوں سے وحشت کے
گریباں ہم کنار آکر ہوا اے یار دامن سے

تمہارے جلوۂ رخ کے جو بس خاک پر تو ہیں
تو پریاں آکے پونچھیں اے پری رخسار دامن سے

ہوا بے پردہ وہ پردہ نشیں۔ تو یوں کیا پردہ
بنایا درمیاں اک پردۂ دیوار دامن سے

وہ تن زیبا ہے اس کے واسطے جو قطع ہے اشپر
نکل سکتا ہے کوئی آستیں کاکار دامن سے

بہ انگوشش بہت ہیں ہفت دریا لوگ کہتے ہیں
گرے تھے اشک کے قطرے مرے درجار دامن سے

کمہ رہو وہ گل کیا کیا جو نادانستہ لگ جائے
ذرا آکر نسیم دامن گلزار دامن سے

خدا گر سر ہو تن سے اور جدا ہوں ہاتھ شانوں سے
جدا ہو پر نہ ہاتھ اپنا ترے اے یار دامن سے

ترا مجنون زار اتنا گراں جاں ہے نہ اٹھنے دے
لپٹ جائے اگر صحرا کے مثل خار دامن سے

پھروں کھینچے ہوئے کوسوں میں اپنے زور وحشت کا
ذرا تم باندھ دیکھو دامن کہسار دامن سے

جلینگے آتش رنگ حنائے پاسے گھر کتنے
دکھائینگے ادا جب گرمیٔ رفتار دامن سے

دکھائے صدمۂ زنجیر نے یہ پاؤں مجنوں کے
کہ صدمہ دل پہ ہوتا ہے دم رفتار دامن سے

عزیزا صلا نہیں سرمایہ ہمت کو کہ دریا نے
گرہ دیکر نہ باندھا گوہر شہوار دامن سے

مرتی بھی غلشگر کو نہیں دیتے ہیں آرائش
گلستاں پونچھتا ہے کب سنان خار دامن سے

سرایت کوہکن کا خوں اگر کر جائے پتھر میں
نکالے لعل ہی پتھر کی جا کہسار دامن سے

فرشتے تیرے دامن کو بنائیں جا نماز اپنی
اگر دھو ڈالے تو داغ مئے پندار دامن سے

مرے پاؤں کے چھالے ہوتے ہیں کیا کیا شکستہ دل
جو کوئی ٹوٹ جاتا ہے الجھ کر خار دامن سے

مرا آنسو ہے وہ زہراب۔ نیلا ہو بدن سارا
خدا ناکردہ لگ جائے گر اے غمخوار دامن سے

دنیا میں جب سے آئے۔ رہا نشۂ گُل خیال
ہم اس جہاں میں مثلِ صبا خاک اڑا چلے

قاتل سے قتل کیا ہے۔ نہ جانبر ہوا اپنا
گر گر کے مثلِ طائرِ رنگِ حنا چلے

نکہتِ قناعت اُن کو میسر ہوئی کہاں
دنیا سے دل میں لے کے جو حرص و ہوا چلے

آلودہ سرمہ سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ
دیکھا جہاں سے صاف ہی اہلِ صفا چلے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

لے جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

اس روئے آتشیں کے تصور میں یادِ زلف
ہے کیا غضب کہ آگ لگے اور ہوا چلے

اے ذوقؔ ہے غضب نگہِ یار الحفیظ!
وہ کیا بچے کہ جس پہ یہ تیرِ قضا چلے

استاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کلیاں کرتے تھے۔ بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کیا اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُس دن تو مطلع ہی طلوع ہوا۔ پھر غزل ہو گئی:۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکرِ خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
خاک کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغِ اسیر
جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے

تیرے صیدِ نیم جاں کی جان نکلے کس طرح
یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے

بیٹھا دوزخ میں بہاریں خلد کی دیکھا کرو
واں کی آتش ہو جو ان کے روئے آتشناک سے

آفتابِ حشر ہے یا رب کہ نکلا گرم گرم
اشکِ خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جائے دعا
مے پرستوں کے کفن پر کلکِ چوبِ تاک سے

عیبِ ذاتی کو چھپائے گا نہ حسنِ عارضی
زیب بد اندام کو ذوقؔ کیا پوشاک سے

سر بوقتِ ذبح اپنا اُسکے زیرِ پائے ہے
یہ نصیب. اللہ اکبر. لوٹنے کی جائے ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے
مژدہ خارِ دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے

واہ وا شورِ محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس مزے سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آ کر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کرم سوزِ دروں بھن جائینگے دل اور جگر
رحم جوشِ گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے
اُف رے بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی **ذوق** کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانبِ در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

زخمی ہوں ترے ناوکِ دزدیدہ نظر سے
جانے کا نہیں چور مرے زخمِ جگر سے

ہم خوب ہیں واقف ترے انداز کمر سے
یہ تار نکلتا ہے کوئی دل کے گہر سے

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبے کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

لبریز مئے صاف سے ہو جام بلوریں
زمزم سے ہے مطلب نہ صفا سے نہ حجر سے

سرمایۂ اُمید ہے کیا پاس ہمارے
اک آہ ہے سینہ میں سو نومید اثر سے

وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہیں شاخ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

حاضر ہیں مرے توسنِ وحشت کے جلو میں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

فریاد ستم کش ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں جو ہیں بہ کے چلے ہم بسوئے دوست
مقصود رہِ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اللہ رے وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں
پتھر ہیں پہاڑوں کے اُڑے جاتے شرر سے

کچھ رحمتِ باری سے نہیں دُور کہ ساقی
رو دیں جو ذرا مست تو مے ابر سے برسے

کشتہ ہوں میں کس چشمِ سیہ مست کا یارب
مستی ہے ٹپکتی مری تربت کے شجر سے

کھلتا نہیں دل. بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

نالوں کے اثر سے مرے پھوڑا سا ہے پکتا
کیوں ریم سدا نکلے نہ آہن کے جگر سے

ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریاں تنی زیبا
کہ جس کو آستیں سے ننگ ہے اور عار دامن سے

یہ کچھ بن اشکباری ہے کہ آنسو پونچھتا ہوں میں
کبھی تو آستیں سے اور کبھی اے یار دامن سے

کہاں وہ موسمِ طفلی کہ جب دامن سوار اں کیا
تجھے ہم تیار کرتے توسنِ رہوار دامن سے

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہو
اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے

میں وہ آلودہ دامن ہوں بنائیں تار سبحہ کا
فرشتے پاک دامن لے کے میرے تار دامن سے

یہ صید ناتواں بسمل پہ افتادہ اڑ جائے
لگا دے گر نسیم دامنِ کہسار دامن سے

ہوا پنکھے کی خوب آور ہے پردہ ایک جنبش میں
کریں سو فتنۂ خوابیدہ کو بیدار دامن سے

نگاہ بوالہوس آندھی ہے تیرے خاک اڑانے کو
چھپا لے اے پری رو شعلۂ رخسار دامن سے

نہ ہوگی دل جلوں کی ذوق ہمسایوں سے دلداری
اگر پروانوں پہ ٹپکے شمع کا رخسار دامن سے

ہوں یہ لاغر جھک گئے قامت ایک خس کے بوجھ سے
ہے کبادہ جو لچک جائے مگس کے بوجھ سے

تھا قدِ رعنا کبھی پر اب ہوس کے بوجھ سے
جھلملاتا سا ہے شعلہ اک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اس بام پر ٹوٹی کمند
ورنہ میں کیا۔ وہ نہ ٹوٹے مجھ سے دس کے بوجھ سے

شاخِ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جانی پہ آئیں
توڑ دے لوہے کے حلقے کو قفس کے بوجھ سے

مت لگا اے عشق دل کے آبلہ پر نقش غم
ٹوٹ جائیگا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

سر جھکاتے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانند سرو
ہے سبکساری جنہیں بارِ ہوس کے بوجھ سے

یہ اسیری میں گران خاطر ہوں میں جاتا ہے ٹوٹ
آہنی قلاب بھی میرے قفس کے بوجھ سے

زندہ تو ڈوبے ہے اور تیرے ہے مردہ آب میں
بوجھ شاید جسم کا کم ہے نفس کے بوجھ سے

باندھ دے ناقہ کی گردن میں دلِ نالانِ قیس
لیلیٰ اس کا بوجھ ہلکا ہے جرس کے بوجھ سے

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص
یہ گدھا تو رہ گیا دلدل میں کس کے بوجھ سے

اپنے دامن میں لے میری گل لختِ جگر
جی دھڑکتا ہے کہیں چولی مسکے بوجھ سے

کیا ہوا دل نے لیا گر ایک کوہِ غم اٹھا
یہ نہیں اے ذوق دبتا ایسے دس کے بوجھ سے

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست
دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے

کہد و اشکوں سے کیوں ہو کرتے کمی
شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے

کمیٔ گریہ نے جلا دیا دل
ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی ہدایت ذوق
اس سرے سب نہایتوں سے مجھے

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شورِ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

غمِ جدائی میں تیری ظالم۔ کہوں میں کیا۔ مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے۔ سینہ کاوی ہے۔ دلخراشی ہے۔ جانکنی ہے

زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے

بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا۔ یہ اُس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اُسی کے جلوہ کی روشنی ہے

ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اِس قدر آستین و دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

ہوئے ہیں اِس اپنی سادگی سے ہم آشنا جنگ و آشتی سے
اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے۔ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

لگا نہ اس بتکدہ میں تو دل۔ یہ سب ہے طلسمِ شکستِ غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمایل صنم ہے آخر شکستنی ہے

احاشیہ صفحہ (۱۸۶) لہ مثنوی مہر و وفا۔ فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے۔ پہلے زلیخا۔ بوستان سکندرنامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی۔ اب اسکا رواج نہیں رہا۔ یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کون سمجھتا ہے اب ان اشاروں کو خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

اے ذوق رہِ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہمدم جو نکل آئے کوئی گردِ سفر سے

آیا نہ وہ مہ طلعت۔ کیا دیر لگائی ہے
کھینچ لے کششِ الفت۔ کیا دیر لگائی ہے

قاصد تو کب آتا ہے۔ پر پیک اجل نے بھی
یاں آنے میں یا قسمت کیا دیر لگائی ہے

آنکھوں میں ہے دم تیرے۔ بیمارِ محبت کا
دکھلا دے کہیں صورت کیا دیر لگائی ہے

آتا بھی کہیں تیرا۔ آنا ہے قیامت کا
اے دلبرِ خوش قامت کیا دیر لگائی ہے

پروانہ سے کہتی ہے یہ شمع کہیں جل چک
ہے تجھ میں اگر جرأت کیا دیر لگائی ہے

کس فکر میں ہے ساقی۔ دے بادہ جو ہے باقی
تھوڑی ہے یہاں فرصت کیا دیر لگائی ہے

ہے تیغ بکف قاتل۔ تم مرنے پہ جانبازو!
باندھو کمرِ ہمت کیا دیر لگائی ہے

گر قتل ہی کرنا ہے قاتل کہیں کر جلدی
لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّة کیا دیر لگائی ہے

یاں وعدہ بھی آپہنچا۔ تو اب تلک آتا ہے
اللہ رے تری غفلت کیا دیر لگائی ہے

بے بادہ گلستاں میں پیتے ہیں لہو مے کش
ساقی نے دمِ عشرت کیا دیر لگائی ہے

دے پھونک کہیں دل کو مدت سے سلگتا ہے
اے سوزِ غمِ فرقت کیا دیر لگائی ہے

بالیں پہ کہا میری۔ ہنگامۂ محشر نے
لو اٹھو کہیں حضرت کیا دیر لگائی ہے

اُس کے لبِ خنجر کا لینا ہے اگر بوسہ
تو اے دلِ پُر حسرت کیا دیر لگائی ہے

اے ذوق شہید اسکو کہتے ہیں کئی عاشق
کرتے ہو اگر سبقت کیا دیر لگائی ہے

خوبرو کا شکایتوں سے مجھے
تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کیا کہوں کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ
غیر تیری حمایتوں سے مجھے

بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں
خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے

واجب القتل اُس نے ٹھہرایا
آیتوں سے روایتوں سے مجھے

حال مہر[1] و وفا کہوں تو کہیں
نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۱۲۴ پر

اس بتکدہ میں کون ہے کافر ترے سوا
تو بت پرست بت کی ہے اور بت تراش ہے

ہوتی وہاں دوش نہیں عاشقوں کی خاک
اڑ جاتی ٹھوکروں میں تری ان کی لاش ہے

ابریز صد نشاط ہے مثلِ ہلالِ عید
سینہ میں وہ جو ناخنِ غم کی خراش ہے

کرتے ہیں اشک و آہ میں تکلیف کیوں عبث
ہو جاتا رازِ دل تو نگاہوں میں فاش ہے

دنبالہ پر جو سرمہ کے دانہ ہے خال کا
دیکھو! وہ دستِ چشمِ فسوں گر پہ ماش ہے

کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق
شاباش جس کو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

دنیا سے بھی اٹھے تو نہ بستر سے اٹھ سکے
تیرا مریضِ عشق جو صاحبِ فراش ہے

ہے کس مزہ سے عشق میں اپنی ہوئی بسر
افسوس نیچ ہے نہ کبھی دل میں کاش ہے

برش میں اب تو خنجرِ خم دار سے بھی تیز
اس شوخ کج ادا نے لگائی تراش ہے

ممکن نہ دیر آج سے دل میں نہیں ہے غم
روزِ ازل سے اس کی یہیں بود و باش ہے

اے **ذوق** جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد
دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

ہے تیرے کان زلفِ معنبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مژگاں سے تیری لاگ ہے دل پر لگی ہوئی
اک پھانس ہے کلیجے کے اندر لگی ہوئی

جانے بغیر خون کوئی رہتی ہے تیری تیغ
بیٹھی ہے اسکو چاٹ ستمگر لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خمِ مے کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی

میت کو غسل دیجو نہ اس خاکسار کی
ہے تن کو خاکِ کوچۂ دلبر لگی ہوئی

میرے بھی پاس ہے نہیں ممکن کہ شمع سا
خورشید کو وہ تپ ہے فلک پر لگی ہوئی

میرا گلِ امید شگفتہ ہو کس طرح
دل کی گرہ ہے اس کی گرہ پر لگی ہوئی

گلِ مہندی کیوں نہ باغ میں ہو پائمالِ رشک
پاؤں میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ پردۂ فانوس تاک جھانک
پروانے سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانند کیمیاگر۔ ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

کوئی ہے کافر، کوئی مسلماں۔ جدا ہر اک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک رہبری ہے۔ وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

تکلفِ منزلِ محبت نہ کر۔ چلا چل تو بے تکلف
کہ جا بجا خارزارِ وحشت سے تجھ رہا فرشِ سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوق اس کے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوارِ آہنی ہے

آنکھ اس پُر جفا سے لڑتی ہے — جان کشتی قضا سے لڑتی ہے
شعلہ بھڑکے گا کیا بھلا سرِ بزم — شمع تجھ بن ہوا سے لڑتی ہے
قسمت اس بت سے جا لڑی اپنی — دیکھو! احمق خدا سے لڑتی ہے
صفِ مژگاں تری خدا کی پناہ — اک بلا، اک بلا سے لڑتی ہے
شورِ قلقل یہ کیوں ہے دخترِ رز — کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے
نگہِ ناز اس کی عاشق سے — جھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے
ترے بیمار کے سرِ بالیں — موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے
آج کہتے ہو کیا طبیعت کو — عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے
زالِ دنیا نے صلح کی کس دن — یہ لڑاکا سدا سے لڑتی ہے
تیری شمشیر خوں کی چھینٹوں سے — چھینٹے آبِ بقا سے لڑتی ہے
دیکھو اس چشمِ مست کی شوخی — جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ذوق دنیا ہے مکر کا میداں
نگہ اس کی دغا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم۔ اسے غم کی تلاش ہے — ڈرتا ہوں دل سے میاں یہ بڑا بدمعاش ہے

کب وہ گذرتے ہیں سرِاف وگزاف سے — جن کی کہ آشنا ہے زباں لام وکاف سے
اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے — لیتا تھا کام منہ کا سشکم میں یناف سے
چل میکدہ میں شیخ بسر کر مہِ صیام — مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے
نالوں نے دی چڑھا جو تپ لرزہ مہر کو — کھولی نہ آنکھ ابر سیہ کے لحاف سے
پھینکے ہے ایک جنبش مژگاں میں وہ پری — اس اپنے ناتواں کو پری کوہ قاف سے
ہو جوہر کمال یہ ننگا جو خاکسار — اک تیغ ہے کہ ننگ ہے اسکو غلاف سے
گذری ہے مشقِ سینہ شگافی میں اے قلم — عاشق کی عمر نالۂ گردوں شگاف سے
گردش ہے اس کی چشم کی کیوں میرے دل کے گرد — کافر کو کام کعبہ کے ہے کیا طواف سے
لڑتے ہیں گرنہ یہ کا ہے فلک سے ہم — فرقت کی رات کم نہیں روز مصاف سے
طوفِ سیاہ خیمہ لیلےٰ ہوا نصیب — مجنوں۔ سمجھیو کعبہ کے بہتر طواف سے
جوں تیغ خوش غلاف نگہ تیری اے پری — ہے دمبدم نکل کے چمکتی خلاف سے
لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود — لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے **ذوق** اس جہانکو ہے زیب اختلاف سے

سنہ ۱۸۵۰ء میں مرزا خدا بخش شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ کیا۔ اور دو مصرع طرح کئے

(۱) ع — کیا کیا مصیبتیں ہیں دلِ پُر محن کے ساتھ

دوسرا۔ ع

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

استاد نے دونو طرحوں میں غزلیں لکھی تھیں۔ اور مشاعرہ میں بھی گئے تھے۔ غزل مرقوم الذیل کہہ رہے تھے کہ ایک دوست آئے اور کہا کہ اس میں تو ساری غزل بے محاورہ ہو گئی اس طرح میں نہ کہئے۔ میں نے کہا بے محاورہ ہماری غزل نہ ہو گی۔ کہوانے والے بے محاورہ ہونگے۔ ایسی طرح کیا سمجھ کر رکھی۔ استاد مرحوم نے تامل کرکے فرمایا

منہ سے لگا ہوا ہے اگر جام مے تو کیا
ہے دل سے یاد ساقیِ کوثر لگی ہوئی

اے ذوقؔ اتنا دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھ سے کچھ پوچھو نہ خونابۂ حسرت کے مزے
زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھ کو کچھ یاد بھی ہیں پہلی محبت کے مزے
بے مزہ ہونے کے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوقؔ شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوقؔ محبت کے مزے

کھائے کوچہ میں ترے آکے جو سنگِ طفلاں
آئے مجنوں کو ترے میوۂ جنت کے مزے

لگتی مرچیں سی کبابوں کو ہیں سن کر کیا کیا
دل بریاں سے مرے سوزِ محبت کے مزے

حسرت ہر زخمِ جگر تا نہ ہو صد کانِ نمک
لوٹے کیا عشق میں اس کانِ ملاحت کے مزے

ملتِ عشق میں ہو کاش تنا سخ بھی بجا
کہ اڑائیں ترے سرباز شہادت کے مزے

دیکھ کر اس کو گیا عالمِ حیرت میں تو میں
پر بیاں کیا کروں اس عالمِ حیرت کے مزے

سجدے میں پائے خم مے پہ ہیں کس لطافت سے مست
یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

پھونک گلشن میں ہنسے کر کے زرا اپنا برباد
کہ اڑانے ہی میں دولت کے ہیں دولت کے مزے

جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی
پوچھو فرہاد سے اس تلخیِ حسرت کے مزے

ابر و باراں کے مزے کیونکہ نہ لوٹیں میخوار
کہ اڑاتے ہیں گنہگار ہی رحمت کے مزے

ہے نمک پاش جو ہنس ہنس کے وہ لعلِ نمکیں
لے رہا ہے دلِ مجروح جراحت کے مزے

کچھ جتاؤں جو محبت تو ہے کہتا کہ تجھے
دیکھ تو کیسے چکھاتا ہوں محبت کے مزے

ذائقہ چاشنیٔ عشق کا کامل ہو تو دیں
شادیٔ وصل کی لذت غمِ فرقت کے مزے

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں
پر مزے دار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

خنجرِ ناز نے کیا چاٹ لگائی دل کو
چاٹتا ہونٹ ہے لے لے کے جراحت کے مزے

بے مزاجی کو کریں لاکھ ترے ظلم و ستم
پر نہیں بھولتے وہ پہلی عنایت کے مزے

پھر کبھی یار خم کا انگور مبارک اے ذوقؔ
دلِ زخمی کو ترے بادۂ حسرت کے مزے

بلا سے گردانیاں کا سا۔ نہیں ہے پاس اپنے فال نامہ
ہم اپنے نقطوں سے داغِ دل ہی کے فالِ دولت نہ دیکھ لینگے

اگرچہ دردِ محبت اپنا۔ کہا نہیں نے زباں سے اپنی۔
وہ میری صورت نہ دیکھ لینگے۔ وہ میری حالت نہ دیکھ لینگے؟

ہلال کو دیکھیں کیوں فلک پر۔ اگر ہے منظور عید ہم کو
تو اُن کے تیغِ ستم کا دل میں لبِ جراحت نہ دیکھ لینگے

بہارِ باراں کو کون دیکھے۔ بغیر یاراں ہے تیر باراں۔
ہم اس کے بدلے سرشکِ مژگاں کی اپنے شدت نہ دیکھ لینگے

گزر بھی جاؤں گر اپنے جی سے۔ کہیں گے بیتاب جی چرایا
وہ جب تلک اپنے آستانے پہ میری تربت نہ دیکھ لینگے

مجھے یقیں ہے نہیں وہ کرینگے اپنے رخسارہ لالہ گوں کو۔
رواں مری چشمِ تر سے جب تک وہ خونِ حسرت نہ دیکھ لینگے

تپِ محبت کا میرے دل کی یقیں نہ آئے گا ہرگز اُن کو
طپیاں وہ رگ رگ میں میری جبتک کہ برق سرعت نہ دیکھ لینگے

خط اُن کو دے بھی دیا جو قاصد نے **ذوق** دے کر کسی کا دھوکہ
وہ خط نہ پہچان لینگے میرا۔ مری عبارت نہ دیکھ لینگے

کیا مدِ نظر تم کو ہے یاروں سے تو کہیے
گر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہیے

حالِ دلِ بیتاب کہا جائے جو ہم سے
گر کہیے نہ لاکھوں سے ہزاروں سے تو کہیے

کیا کیجئے گا اب وہ سفاک شہیداں
کچھ فتنے اٹھانے ہوں ہزاروں سے تو کہیے

پھر تم نہ کہیں حضرت عیسیٰ اگر اُن سے
کہیے کہ یہ تم عشق کے ماروں سے تو کہیے

کچھ سوزِ دل اپنا کسی دلسوز کے آگے
فرصت ہو تپِ غم کے حراروں سے تو کہیے

موقوف ہے گر دل کا شکار آن و ادا پر
تو پہلے کچھ اُن میر شکاروں سے تو کہیے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہے ان کے عمل سے
کیا حضرت آدم کی بھی اولاد غضب ہے

پریوں پہ تری طرح سے مرتے نہیں ہمدم
ہم جس پہ ہیں عاشق وہ پری زاد غضب ہے

تاثیر یہ فلک پر نہیں کہ اڑتے ہیں شرارے
عاشق کی ترے گرمیٔ فریاد غضب ہے

ہے سرو تو پابند غم بے ثمری میں
کہتے ہیں گرفتار کو آزاد غضب ہے

غمزہ ہے ترا قہر ترا قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے بیداد غضب ہے

ہے غم سے ترا آئینہ بادیدۂ پر آب
اسکندر رومی کی بھی روداد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اس پہ بھی دلکش غم آباد غضب ہے

قامت تو ترا سرو کے پر بھی قیامت
ہر طرۂ سر طرۂ شمشاد غضب ہے

سو فتنے ہیں پنہاں نظر لطف میں اس کی
یہ لطف نہیں اے دل ناشاد غضب ہے

دیں ہوش بھلا مردم ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمہاری وہ فسوں یاد غضب ہے

یہ خانۂ ہستی ہے عجب خانۂ رنگیں
اے **ذوق** مگر سستی بنیاد غضب ہے

ہوئے وہ کب قائل قیامت۔ جو تیرا قامت نہ دیکھ لینگے۔
رہیں گے رویت کے بلکہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے
ہمیں غرض کیا کہ جائینگے ہم۔ حرم کو اے شیخ بتکدہ سے۔
یہیں بتوں میں خدا کا اپنے۔ ظہور قدرت نہ دیکھ لیں گے
نہ دیکھ لی کس کی کیسی آفت۔ جہاں میں ہم نے تمہارے باعث۔
اور آگے کیا کیا غم والم ہم۔ تمہاری دولت نہ دیکھ لیں گے
دکھانا احوال ان کو اپنا۔ یہ ان کی الفت کا امتحاں ہے
کہ ہوگی الفت تو دیکھ لینگے۔ نہ ہوگی الفت نہ دیکھ لیں گے
کہوں یہ کیوں میں کہ حضرت دل۔ شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ۔
کہ آپ ہی تلخی محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لیں گے؟

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑینگے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبح قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھینگے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

سمجھیو دار و رسن۔ تار و سوزن اے ناصح
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

نہ بیچتی یوسف کنعاں کی خوبی بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھکو روبرو کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزار آرزو کی بہار
تمہاری باد بہاری میں آرزو کرتے

عجب نہ تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے۔ اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمر گزشتہ کا کیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

اُس سنگ آستاں پہ جبین نیاز ہے
وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نماز ہے

ناساز ہم سے جو ہے اُسی سے یہ ساز ہے
کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جس پہ ناز ہے

دروازہ میکدے کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

خانہ خرابیاں دل بیمار غم کی ہائے
ہے وہ دوا خراب کہ جو خانہ ساز ہے

خنجر کہیں نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب
میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
دیکھو حرامزادے کی رسی دراز ہے

اُس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک
ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

نقطہ یہ خال روئے بتاں کے مجھے خدا
بخشے تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

ہر برگ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا
گلشن میں کس کی خاک شہیدان ناز ہے

اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے تیرا راز عشق
جو نالہ ہے کلید در گنج راز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیاسے ہیں مے آشام مہینہ بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انہیں دریا میں سفینہ بھر کے

عقد پروین یہ نہیں حقۂ پروین میں ملک
لائے ہیں اُس رخ روشن کا پسینہ بھر کے

اُس گوہر دنداں پہ اگر سوجھے کوئی بات
موتی تو ہیں کیا مال ستاروں سے تو کہئے

جس راہ سے شانہ ہے گیا زلف رسا میں
اُس رستہ کو اُن سینہ فگاروں سے تو کہئے

کہئے نہ تنک ظرف سے اے ذوقؔ کبھی راز
کہہ کر اُسے سننا ہو ہزاروں سے تو کہئے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

زال دُنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر
مرد دیں دار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے

تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھ کو
تہمت اُس زلفِ سیہ نام پہ دھر دیتی ہے

رات بھاری تھی سرِ شمع پہ سو ہو گزری
کیا طباشیر سفیدیٔ سحر دیتی ہے

نازو انداز تو میں کر چکے سب مشقِ ستم
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری
عین احساں ہے مجھے زہر بھی گر دیتی ہے

کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی
دل کو فرصت نہیں وہ تیغِ نظر دیتی ہے

شمع گھبرا نہ تپِ غم سے کہ اک دم میں ابھی
آ کے کافور سفیدیٔ سحر دیتی ہے

فائدہ دے ترے بیمار کو کیا خاک دوا
اب تو اکسیر بھی دیکھئے تو ضرر دیتی ہے

غنچہ ہنستا ترے آگے ہے جو گستاخی سے
چٹکنا مُنہ پہ وہیں بادِ سحر دیتی ہے

شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

نخلِ مژگاں سے ہے کیا جانئے کیا چشم ثمر
چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے

کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجر میں پر
نالۂ دل کا جواب آہِ جگر دیتی ہے

کوئی غمّاز نہیں میری طرف سے اے ذوقؔ
کان اُس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

مزہ تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکر بے وضو کرتے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم تم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم ہم کو جو پاؤ تو چھڑی کو نہیں پاتے

کیا وقت تھا وہ تجھ کو دیا دل تھا جو ہم نے
اے سنگدل اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے

وہ کونسی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

لیتے ہیں شبِ وصل میں اُس لب کے یہ بوسے
ہم لب پہ سحر رنگ مِسی کو نہیں پاتے

میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی
گم ہو کے مری گم شدگی کو نہیں پاتے

رکھتے ہیں دمِ شعلہ نشاں اندرِ دوزخ
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کی دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اس سرِ خفی کو نہیں پاتے

ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی ۔

نبض ملتی ہے کہاں میری فلاطوں چلتی
ہے یہ ضعف اب کہ چونٹی بھی نہیں یوں چلتی

پہنچے کیونکر جرسِ ناقۂ لیلےٰ کی صدا
آج آندھی تری قسمت سے ہے مجنوں چلتی

کھول دو آنکھوں سے پٹی نہیں دیکھونگا میں
پر چھری اپنی تو گردن پہ میں دیکھوں چلتی

جب میں دنیا سے چلا۔ سر پہ یہ بولی حسرت
تو اکیلا نہیں ہیں ساتھ ترے ہوں چلتی

دور کر بالوں کو سر سے یہ ہے کہتی لیلےٰ
پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں چلتی

میں تو ان آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں
کہ نہیں تیری جہاں گردشِ گردوں چلتی

ق عمر ہے کہ رہی ہر دم سفرِ بحرِ فنا
جس کو تو سانس کہے ہے۔ دلِ محزوں چلتی

سمجھے ہے راکبِ کشتی کہ ہے ساحل چلتا
پر حقیقت میں ہے کشتی سرِ جیحوں چلتی

ذوق گل اور کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

سنہ ۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علی خاں کے ہاں رامپور کے نجبش خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام

روز اُس گلشنِ رخسار سے لیجاتے ہیں
اپنے دامانِ نظر مردمِ بینا بھر کے

دل ہے آئینہ۔ صفا چاہئے رکھنا اس کا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں آئینا تو کینہ بھر کے

خُم پُر جوش کی مانند چھلکتا ہے پڑا
خونِ حسرت سے لبوں تک مرا سینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کیساتھ
**ذوق** کے ساتھ قدح ذوق سے پینا بھر کے

جو تجھ سے مژگانِ پُر خوں سرِ خار نشیں نکلے
جنوں پہ جیسے نشتر تھے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

عدوئے بختِ زن کے گھر سے کب وہ مہ جبیں نکلے
الٰہی بُرجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

چھٹے کیا ہم سے شوقِ حسنِ گندم گوں کہ گندم پر
ہمارے جدِ امجد چھوڑ کر خلدِ بریں سے نکلے

ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے

پئے جا کر جو دنیا سے بھی کر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاکِ آدم سے نہ چپا بھر زمیں نکلے

غذا دے دور بینی اداس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس دور کے بے دوربیں نکلے

پلائے گر تصور اس لبِ شیریں کا آنکھوں کو
تو آنسو ہو کے شربت۔ خون ہو کر انگبیں نکلے

قلم کی دیکھو گلکاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جائے حرف گلہائے انارِ آتشیں نکلے

زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیرے جانے کا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے

نہ ہو عزت میں گر قدرِ صفا پاکیزہ گوہر کی
تو کیوں دریا سے یکتا ہو کے پھر دُرِّ ثمیں نکلے

تباہی میں ہے موذی کی ہلاکت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے

ہوئے تم بھی برابر دو کے میرے قتل کے درپے
چمکنے سے تمہارے جوہرِ شمشیرِ کیں نکلے

سراپا رو سیاہی گر ہے ان نامداروں کو
ہوس دل سے نہ ان کے نام کی مثلِ نگیں نکلے

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
مگر کیا دخل جو زہر آب اس میں انگبیں نکلے

دلِ زخمی کی سانت پر دہانِ زخم کیا بولیں
زبانِ تیغ سے نکلے تو صد آفریں نکلے

جو حسرت میرے دل سے نکالوں میں کہاں اسکو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے

نہ کرتے تھے شہرہ **ذوق** جن کی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے ہم نشیں نکلے

ساتھ اس کے عاشق مشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو۔ اور اُس میں
اثبات مضمون سہ گواہوں سے قایم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف متصف ہو
وغیرہ وغیرہ۔ اُسے سُن کر جو پڑھتے تو اُسی رتبہ کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر نہ دھرا
تھا۔ اور نہ وہ ان لوگوں میں نہ تھے۔ کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔
بات کو سمجھتے تھے۔ اور محل و مقام پہچانتے تھے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عز و شاں کے لئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کے لئے

مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کیلئے
پہ ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کیلئے

ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے
ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کے لئے

صبا ہے آئی خس و خار گلستاں کے لئے
قفس میں لوٹ رہا ہے دل آشیاں کے لئے

بام عروج ہے کیا فکر نردباں کے لئے
کمند آہ تو ہے بامِ آسماں کے لئے

سدا تپش پہ تپش ہے دلِ تپاں کے لئے
ہمیشہ غم پہ ہے غم جانِ ناتواں کے لئے

جو سنگ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے شیخ
تو بوسے ہم نے بھی اس سنگ آستاں کے لئے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی۔ کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لئے

دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا
وگرنہ لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کے لئے

خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن اے یار
یہ جان اُس ترے مجنونِ ناتواں کے لئے

الٰہی سوز محبت اُڑتا ہے تنِ زار
کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار
ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کیلئے

مری مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور
کہ جان دی تھی رونے عرق فشاں کیلئے

الٰہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا
کہ[1] ہاتھ رکھتے ہیں کانوں پہ سنے اذاں کیلئے

قدِ خمیدہ دیرا اپنے ہیں بال زیبِ دبال
اثاثہ کچھ تو رہے خانۂ کماں کے لئے

[1] کانوں پر ہاتھ رکھنا۔ انکار کرنا۔ مکر جانا۔ کان میں کچھ پھونکنا کسی کو اندر ہی اندر بہکا دینا۔

مشاعرہ کیا تھا۔ وہاں یہ غزل پڑھی گئی تھی۔ نواب موصوف نواب حبیب اللہ خان صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے۔ (دیکھو صفحہ ۹ ۰ ۱)۔ اصغر علی خاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انہیں ساتھ لے کر استاد مرحوم کے پاس آئے اور بڑے اصراروں سے مشاعرہ میں آنے کا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایام۔ استاد میرے والد مرحوم کے بغیر مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ ان کے پاس آئے۔ والد نے کہا۔ دل افسردہ ہوگیا۔ میں اُدھر نہیں جاتا۔ تم جاؤ۔ مگر جاؤ گے تو سنوگے کیسے؟ اور سناؤ گے کیسے؟ استاد نے کہا۔ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ وہ دونو آئے تھے۔ میں نے بھی ان کے اصرار سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤنگا۔ بندۂ آزاد اس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جا سکتا تھا جب تک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور مشاعرہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اگلے شاعروں کی باتیں سن سن کر آرزومند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا غرض کہ مشاعرہ میں گئے۔ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں استاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا۔ کچھ ان دنوں کا کہا ہوا سنائیے۔ مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا۔ حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا۔ پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سنا دیئے۔ انہیں دنوں میں ہوئے تھے۔

حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
خط بڑھا، کاکل بڑھی، زلفیں بڑھیں، گیسو بڑھے

اب مناسب ہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے
بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے دل

والد نے کہا۔ انہوں نے بھی کچھ سنایا؟ فرمایا نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ ہجوم کا مرض ایسا لگا ہے کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا۔ دل نہیں لگتا۔ چرچہ جاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ اس بیان سے بندۂ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ نہ سکتے تھے۔ بے شک انکے دیوان میں کئی ایسے مطلع موجود ہونگے۔ مگر سخن سنج۔ نکتہ شناس تھے۔

ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ناراضی بڑھ گئی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ بندۂ آزاد استاد کی خدمت میں حاضر تھا۔ استاد کے کسی دوست نے کہا کہ میاں صاحب حج کو چلے۔ ایک اور صاحب بولے۔ جاتا ہے نہ آتا ہے باتیں سنا کیجئے۔ استاد نے سُن سُن کر فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے | وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے |

کئی مہینے کے بعد غزل پوری کی:۔

| | |
|---|---|
| جو دل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے | وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے |
| کیا خط لکھوں انہیں کہ جو لکھنے کی بات ہے | پہلے ہی غیر واں ہیں انہیں سب پڑھا چکے |
| آنا بلا سے اُن کا قیامت سے کم نہیں | ہیں ہم تو مر چکے اسے آنا ہو آ چکے |
| زہر آب یا شراب یہاں سب ہے نوشِ جاں | ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے |
| اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا | جانے دو ہم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے |
| یاد آیا یاں کے آنے کا وعدہ بھی خواب میں | جب رات کو وہ پاؤں میں مہندی لگا چکے |
| اے دل زمین بوجھ ہے یا آسماں کا بار | ہیں اب تو سر پہ بارِ محبت اٹھا چکے |
| مدت سے موت زیست پڑے ہیں گلے کا ہار | تیغ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے |
| اب ڈھیر گرد ابر دنیا میں ہیں تو کیا | پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اڑا چکے |
| باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل | سو بار آبلے اسے آنکھیں دکھا چکے |
| حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی | ہیں تیغ آبدار سے خوں میں نہا چکے |
| سب ہم سے قیمتِ دل و جاں پوچھتے ہیں۔ آج | تا راتن کے اک نگاہ میں ہیں سب بکا چکے |
| ہو معرکے میں عشق کے ثابت نہ کیونکہ موت | جھگڑا یہ وہ نہیں ہے کہ جو بے قضا چکے |
| اپنا ہی دل نہ پھیر سکے رخ سے یار کے | سر اپنا خوب حضرتِ ناصح پھرا چکے |
| تم بھول کر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی! | ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے |
| دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشان | دشمن ہمارے نام کو کیا کیا مٹا چکے |

نہ دل رہا نہ جگر دونو جل کے خاک ہوئے — رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کیلئے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر — کہ یادگار زمانہ رہے نشاں کے لئے

امید ہوگئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس — بہشت تھا ہمیں آرام جاوداں کے لئے

نگاہِ ناز نے دیکھے تھے جوہر آج اپنے — دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کے لئے

تمہاری نرگسِ بیمار نے جو کی تھی نگاہ! — وہی جواب ہوا طاقت و تواں کے لئے

مزاج اُن کا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب — خطر جو ہے تو یہی ہے مزاجداں کے لئے

نہیں ہوں سنتے نکلا اتنا مجھے بھی ہے معلوم — فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کیلئے

اُڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنا نہ سکے ہم — شبِ فراق میں خورشید آسماں کے لئے

چلیں ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم — شکست توبہ لئے ارمغاں مغاں کے لئے

وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن — لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

بیان دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو — زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل — ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا **ذوق** جو انساں کو اُس نے جزو ضعیف
تو اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

بادشاہی خواجہ سراؤں میں محبوب ایک خوجہ تھا بیگم کی اس پر بڑی مہر بانی تھی وہ بڑھتے بڑھتے میاں محبوب۔ اور میاں صاحب ہو گئے۔ جب بیگم ترقی کرتے کرتے وزارت کی مالک ہوئیں تو محل کے ساتھ۔ مقدمات دربار کے اختیار بھی کل محبوب کو مل گئے۔ اور محبوب علی خاں نواب ہو گئے۔ سفید سیاہ۔ موقوفی بحالی سب ایک خوجہ کی زبان پر تھی۔ بے علم۔ بے لیاقت۔ بیہودہ اُس پر یہ افتادا ضرورتیں تھیں کہ علما، شرفا۔ امرا کو اس کے پا لتجی کر کے لے جاتی تھیں۔ اُسا اُس کم بخت مخنث کو جوئے کا مرض تھا۔ شہر کے نامی نامی جواری ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایسے اُن کی جگہ اُنہیں کہاں با حضور کبھی کبھی اس سے

زلفیں تری کافر انہیں دل سے مرے کیا کام
دل کعبہ ہے۔ اور کعبہ مسلماں کے لئے ہے

بیٹھا ہے سخنور جو گرفتار تفکر
زیبا یہ قفس مرغ خوش الحاں کے لئے ہے

مستوں کے لئے رحمت باری کے ہیں آثار
زاہد جو دعا مانگتا باراں کے لئے ہے

اپنوں سے نہ مل اپنے ہیں سب اپنوں کے دشمن
ہر نے میں بھری آگ نیستاں کے لئے ہے

میں کس کی نگاہوں کا ہوں وحشی کہ مری خاک
اک کحل بصر چشم غزالاں کے لئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہے تو میری شب ہجراں کے لئے ہے

عاشق کا جنوں طرفہ تماشہ ہے کہ ہر بات
گویا سبق اطفال دبستاں کے لئے ہے

وہ زلف سیہ پھینکتی کیوں دام ہے دل پر
یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کے لئے ہے

دل بھی ہے مرا جان ترے مشق ستم کی
جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کے لئے ہے

دل قید تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کے لئے ہے

چنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چنان و چنیں ہے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
خبر بھی نہیں یاں کہ ہے یا نہیں ہے

یہی گر تری چشم سحر آفریں ہے
تو دل ہے۔ نہ جاں ہے نہ ایماں نہ دیں ہے

صنم میرے دل کو خدائی کا تیری
یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہر اک چاند دیکھے ہے انتیسویں کا
جہاں ناتواں بین و باریک بیں ہے

رگ اشک اور آہ پہنچی فلک پر
مرا عشق کم خرچ بالا نشیں ہے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو
یہاں منتظر لب پہ جان حزیں ہے

پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں۔ دل کہیں۔ جاں کہیں ہے

شب غم میں دم ساز و دل سوز اپنا
دم سرد ہے نالۂ آتشیں ہے

ہنسی ہے جو کچھ رنجش آمیز اُن کی
تو موج تبسم بھی چین جبیں ہے

نہ ہوئے اگر تجھکو دم کا بھروسا
تو جو دم ہے غافل دم واپسیں ہے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اٹھو کہیں۔ وظیفہ بہت بڑ بڑا چکے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
جی ہی جی میں تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ابر کیا۔ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
برق کیا ہے تلملانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ذکرِ حسنِ شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
اُن کو در پردہ جلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جھوٹ موٹ افیوں کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے
اُن کو کف لا کر ڈرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

لطف اٹھانا ہے اگر منظور اُس کے ناز کا
پہلے اس کا ناز اٹھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کہدو قاصد سے کہ جائے کچھ بہانہ سے وہاں
گر نہیں آتا بہانہ کوئی ہم سے سیکھ جائے

زخم تو سیتے ہیں سب پر سوزنِ الماس سے
چاک سینہ کا سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

پوچھے ملّا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا
سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے دئے اس کو نکال
اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

دیکھ کر قاتل کو بھر لائے خراشِ دل میں خوں
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انہیں بھیجا جو مطلع درد کا
دردِ دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا مرتا ہوں۔ وہ بولے مرا سر کاٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واں ہلے ابرو۔ یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ
بات کا ایسا بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

سُن کے آمد اُن کی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہم نے پہلے ہی کہا تھا تو کرے گا ہم کو قتل
تیوروں کا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو سکھایا اپنی قسمت نے۔ دگر نہ اس کو غیر
کیا سکھائے گا۔ سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

کیا ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم روسیاہ
لیکن آنکھوں میں سمانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جو کچھ کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لئے ہے

لہ جو خانۂ ہستی میں ہے انساں کے لئے ہے۔

گلشن کو آب گر مژۂ اشکبار دے
بلبل بجائے بیضہ دُرِ آبدار دے

کیا خاک تجھ پہ جان کوئی جاں نثار دے
مٹی بھی جس کو تیرے نہ دل کا غبار دے

وہ زلف مشکبار اگر ایک تار دے
پھر میں نہ لوں اگر کوئی مشک تتار دے

جولاں سمندِ ناز کو اے شہسوار دے
تو سرمۂ چشمِ ماہ میں میرا غبار دے

وہ ناتواں ہوں میں کہ نہ جنبش کروں کبھی
ہلنے اگر نہ مجھ کو دلِ بیقرار دے

عشق اس پری کا ہے وہ بلا جائے لیکے جان
یہ جن نہیں ہے جس کو سیانا اُتار دے

ایسا نہ ہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط
قاصد جوابِ زندگیٔ مستعار دے

غم یار کار ہے گا مرے ساتھ تا بہ حشر
سچ ہے کہ ساتھ یار کا کیونکر نہ یار دے

کرتا ہے یوں فغاں دلِ امیدوارِ وصل
جیسے اذاں بلند کوئی روزہ دار دے

میں ہوں وہ گُل کہ پہنچوں نہ گلبن سے خاک تک
جنبش اگر نہ مجھ کو نسیمِ بہار دے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

میں ہوں وہ زندہ دل کہ مری جانِ بیقرار
برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے

لے دام داغِ دل سے مرے سوزشِ آفتاب
وعدہ پہ روزِ حشر کے پر کون اُدھار دے

بے رحم ہے نہ پاسِ مروّت نہ منصفی
پھر جان کس اُمید پہ یہ جاں نثار دے

ہو گرمیٔ وفا سے شگفتہ نہ گُل کا دل
جاں اپنی اُس پہ بلبلِ شیدا ہزار دے

بے فیض چشمہ آبِ مصفا کا ہے تو کیا
مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے

جانبازِ عشق جان تلک اپنی کھیل جائے
لیکن قمارِ عشق میں ہمت نہ ہار دے

ہوں شمعِ مردہ کشتۂ زلفِ سیاہ کو
گر دے کفن تو دامنِ شبہائے تار دے

چھوڑے کمان چرخ نہ تیر اپنا چھوڑنا
یہ آہ تیر ناک میں اس کی ہزار دے

عاشق نہ بدلے انجمِ گردوں سے اپنے اشک
کیوں کوڑیوں کے مول دُرِ شاہوار دے

نشتر سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

اس جبر پر تو ذوقِ بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

وہ پہلو میں بیٹھے ہیں اور بدگمانی / لئے پھرتی مجھ کو کہیں کا کہیں ہے
ہنسی آتی ہے مجھ کو جب تیرے آگے / کوئی ماہِ کنعاں کو کہتا حسیں ہے
جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو / لگائے ہوئے میرا دل دوربیں ہے
نہیں وہ رہے ہم سے تم تھے جو پہلے / زمانہ کو تو کچھ تغیر نہیں ہے
وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے / وہی آسماں اور وہی زمیں ہے

نہ کی آہ سوزِ غمِ دل پہ اٹھا سے
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

مرقوم الذیل مشاعرہ کی طرحی غزل ہے۔ مرزا خدا بخش شاہزادہ کے ہاں پڑھی تھی حکیم آغا جان عیش استاد کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُنہوں نے اپنی غزل میں پڑھا۔

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے / تھوڑی سی رہ گئی ہے سو وہ بھی گزار دے

شعر کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا۔ والد مرحوم استاد کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ اُن سے استاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں؟ انہوں نے کہا ضرور پڑھنا چاہئے۔ طبیعتوں کا اندازہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک نقطہ پر دو فکر پہنچے۔ اور کس کس انداز سے پہنچے۔ حکیم صاحب کے بعد ہی ان کے آگے شمع آئی۔ حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے کیا نیک نیت اور منصف مزاج تھے۔ شعر سن کر خوش ہوئے۔ رسائی طبع کی تعریف کی اور کہا کہ آپ فی الواقع استاد ہیں۔ (دیکھو صفحہ ۱۰۴)

جھلا نہیں تو جھلے کا گل اے نگار دے / پر کچھ نشانی اپنی مجھے یادگار دے
تو چشم میں نہ سرمہ نہ دنبالہ دار دے / مفتونِ چشم کو یوں ہی اِک تیر مار دے
ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کب وہ نگار دے / جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے نشتِ خار دے
ٹانکے نہ زخمِ دل میں ترا دلفگار دے / تو جب تلک نہ گیسوئے مشکیں کا تار دے
دشنام ہو کے وہ ترش ابرو ہزار دے / یاں وہ نشے نہیں جنہیں ترشی اتار دے

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دنیا میں
یہ تیرا خواب جادو اے خیالِ خام چلتا ہے

عجب شطرنجِ گردوں ہے کہ جس میں اپنے گھوڑوں کو
نئے منصوبہ سے روز ابلقِ ایام چلتا ہے

کہو صیاد سے گر ذبح کرتا ہے تو جلدی کر
ابھی کچھ دم مرے سینہ میں زیرِ دام چلتا ہے

ارادہ گر کرے ناقص علو جاہِ کامل کا
تو یہ جانو کہ نابینا کسی بر بام چلتا ہے

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا
کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس بھروسے پہ ہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تاب رخِ سیم تن میں ہے
پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس درد سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب
زیرِ شکنجہ زلفِ شکن در شکن میں ہے

یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزہ
بھر آتا میرے زخم کے پانی دہن میں ہے

ہیں روزنِ دہن میں جو کژدم لئے ہوئے
یہاں کام ان کا نیش زنی ہر سخن میں ہے

دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق
دیکھیں سہیل کیونکر چمکتا یمن میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا دردِ سر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

غزل مذکورہ ذیل ابتدائی مشق ہے۔ اس وقت استاد کی ۱۶—۱۷ برس کی عمر تھی۔ مجھے یاد ہے۔ ایک دن والد مرحوم کو استاد نے کچھ پرانے مسودے دیئے ہیں ان دنوں لڑکا تھا۔ وہ دیکھتے جاتے تھے۔ اور ہر کاغذ پر حسبِ حال کچھ کچھ کہتے بھی جاتے تھے۔ جس پرچہ پر غزل مرقومہ ذیل کے شعر لکھے تھے۔ اُسے دیکھ کر والد نے افسوس کیا۔ اور کہا۔ او ہو۔ دیکھو جی! یہ وہ غزل ہے۔ کیا کیا دن تھے وہ۔ اس مرحوم کا بھی افسوس ہی ہے۔ استاد نے کہا۔ افسوس!

؎ رنگیں ہے آج کل کے گلِ نو بہار سے
اگلا جو رنگ بستہ بو لی اس چمن میں تھا

پُرانی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔

پُوچھ مت راہِ وفا اُس نگہِ پُرفن سے
رہنمائی کی نہ رکھو چشمِ دلا رہزن سے

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے
بچ کے جانا کہ یہ اُلجھیں گے ترے دامن سے

کافرِ عشق ہوں گر سر بھی جدا ہو تن سے
نکلے زُنارِ محبت نہ مری گردن سے

تارِ ہر ساز کے پردہ میں محبت کے سبب
ایک فریاد نکلتی ہے دلِ آہن سے

ہوں میں وہ سوختہ موں شمع کہ مثلِ فانوس
میرا پیراہنِ تن میرے جدا ہے تن سے

تیغِ غم سے ہو نہ کیوں سینہ سپر مردِ وفا
کثرتِ زخمِ بدن پر نہیں کم جوشن سے

تیرہ بختوں کا ہے وہ کلبۂ تاریک بلا
ڈر کے خورشید بھی جھانکا نہ جہاں روزن سے

میں گرانبارِ محبت مرا خوں بھی ہے گراں
جی دھڑکتا ہے ترے نازکیٔ گردن سے

خوں مرا داغ نہیں دھوتا ہے تو کیا قاتل
یہ نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا ترے دامن سے

ہو گیا کاغذِ سوزن زدہ سینہ سارا
دل کی جو پھانس تھی نکلی نہ سرِ سوزن سے

گر جھکے تیغ تری سر ابھی حاضر ہے کہ ہم
اس پہ مرتے ہیں کہ تعظیم تو ہو دشمن سے

چشمِ میگون و صراحی بہ بغل۔ جام بکف
دیکھنا آج وہ گُل آتا ہے کس جوبن سے

چھوڑ کر گھر ترے ہاتھوں سے نکل جائیں کہاں
تنگ ہمسایوں کو اسے **ذوق** نہ کر شیون سے

فلک تو ٹیڑھا ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے تیری اپنا کام چلتا ہے

بھرے جاؤں گا میں صیاد دمِ گلشن کے چلنے کا
مرے سینہ میں جب تک دم بزیرِ دام چلتا ہے

ہمیشہ دورِ عشرت ہے جو تم ہو اہلِ کیفیت
کہ مہر و ماہ سے دن رات یاں اک جام چلتا ہے

چلا پہلو سے اُٹھ کر جبکہ وہ آرامِ جان و دل
کہا آرام نے ہم سے کہ لو آرام چلتا ہے

ترا تیرِ نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہے بن کر موت کا پیغام چلتا ہے

سمندِ وحشت اپنا شاخِ گل کے تازیانے سے
جنوں کی شاہراہوں میں سدا شہ گام چلتا ہے

لہ پہلے فرمایا تھا۔ سمندِ وحشت اپنا چوبِ گل کے تازیانے سے۔ پھر فرمایا ہر شخص نہ سمجھیگا تو لوگوں کو کیا خبر ہے کہ ایران میں جیسے موسمِ بہار میں جنون ہو جاتا ہے اس پہ یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے۔ اور اسے چوبِ گل زدن کہتے ہیں۔

تیغ قاتل سے ہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشورکا وہ دن کرے

دن قیامت کا تو ہے یہ میرا طور مارِ عمل
ہائے اتنا ہے کہ امکاں کیا وفا وہ دن کرے

نیک و بد سب دن خدا کے ہیں لکھی جس دن کی ہو
کچھ کرو لیکن فرامش کیا قضا وہ دن کرے

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچ میں
یعنی میری فاتحہ کا کون سا وہ دن کرے

ذوقؔ کہتا تھا کرونگا جمعہ کو حبّ کا عمل
کوئی اس کو جا کے تبلاوے ہو ا وہ دن کرے

یہ غزل بھی اُسی عہد کی ہے۔ مسودات مذکور سے نقل کی ہے۔

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے
کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری حقیقت پُر درد کو کوئی اُس سے
یہ آہ و نالہ نہ کہوے یہ چشم تر تو کہے

یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق
مجھے نہ شعلہ گر اپنا کہے شرر تو کہے

بقدر مایہ نہیں گر ہر اک کا رتبہ و نام
بھلا حباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے

جو چپ لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح
کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے

جل اُٹھے شمع کے مانند قصہ خواں کی زباں
ہمارا قصۂ پُر سوز لحظہ بھر تو کہے

شہید عشق کا ہر قطرہ خون اناالحق ہے
کہے جو حق کوئی منصور اسقدر تو کہے

مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے
کہیگا اور تو کیا۔ پہلے الحذر تو کہے

بھرے گا بارِ محبت کی کیا فلک حامی
یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے

بلا سے ہوئے مرا مرغ نامہ بر بھونرا
کہ اس کو دیکھ کے وہ منہ سے خوشخبر تو کہے[۱]

سرشکِ چشم مرے ہیں کہ ہو گئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوقؔ شعر تر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے
مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائینگے

سامنے چشم گہر بار کے کہہ دو دریا
چڑھ کے گر آئے تو نظروں سے اُتر جائینگے

[۱] دلی میں رسم تھی۔ کہ جب بھونرا اُڑتا ہوا پاس آتا تھا۔ تو اُسے شگون نیک سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ خوشخبر خوشخبر۔ خاندان تباہ ہوگئے۔ وہ لوگ اب نہ رہے۔ کون کہے۔ اور کون سنے۔

پھر ایک دن میں نے والد سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ شاہ نصیر مرحوم کے بیٹے وجیہ الدین منیر تھے۔ اُن کی بھی اُس زمانہ میں ۱۶۔ ۱۷ برس کی عمر تھی۔ اور طبیعت بھی تیز تھی۔ استاد کے ساتھ اکثر شعروں اور غزلوں کے معرکے رہتے تھے۔ ایک دن اُنہوں نے اُستاد سے کہا۔ مصرع طرح کرتے ہیں۔ آؤ غزل لکھو۔ لڑکپن کا عالم تھا۔ اُستاد نے کہا۔ کہو۔ کہینگے۔ مگر غزل کہی۔ اُستاد سے (شاہ صاحب) کہوالی۔ پھر کہا کیا؟ منیر نے کہا۔ اچھا پھر تم بتاؤ۔ اُستاد نے کہا ہم تم یہیں بیٹھ کر کہیں۔ دونوں بیٹھ گئے۔ اور طبع آزمائی ہونے لگی۔ اُستاد نے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں غزل کہی۔ اور کہا۔ کیوں صاحب! اُنہوں نے بھی غزل کہی تھی۔ دونوں غزلیں پڑھی گئیں۔ اُستاد نے اپنی غزل اُنہیں دی۔ اور چلے آئے۔ دوسرے دن اُستاد گئے۔ تو اُنہوں نے کچھ اور شعر بھی سنائے۔ بعض میں ترمیم تھی۔ بعض اشعار پر اُستاد نے کہا۔ یہ شعر تمہارے ہیں؟ اُنہوں نے کہا۔ بیشک۔ اُستاد نے کہا۔ اب یہ شعر استاد (شاہ صاحب) کے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اُنہوں نے کہا۔ واہ ہمارے ہیں۔ اس پر خوب گفتگوئیں رہیں۔ طرفین کے یاروں میں صلاح مشورے۔ اور مقابلے ہوتے رہے۔ خدا کی شان ہے۔ شاہ وجیہ الدین نوجوان دنیا سے گئے۔ اُستاد بڈھے ہوئے تو کیا۔ آخر چلے ہی گئے افسوس افسوس! وقت گزرتا ہے۔ باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ الٰہی ہم سے نیکی کی راستی یادگار باقی رکھیو۔ غزل مذکور میں سے جو کچھ باقی ہے وہی لکھ دیتا ہوں۔

یہاں کے آنے کا مقرر قاصد وہ دن کرے
کون سی شب آئیگا وہ مہ منجّم سے کہو

توکرے قرباں ہمیں جس دن ہمارے واسطے
تب کہا قاصد نے دن وعدہ کا آیا تو کہا

جو تو مانگے گا وہی دونگا خدا وہ دن کرے
میرے سعد و نحس کا معلوم تا وہ دن کرے

عید قرباں سے شرف پیدا سوا وہ دن کرے
اس سے کہدو یوں ہی محشر تک گنا وہ دن کرے

ہے جراحت کا مری سودۂ الماس علاج
فائدہ اس کو کبھی سنگِ جراحت نکرے

عشق کے داغ کو دل نہ نبوت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوائے نبوت نکرے

ہر قدم پر مرے اشکوں سے رواں ہیں دریا
کیا کرے جادہ اگر ترک رفاقت نکرے

آج تک خوں سے مرے تر ہے زبانِ خنجر
پر کرے کیا جو طلب کوئی شہادت نکرے

مکتبِ صبحِ ازل کا ہے خلیفہ انسان
پھر کرے کون اگر یہ بھی خلافت نکرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نکرے

پھر چلا مقتلِ عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نکرے

کہتے ہیں جھوٹ سب۔ کہ نہیں پانو جھوٹ کے
چھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

چلتا ہو ذوق قید سے ہستی کے چھوٹ کے
یہ قید بار تھا اسے دم گھوٹ گھوٹ کے

ڈھالا جو تجھ کو حسن کے سانچے میں اے صنم
آنکھوں کی جائے بھر دیے موتی سے کوٹ کے

بیدرد۔ سینہ کوٹنا خالی نہیں مرا
دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جب تلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق
روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

ہر دم دلِ خوں گشتہ میں اک جوش فزوں ہے
جو آہ ہے سینہ میں سو فوارۂ خوں ہے

دنیا کی ہے رفعت کا سبب پستیٔ ہمت
گردوں کو ہے اوج اس سے یہ پایہ میں کہ دوں ہے

پھر جاتی ہے سینہ کو مری آہ بھی الٹی
قسمت ہے جو برگشتہ ہوئی بخت نگوں ہے

میں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز
پر دل یہی کہتا ہے کہ ہرگز نہ کہوں ہے

اک غمزہ تری چشمِ فسوں کار کا کافر
سو چشمِ پری کو سبق آموزِ فسوں ہے

دل کرتا ہے اس کوچہ کا جب قصد تو لیتا
طائر کے عوض رنگ پریدہ سے شگوں ہے

قایم ہے بنا درد کی فریاد سے میری
جو نالہ ہے ایوانِ محبت کا ستوں ہے

تم نے ٹھہرائی اگر غیر کے گھر جانے کی
تو ارادے یہاں کچھ اور ٹھہر جائینگے

خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہم داں
پر نہیں زخم مرے ایسے کہ بھر جائینگے

لائے جو مست ہیں تربت پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائینگے

پہنچینگے رہ گذر یار تلک کیونکر ہم
پہلے جب تک نہ دو عالم سے گذر جائینگے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرق شرم سے تر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعویٰ تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائینگے

رخ روشن سے نقاب اپنے الٹ دیکھو تم
مہر و مہ نظروں سے یاروں کی اُتر جائینگے

شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں
پر یہی ڈر ہے کہ وہ دیکھکے ڈر جائینگے

ہم بھی دیکھیں گے کوئی اہل نظر ہے کہ نہیں
یہاں سے جب ہم روش تیر نظر جائینگے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملاّ
ان کو میخانے میں لے آؤ سنور جائینگے

دل بچے کیونکر بتوں کی چشم شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سینکڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی کر تو واقف ہی نہیں
اس دل بیتاب و جان مضطرب کے ڈھنگ سے

بل بے باریکی کہ گویا ہے ترا تار سخن
جنتری میں کھنچکے نکلے ہے دہان تنگ سے

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھے گا کہاں تو ہم سے اے رنگیں ادا
ہوگا تو جس رنگ میں ملجائینگے اُس رنگ سے

جوش گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اس کی تیغ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نماز عشق میں
دل سے کہدیجے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہو گئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب بنگ سے مہندی مے گلرنگ سے

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نہ کرے
اور یہ تنگ کریں منہ تو شکایت نہ کرے

نہیں آتا نہ آئے رحم اسے ذوق اس ستمگر کو
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ و زاری سے

یہ غزل بھی ایام شباب کی ہے۔ شاہ نصیر کے عہد میں ہی کہی

یار ہنسنے حال پہ ہم دل فگاروں کے لگے
کاش کے لینے ہی یا رب ان کو یاروں کے لگے

اور بھی چمکا سمند وحشت اپنا دشت میں
تیز جوں مہمیز نشتر نیک خاروں کے لگے

کس کی کفش پا پہ دیکھے ہیں ستارے اے فلک
رشتے ہیں دیدے زمیں کو جو ستاروں کے لگے

بزم میں گردش دینے لگے جوں نقاب
چھوڑنے مہتاب منہ پر ماہ پاروں کے لگے

اس طرح در پہ دلو تکتے ہیں تیرے چشم نگاہ
بدن ستارا نکلی پھرتی پیچھے ستاروں کے لگے

سرزمین باغ الفت میں ترے اے فتنہ گر
نخل قامت جب تو نے سینہ فگاروں کے لگے

لہلہاتیاں تیروں کی نکلیں چھوٹے سوفاروں کے لگی
خنجروں کے برق دیکھے کہیں کہساروں کے لگے

ہوا گرم فغاں مرغ چمن میری طرح
آگ دم سے آشیانوں کو ہزاروں کے لگے

آکے ہم جس بزم میں اک دم ہوا سیر سینکڑوں
تیغ طعنوں کی لگی خنجر اشاروں کے لگے

اے خدنگ یار مرہم جائیں غیرت سے نہ کیوں
مرہم آکر زخم پر سینہ فگاروں کے لگے

ذوق عمر نے جنوں میں ہو گیا سب گرد باد
توسن وحشت کو ہیں مہمیز یاروں کے لگے

باغ عالم میں جہاں نخل حنا لگتا ہے
دل پر خوں کا وہاں ہاتھ پتا لگتا ہے

کیا ترے تیر نے دل بسمل کا بھلا لگتا ہے
جب اچھلتا ہے ترے سینے سے لگتا ہے

دل کہاں سیر تماشے سے مرا لگتا ہے
دل ہے لگی تیری جینا بھی برا لگتا ہے

جو حوادث سے زمانے کے گرا کب اٹھا
نخل آندھی کا کہیں اکھڑا ہوا لگتا ہے

دل لگی کا ہے مزا یہ کہ گزک میں اے دل
سب کبابوں سے نمک تجھ کو سوا لگتا ہے

نہ شب ہجر میں لگتی ہے زباں تالو سے
اور نہ پہلو مرا بستر سے ذرا لگتا ہے

ہائے محتاج ہوا مرہم زنگار کا تو
زخم دل! زہر مجھے ہنسنا ترا لگتا ہے

جس دن سے ہوا عشق مرے درپئے تعلیم
مرجاؤں مگر رازِ محبت نہ جتاؤں
بیتابیٔ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف
بیتابیٔ دل کا کوئی مضموں جو ہوا نظم
تلخابۂ حسرت کو پیوں کیوں نہ مزے سے
بے وصل میں غم ہجر کا اور ہجر بلا ہے
آلودۂ اظہار نہ ہو رازِ محبت
کھو آپ کو گر ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل
بار دیتے وہاں لاکھوں میں نا گردِ کر جینا

ہر خارِ بیاباں تسلیم شق جنوں سے
کیا ہی اگر ۔ دہ دل میں نہ کہوں سے
دکھلا رہا گا ہے حرکت گاہ سکوں سے
ہر حرف ہے میرے حرکت جائے سکوں سے
میری ہی تہ ہے تپِ سوزِ دروں سے
آرام محبت میں آہیں یوں ہی نہ دوں سے
دم ہونٹوں پہ آجائے مگر میں نہ کہوں ۔
گم گشتگی اس رہ میں تری رہنموں سے
وہ چشم فسوں گر سبق آموز فسوں ہے

کیوں حالِ زبوں اپنا بیاں ہے ان سے
اے ذوق ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے

کرے ہے کام تیغِ یار کس کس آبداری سے
زباں کھولینگے مجھ پہ بد زباں کیا بدشعاری سے
گزرتی ہے مزہ میں زندگی غفلت شعاری سے
نہ ہوتا گر وہ شوخِ خود نما سرگرمِ آرائش
رواں ہے شمع کے اشکوں میں چربی ناک گھل گھل کر
خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی
جو پوچھے زاہدِ خشک اپنی دارو کہدو مے پی لے
قفس کو لے اڑیں صیاد اسیرِ مضطرب تیرے
کبھی گر سر اٹھاتا اپنا تو جوں اشکِ سرِ مژگاں
اٹھائے جاؤں کب تک داغ کاش انکے عوض ہوتے
لگی بجلی گر زمیں کو بیٹھ تیرے تفتہ جانوں کی

دکھاتی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخم کاری سے
کنیں نے خاک بھر دی ان کے منہ میں خاکساری سے
مجھے زندہ لیکن بیہوشی سے بہتر ہوشیاری سے
اٹھاتا ہاتھ خورشیدِ فلک آئینہ داری سے
بہا جاتا ہے دل خوں ہوکے اپنا اشکباری سے
کہ نوبت دم شماری کی ہے شب اختر شماری سے
اگر پرہیز کو پوچھے کہو پرہیزگاری سے
خبر گل کی اگر اڑتی سنیں باد بہاری سے
زمیں کو جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے
مری چھاتی پہ پتھر سنگدل دو چار بھاری سے
تو مثلِ برق اٹھ بھاگے وہیں پھر بیقراری سے

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی
تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیٔ عمر
سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارہ آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اس کے ساتھ ہے اے ذوق میری جان لگی

وہ ہوں میں پُر معاصی سوختہ سوزِ ندامت سے
حذر دوزخ کرے جس کے شرارِ سنگِ تربت سے
وہی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
بِنا واحد کی کیوں توڑیگا ملّا جمعِ کثرت سے
نہ سوکھے دامنِ تر ذرہ میرا اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشمِ خورشیدِ قیامت سے
دمِ تکبیر اٹھائے دو جہاں سے ہاتھ یکباری
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسنِ نیت سے
اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں ذرات نالاں ہے
تو میں کہدوں محبت سے محبت سے محبت سے
برائے شوکتِ دنیا نہ لیجو عارِ دیں زاہد
سمجھو شوکۃ العقرب کو بہتر ایسی شوکت سے
تنک ہو بشک ہے یا سودہ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگِ جراحت سے
پڑھو گر فاتحہ تم آکے مرقد پہ شہیدوں کے
تو ہاں اٹھ کر اشارہ کردے انگشتِ شہادت سے
حریصوں کو نہیں ہے وسعتِ آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پاؤں پھیلا دے فراغت سے
الف کو تیری قامت کے کیا استادِ قدرت نے
مزین صفحۂ ہستی پہ رعنائی کے خلعت سے
لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
مجھے زخمی کیا ہے کس نے ابرو کی اشارت سے
بہت اچھا کیا مجھ کو کیا گر قتل قاتل نے
کہ ہو ویگا نہ عاشق اب کوئی اور اس پہ عبرت سے
علاجِ زخمِ حسرت ہے مرا ہیزابِ تیغ اس کا
نہیں سنگِ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے
اگر آلائشِ ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
بھلا باطن میں رتبہ کیا ہے کو نیک طینت سے
ہوئی حرفوں میں گویا نقطۂ رحمت سے زحمت
عدد دیکھا ہے گر رحمت زیادہ ہوتی زحمت سے

زبانِ ریختہ کردی زبانِ اہلِ ولایت کی
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

سلہ حاشیہ دیکھئے صفحہ ۲۲۲

آبِ خنجر ہے جو زہراب وفاداروں کو
ملک سعد ہے وفا پانی ذرا لگتا ہے [لہ]

قدِ مجنوں ترے پھولوں کی چھڑی ہے لیلیٰ
جب ذرا جھکتا ہے سر پاؤں سے جا لگتا ہے

زر ذرا ہے تو کیا۔ کھوٹ ابھی ہے دل میں
ذوق اس زر کو کسوٹی یہ کسا لگتا ہے

اڑائی طرزِ نالہ کی تھی اک دم ترے محزوں سے
سوا تبک دیکھ لے منقارِ طوطی سرخ ہے خوں سے

نہ شب آنکھوں میں خواب آیا خیالِ خالِ مشکوں سے
رہے بیدار ساری رات ہم اک حبِ افیوں سے

یہ دنیا ہے وہ دنخانہ کہ جس میں دورِ گردوں نے
گلِ حکمت کئے کتنے ہی گم خاکِ فلاطوں سے

اثر ہو نالۂ پُر درد کا اتنا تو اے بلبل
کہ ٹپکے جائے شبنم اشکِ انجم چشمِ گردوں سے

شہیدِ چشمِ میگوں ہوں کہو تربت پہ سب میکش
کریں آ کر چراغاں ساغرِ صہبائے گلگوں سے

ترے مجنوں کے تن پر لاغری کا قطع ہے جا
بناتا پیرہن ہے ایک برگِ بیدِ مجنوں سے

خدا جانے ہوئے بخت اپنے واژوں اسکی زلفوں سے
دیا زلفیں ہیں اسکی واژگوں مجھ بخت واژوں سے

انہی باغِ سخن میں ذوق جی اپنا بہلتا ہے
جہاں بوئے عشق کی آتی ہے کچھ گلہائے مضموں سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ترا زباں سے ملانا زباں جو یاد آیا
نہ ہائے ہائے میں تالو سے پھر زبان لگی

کسی کے دل کا سنو حال۔ دل لگا کر تم
جو ہووے دل کو تمہارے بھی مہربان لگی

تو وہ ہلال جبیں ہے کہ تارے بن بن کر
رہے ہے تیری طرف چشمِ یک جہان لگی

خدا کرے کہے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی
کہ زلف اے بتِ بہ کیش تیرے کان لگی

اڑائی حرص نے آ کر جہاں میں سب کی خاک
نہیں ہے کس کو ہوا زیرِ آسمان لگی

تمہارے ہاتھوں ہمارے دلِ فگار میں آہ
سنانِ خنجر و پیکان کی ہے دکان لگی

لہ بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے۔ کہ امراض مہلک میں گرفتار ہو کر مر جاتے ہیں۔ محاورۃً یوں کہتے ہیں، کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مر گیا پانی لگا تھا۔

۳ اُڑا ئیں بون جادوگر۔ بلا سے ہم نہیں ڈرتے
ہے اپنا دم ہوا ہوتا۔ تری چشمِ پُرافسوں سے

جو مرے واقفِ جوہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں رلا سے کیا کیا
دل بیتاب کو میں اور دلِ بیتاب مجھے

میں نہ تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کر رہا مدِ نظر عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جو گل سے بھی نازک ہے سوا
لیوے اس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم مری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

گردشِ چرخ سے اے ذوق مہندس کیلئے
آسماں اس کو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیر اس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا اور وہ پتھر میں گھر کرے
انساں وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے گلِ عبہر میں گھر کرے

یوں میرے دل میں چبھتی ہے [illegible]
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

[illegible] چھپا نہیں کہ گئے صبح و شام آئے
دل ہو کہ اس کی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوش گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سیکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گردِ باد کے مجنوں نے گھر کیا
سرگشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگِ رخ پہ اس کے [illegible] مرا خیال
جس طرح رنگ برگِ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا عبث کیا بھلا
یہ زنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دل تیر کا تم ہوا۔ کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمرِ خضر بھی تو کہینگے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

غزل مرقومۃ الذیل ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو۔ عہد مذکور کا محاورہ سنائی ہے

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے ہے
البتہ آدمی سو کبھی آئے جائے ہے

جو اس گلی میں مثل صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اسکو تمنا لے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو جلائے جائے ہے
پر میرے پاس سے بھی کوئی لکھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس پتنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشک گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھوا کے بھیج دیتا ہے اک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا مرے پرچائے جائے ہے

ابر مژہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ نہ برسائے جائے ہے

خوار و ستے بجا ہے تو اشمع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ تہوڑائے جائے ہے

کیا حال جسم زار کہوں سوز عشق سے
اک بال ہے کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمون اضطراب کا ہے یہ بھی اک اثر
وہ مرغ نامہ بر کو بھی پھڑکائے جائے ہے

تابوت تیرے کشتہ کو جنبش سے کم نہیں
کیا پاؤں اپنے تن سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوق مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائے گی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے جائے ہے

ے واے

کچھ نہیں چاہئے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورت سیماب مجھے

اسنے مارا رخ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہئے بہر کفن چادر مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اٹھا لائے تھے احباب مجھے
لے چلا آج وہیں پھر دل بیتاب مجھے

چمن دہر میں جوں سبزہ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے دیا کرتے ہیں زہر آب مجھے

میں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خط میں
قبلہ و کعبہ لکھا کرتا ہے القاب مجھے

سفر عمر ہے یارب کہ ہے طوفان بلا
ہر قدم سیل حوادث کا ہے گرداب مجھے

لے ۳۰-۴۰ برس ہوئے کہ اہل ولایت مرد تازہ ولایت کشمیر ولایت۔ عناب ولایتی۔ مرد ولایتی۔ اور مرد ولایت زا او بلی ولایتی کہتے تھے۔ اور لوگ اس سے ولایت ایران کہتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں دیکھو لفظ وہی ہے۔ مفہوم بدل گیا۔ آزاد

صد خندۂ دنداں نما۔ شب شوشۂ پروین پہ ہے
دو بام سے بھر کر چڑھا۔ پھر دیکھ کیفیت ہے کیا
یہ خوب عینک حق نما۔ چشم حقیقت بیں پہ ہے
ہو کوہ کے چشموں سے وہاں۔ پانی نہ کیوں شیریں رواں
دو جانِ شیریں کھو جہاں۔ فرہاد نے سر تیشہ پہ ہے
میں کیا کروں اظہارِ غم۔ سب بارِ غم پہ بارِ غم
دن رات ایک انبارِ غم۔ میرے دلِ مسکیں پہ ہے

مشکل نہ ہو گر تیغ پر۔ چڑھ کر یہ جوہر کو نکلے
اے ذوق یہاں بات یہ جو آرائشِ زیں پہ ہے

اگر ہے ترے چشمِ پرنم ابھی سے
تو پھر ہو چکے ہیں خصومت ہم ابھی سے

لگے کیوں نہ تیر پہ مرنے ہم ابھی سے
کہ پایا خدا کو یہ غم ابھی سے

دلا ربط ان سے رکھو کم ابھی سے
جتا دیتے ہیں ہم کو ستم ابھی سے

ترے بیمارِ غم کے ہیں جو غم خوار
برستا ان پہ ہے ماتم ابھی سے

شب آیا نہیں گر اس کی مژگاں
صفیں یاروں کی ہیں برہم ابھی سے

نہیں ہے دیدۂ اگر جا سے ان کے
نہیں اپنے بھی دم میں دم ابھی سے

بہیں آنسو تو دامن کیا کہیں گے
ہوئی ہے آستیں پرنم ابھی سے

مرے لاشہ پہ بھی آئی بدگماں نے
کہا کیوں جی اکھڑا یا دم ابھی سے

تمہارا مجھ کو پاسِ آبرو تھا
وگرنہ اشک بہتے تھم ابھی سے

لگے ہیں بلانے تجھ کو آنسو
کہ ہو دنیا پہ غم محکم ابھی سے

وحشت یہ منہ کھلے پر جا نکلے آج
کہ چھایا دل پہ ابرِ غم ابھی سے

نکلتے ہی دم اٹھواتے ہیں مجھ کو
ہوئے بیزار کیوں ہمدم ابھی سے

ابھی دل پر جراحت ہے نہ دوستو
لے آئے دوستو مرہم ابھی سے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا ذوقِ شوق
نازاں نہ ہو خرد پہ جو بیہودہ ہی ہو
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ

سن کر فغانِ قیس بجائے حدی چلے
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے
تم بھی چلے چلو یونہیں جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دیں تو نے اگرچہ اک زمانے سے
ستمگر تو نے روکا سب کو میرے پاس آنے سے
ڈھلینگے شمع کے سانچے میں گذرے سر پہ جو گذرے
پئے تسبیح زاہد نگاہِ مست اگر تیری
تمہاری زلف کے کوچوں میں پھرتا ہے وہ دیوانہ
کہاں جاؤں اڑا کر طائرِ بے بال و پر ہوں میں

نہیں اس پر بھی اے ظالم ترا ایماں ٹھکانے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے
بہینگے آنسوؤں میں ان کے آگے اس بہانے سے
تو ٹپکے بادۂ انگور اس کے دانے دانے سے
پتہ لینا ہو گر دل کا تو لینا اس نشانے سے
قفس صیاد کا بہتر ہے گو آشیانے سے

نہ کچھ خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جاں غش لبِ جاں بخش پر۔ دل غش خطِ مشکیں پہ ہے
عیسائی اپنے دیں پہ ہے۔ موسائی اپنے دیں پہ ہے
دے سیّن کی صورت دکھا۔ تو اس کے دانت اپنے ذرا
یاسین۔ کیا پڑھوا رہا۔ قاتل مرے بالیں پہ ہے
بلبل کا دل ہے خوں نشاں۔ ہیں عشق کی نیرنگیاں
سرخیٔ رنگِ گل کہاں۔ یہ دامنِ گلچیں پہ ہے
حرفِ زبانی ہو کہ خط۔ قول ان کا سچ ہو یا غلط
میری تو اب تسکیں فقط۔ اے دل تری تسکیں پہ ہے
ہے خوشۂ انگور یا۔ کرتا ہے دل پر آبلہ۔

مژۂ تر پہ اسے ذکر جو شب آئے آنسو
شدتِ گریہ سے مو بر سرِ مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوڑتا تیروں کو ترے
کھینچے بھی دل سے جو سوفار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق سے کیا بار ور اللہ اللہ
یہ ثمر لائے کہ سرو نب جو ٹوٹ گئے

کہہ یہ تبدیلِ قوافی غزل اک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے جھلاتا ہے تو ٹوٹ گئے

کس کے موشانہ ہیں اے دستِ ہوس ٹوٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشہ۔۔ تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
اے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آئنہ پا یہ بے مژگاں پیدا
پاؤں میں پہنچ سے مرے خارِ زبں ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کٹی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اب کے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو اسیرانِ قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

رونگٹے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پہ بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

تو گرفتارِ قفس گر یونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم۔ ایسی ہوئی گم آواز
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے

ہم اول ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ ولادت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دود آلود سمجھے
کہ تھے عشق جلوائے بے دود سمجھے

تری مانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے رحم۔ دل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آگے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم ان پر
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم اے ذوق یہاں سود سمجھے

کیا ہے وعدۂ دیدار کس نے | کہ ہے مشتاق اک عالم ابھی سے

ہوا جانا تجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خرم ابھی سے

حالتِ نشہ میں دیکھنا اُس بےحجاب کی | ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی
کوچہ میں آپڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم | یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی
قاصد جوابِ خط مری دیجیو مجھے | پر منتظر ہیں آنکھوں میں خط کے جواب کی
نکلے ہو میکدہ سے ابھی منہ چھپا کے تم | دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

اے ذوق ہیں نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقت ہو حق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغازِ شباب کا ہے۔

قفلِ صدخانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے | جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے
خارِ غم دل سے کسی طرح نہ نکلا اے عشق | ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے
چارہ گر سوزنِ تدبیر میں کچھ اور نہیں تار | جیب کے تار جو تھے ہو کے رفو ٹوٹ گئے
سینکڑوں کاسۂ سر دہر میں مانندِ حباب | کچھ اے چرخ نہ تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے
تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے | ہاتھ کیا اس کے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم | رات یاروں کے وہاں غسل و وضو ٹوٹ گئے
کیونکہ بن کشتیِ مے کیجیے سیرِ دریا | میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے
دیکھ کر سرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں | ہیں صنم خانوں میں زنار نگاہو ٹوٹ گئے
تیرے ہاتھوں میں ہے رنگِ گُلِ بازی آخر | بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے
چشمِ مخمور کے اک جام میں سب یاروں کے | رات سررشتۂ اعمالِ نکو ٹوٹ گئے
تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دل سے | تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے
کیا بیاں تم سے کروں زورِ شکستِ دل کا | کہ مری خاک سے بن بن کے سبو ٹوٹ گئے

صورت دکھائے اپنی دکھیں وہ کس طرح سے
آواز بھی نہ جس نے ہم کو کبھی سنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا نہ اس نے ہم کو کھوٹی کھری سنائی

ہنگام بوسہ گرم جو وہ اک ذری ہوئے
شکر تو کی۔ پسینہ سے شکرتری ہوئے

ثبت اس بیاض چشم میں ہیں خطِ سبز سے
جدا انتخاب نسخۂ افسوں گری ہوئے

دکھلائے ہم نے لے کے جو دامن پہ دُرِ اشک
قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

اک خال زیرِ زلف سے ظاہر ہے لئے
اے یار سوتا نقطۂ بد اختری ہوئے

جل جائے خاکِ وحشی چشم بتاں پہ گھاس
لیکن ہرن کھری[1] نہ رہے بن ہری ہوئے

کچھ رہتے آدمیت اگر رہتے آدمی
یہ نو روش تو حور ہوئے یا پری ہوئے

ہم جیتے جی جہان سے معدوم ہو گئے
اتنے نظر سے گم بسبب لاغری ہوئے

رسوا نہ ہوتے کرتے نہ گر جیب و سینہ چاک
ہم آپ اپنی باعثِ پردہ دری ہوئے

مطلب نہ کفر سے ہے نہ اسلام سے ہے کام
دل دیکے اے صنم تجھے سب سے بری ہوئے

طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہمقریں
ہر چند سو قرآن مہ و مشتری ہوئے

اے ذوق آج سامنے اُس چشم مست کے
باطل سب اپنے دعویٔ دانش وری ہوئے

غزل مرقوم الذیل پر نظرِ ثانی کی شعاع نہیں پڑی۔

اک صدمہ دردِ دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن بلا سے یار کے زانو پہ سر تو ہے

آتا ہے اُن کا گرچہ قیامت پہ منحصر
ہم خوش ہیں یہ کہ آنے کی اُن کے خبر تو ہے

بے سر شہیدِ عشق کا زیبِ سنانِ یار
صد شکر بارے نخلِ وفا بارور تو ہے

اے شمع دل سے رونے میں جلتا تو کیا ہوا
ہو جاتی رات اس میں بلا سے بسر تو ہے

[1] ہرن کھری ایک گھاس ہے۔ اس کے پتے کی شکل ہرن کے کُھر سے ملتی ہے۔ اس لئے یہ نام پایا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ عاشق وحشی چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے۔ قبر پر جو سبزہ اُگے گا جل جائے گا۔ ہاں ہرن کھری ضرور اُگے گی۔ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں۔ اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں۔

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلوہ سے چمن میں دل لے گل رو بڑھے
شاخ گلبن میں بڑھے گل گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد رنجش کے گلے ملتے ہوئے رکتا ہے جی
اب مناسب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں نے بڑھائے دشت میں
ضعف سے وحشت میں جوں شاخ سر آہو بڑھے

کہہ رہا ہے حسن کے دیوان میں خط پشت لب
ایک مطلع اور زیب صفحۂ ابرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت وگرنہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے

کچکاو دشمن وہاں شرارت سے جو ہم کاسے ہیں روز
چاہتے ہیں اور سرائے شوق آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی دی ہے دارو ئے فرحت فزا
جس کے اک قطرہ سے سیروں جسم میں لوہو بڑھے

یوں دم گریہ ہوا دل سے مرے نالہ بلند
جیسے جوش بالی کے باعث سر آب جو بڑھے

حق کی نیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جام جم سے قدر کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی تپش اور پھر بڑھے غیرت کے ساتھ
گرمی صحبت تری اے شوخ آتش خو بڑھے

جسم پر لاغر ہمارا توں بڑھے زانو گھٹے
حسن تیرا روز بر روز اے ہلال ابرو بڑھے

کچھ تپ غم کو مسیحا کیا نہ دم سے طبیب
روز بحرانی اگر غم نہ گھٹے گا ہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے الفت کی ان سے رسم و راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غم جاناں کی چشم و دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو ان سے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سنائی
رہ جاؤں سن نہ کیونکر یہ تو بری سنائی

مجنوں و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جب تک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سنائی

جس بات پر تمہاری سب عشق میں ہے پوچھو
ہم کیونکہ آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے
گالی کے ساتھ اُس نے ایک اور بھی سنائی

کیا جانے کیا کہیگا جب کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں ہے تجھ کو اب سے بے خودی سنائی

کہنے نہ پائے اس سے ساری حقیقت اک دن
آدھی کہی کہ سنالی آدھی بھی سنائی

ہے دل میں درد اگر نہیں ہمدرد میرے پاس
دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے

اے دل ہجومِ رنج و الم سے نہ تنگ ہو
خانہ خراب خوش ہو کہ آباد گھر تو ہے

اُس بُت نے غائبانہ کہا یا نہیں کہا
چُپ ہو گیا وہ بارے مجھے دیکھ کر تو ہے

تربت پہ دل جلوں کی نہیں گر چراغ و گل
سینہ میں سوزشِ دل و داغِ جگر تو ہے

کشتیِ بحرِ غم مرے حق میں ہے تیغِ یار
کر دی ایک دم میں ادھر سے اُدھر تو ہے

وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہوئے ذوق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

یہ غزل عنفوانِ شباب کی ہے نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے
بتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خطِ غبار مجھے
سمجھتے یارے کہ ہیں اپنا خاکسار مجھے

نگہ نے اُس کی مجھے سخت بیقرار کیا
بلا سے مار دے آکر کوئی کٹار مجھے

جمالِ یار نے مُڑ کر بھی دیکھنے نہ دیا
پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

تمہارے عشق میں ماہی سے تا بہ ماہِ فلک
دکھائی دیتے ہیں دلہائے داغدار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روزِ وصل پہ موقوف
تو کرنا کیا تھا نظر بند انتظار مجھے

عیاں ہے آئینہ رخ پہ جب سے خطِ غبار
وہ خط میں لکھتے ہیں اگر در خطِ غبار مجھے

ہوائے وادیِ وحشت مجھے موافق تھی
دکھا رہے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

نہ دیتا عشق اگر چشمِ اشکبار نے ذوق
جلا چکی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

لڑکپن کی غزل ہے۔ نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔

مرضِ عشق جسے ہوائے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

لوٹتے سیکڑوں نخچیر ہیں کیا یاد رہے
چیر دو سینہ میں دل کو کہ پتہ یاد رہے

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند میں دے لو گرہ تاکہ ذرا یاد رہے

قاصدِ عاشقِ سودا زدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

دیکھ بھی لینا ہمیں راہ میں اور کیوں صاحب
ہم سے منہ پھیر کے جانا۔ یہ بھلا یاد رہے

تیرے مدہوش سے کیا ہوش و خرد کی ہو امید
رات کا بھی نہ جسے کھایا ہوا یاد رہے

کشتۂ ناز کی گردن پہ چھری پھیر دے جب
کاش اُسوقت تمہیں نامِ خدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا مری اُس کوچہ میں
تجھ سے کہہ دیتا ہوں میں بادِ صبا یاد رہے

گور تک آئے تو چھاتی پہ قدم بھی رکھ دے
کوئی بیدل اِدھر آئے تو پتا یاد رہے

تیرا عاشق نہ ہو آسودہ بزیرِ طوبےٰ
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آجائیں جفا سے جو کبھی آپ تو پھر
یاد عاشق کو نہ کیجئے گا بھلا یاد رہے

داغِ دل پر مرے پھاہا نہیں ہے انگارا
چارہ گر کیجیو نہ جیسکی سے اُٹھا یاد رہے

زخمِ دل بولے ترے دل کے نمکخواروں سے
او بھلا کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

حضرتِ عشق کے مکتب میں ہے تعلیم کچھ اور
یہاں لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

گر حقیقت میں ہے رہنا تو نہ رکھ خودبینی
بھولے بندہ جو خودی کو تو خدا یاد رہے

عالمِ حسن خدائی ہے بتوں کی اے ذوق
چل کے بُت خانہ میں بیٹھو کہ خدا یاد رہے

چشمِ قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچے میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جس کا نہ بہا یاد رہے

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگا تا کہ پتا یاد رہے

خاکساری ہے عجب صنعت کہ جوں جوہرِ سنگ
ہو صفا اور دلِ اہلِ صفا یاد رہے

ہو یہ لبیکِ حرم یا بہ اذانِ مسجد
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس وعدہ فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی۔ اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ[1]
دیکھئے کب تک انہیں میری خطا یاد رہے

[1] حاشیہ دیکھو صفحہ ۲۲۰

ذوق اس لبِ شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا
کیا کہیے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

پری رو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
و لیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ جب واں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھونکے یہاں وقتِ سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسی کی فندقیں یاد آگئیں ہیں ورنہ مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خونِ جگر ایسے نہ ہوتے تھے

جو دیں تھیں گالیاں اس بد زباں کو آج کیا کہیے
کبھی نادم ہم اسکو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگِ عشق کھا کر زخمِ دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں نیشکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے اب کے جاں کا حضرتِ دل بیٹھے حیراں ہیں
پریشاں ورنہ جوں گردِ سفر ایسے نہ ہوتے تھے

کتابِ دل شرارِ عشق سے ہے جل اٹھی شاید
کہ مضموں سوزِ دل کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے آبلوں میں آب ہے یا آب داری ہے
کہ پہلے خارِ صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ تھے گزرے
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

زمانہ میں ہیں سنتے شور مدت سے قیامت کا
برابر قامت جو ہیں شور و شر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے شعر سن کر ذوق جیسے بزمِ عالم میں
ہوئے قائل ہیں اب اہلِ نظر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشقِ تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
نکالے پر ہے مثلِ ماہیِ تصویر پہلو سے

نہ لے اے ناوک افگن دلکو میرے چیر پہلو سے
کہ وہ تو جا چکا ساتھ آہ کے جوں تیر پہلو سے

دلِ سیپارہ کو ہے ٹانک تعویذ و نہیں ہیکل کے
نہ سرکا یہ حمائل اے بتِ بے پیر پہلو سے

وہ ہوں بے دست و پا بسمل رسائی جب نہ ہاتھ آئی
کیا تا پائے قاتل از تہِ شمشیر پہلو سے

اسیرِ زلف دیوانے ہیں بیٹھے اے پاسباں شب کو
دبا کر بیٹھو ان کے پاؤں کی زنجیر پہلو سے

مصورِ لیلیٰ و مجنوں کی ناکامی پہ حیراں ہے
کبھی بیٹھا نہ مل کر پہلوئے تصویر پہلو سے

یہ دل لب تشنۂ تیغِ یار کا ہے رات بھر کرتا
صدائے العطش جوں نالۂ شبگیر پہلو سے

عجب حسرت کا عالم تھا کہ مجنوں کہتا تھا ہیہم
چھٹے پہلو مرے محمل کا یا تقدیر پہلو سے

دو ورق ہیں کفِ حسرت کے دو عالم کا ہے علم
سبقِ عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے اے دل اُسنے
پر خدا ہے کہ اُسے نام مرا یاد رہے

طائرِ قبلہ نما بن کے کہا دل نے مجھے
کہ تڑپ کر تو بھی مر جائیگا جا یاد رہے

جب یہ دیندار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے
کاش اُسوقت انہیں نامِ خدا یاد رہے

ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد
بھول کر بھی کبھی ہووے تو وفا یاد رہے

محو اتنے بھی نہو عشقِ بتاں میں اے ذوق
چاہیئے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے
کچھ یہ بھی خبر ہے تری تقدیر میں کیا ہے

اے اہلِ نظر عالمِ تصویر کو دیکھو
تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے

ہے شانہ کہ میرا دلِ دیوانہ ہے الجھا
معلوم نہیں زلفِ گرہ گیر میں کیا ہے

پارہ کی جگہ کشتہ اگر ہو دلِ بیتاب
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اتنی چھری تیز
اب باقی بھلا اس ترے نخچیر میں کیا ہے

کچھ سلسلہ جنبانِ جنوں ہے ترا مجنوں
غل دیکھ بپا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

بیٹھا ہے درِ کعبہ پہ حیراں ترا شیدا
لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے

صیاد عبث گرد ہے تو اسکے شب و روز
تو دیکھ تو کچھ اس ترے نخچیر میں کیا ہے

ہے صیدِ نگاہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر
اِس تیر میں کیا لطف ہے اُس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا
کیا جانے دلِ عاشقِ دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں اور ہم تہِ خنجر
تاخیر ہو کیوں؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اُترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا
کیا جانے اُس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

زاہد کی طرح دیکھو نہ تم میرے دمِ ذبح
لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

۵؎ اسوقت خیابانی کاغذ بھی عمدہ کاغذوں میں تھا۔ غنیمت ہے۔ اب کشمیری تو باقی ہے۔ [illegible] برس کی کمر میں دنیا کی حالت ایسی بدل گئی ہے۔

پڑھی تھی۔ اُن کی شاگردی کا تمغہ ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

حذر ہے تم سے وحشتِ تمکیں ہے صنم پرے
برق ہے شاخِ سدرہ سے لوح و قلم پرے

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تھم پرے

کہتا ہے کس کو ناز سے تو دم بدم پرے
تو دو قدم کہے میں رہوں سو قدم پرے

بسمل ترے تڑپ کے بھی پہنچے نہ پاؤں تک
یا دو قدم ورے رہے یا دو قدم پرے

کیوں گرمِ اضطراب رہے اس جہاں سے شرار
ہستی سے کتنی دور ہے ملکِ عدم پرے

پھر کر جائے کعبۂ دل میں غزالِ یار
کہتے ہیں دیکھ رہیو غزالِ حرم پرے

قاتل جو تیرے ہاتھ میں پٹی ہو زہر کی
مرہم کو زخمِ دل سے اٹھا رکھیں ہم پرے

ہے موجِ ریگِ بادیہ۔ کیا ایک گام تاب
ہو گئے سوار کشتیِ نقشِ قدم پرے

یا رب کدھر کو جائے یہ جانبازِ دردِ غم
باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے

اتنا بھی دم نہیں ہے کہ تیرا مریضِ غم
سرکے نظر سے صورتِ نقشِ قدم پرے

ق

شب گھر پہ اُن کے غیر نے تو آ لیا تھا پر
دیوار و بام پہ رستے چڑھے ہم کہ دم پرے

لکھا اپنی شرحِ سوزِ دلِ بے قرار آج
آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجے رقم پرے

اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم
ہاتھوں سے جا پڑا مرے چھٹ کر قلم پرے

یہ کیا شبِ وصال۔ کہ دونوں بہم تو ہیں
پر ہم سے وہ ہیں بیٹھے پرے اُن سے ہم پرے

کعبہ نہیں۔ یہ کعبۂ دل ہے مقامِ دوست
رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے

تم آؤ گر تو آؤ۔ نہیں مجھ کو لو بلا
گھر سے تمہارے گھر ہے مرا کے قدم پرے

برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے ناز سے
مژگاں تک اسکی آ کے نگاہِ کرم پرے

میں نے کہا جو ان سے نکلتا ہے میرا دم
بولے خدا کے واسطے رکھئے یہ دم پرے

دیکھو نہ جاؤ حضرتِ دل زلفِ یار میں
رستہ نہیں ہے آپ کے سر کی قسم پرے

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوق
ہے اب تو یہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے

نہ کھینچا استخواں ان کو یہ عالم لاغری کا ہے / کہ ہے دکھلا رہا میرا دلِ دلگیر پہلو سے

خیالِ ابروئے جاناں نہیں دل بھولتا اک دم / سپاہی جیسے جدا کرتا نہیں شمشیر پہلو سے

تمام اہلِ سخن بزمِ سخن میں **ذوق** حیراں ہیں / ملا جو قافیہ تو نے کیا **تحریر** پہلو سے

برق تا میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی / کچھ جو خاکستر بچا آندھی اڑا کر لے گئی

اس کے قدموں تک شبِ بیتابی بڑھا کر لے گئی / ہائے دو پلے دست اور پھر ہٹا کر لے گئی

ناتوانی ہم کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر لے گئی / چیونٹی سے چیونٹی دانہ چھڑا کر لے گئی

صبحِ رخ سے کون شامِ زلف میں جاتا تھا؟ / اے دلِ شامت زدہ شامت لگا کر لے گئی

خون سے فریاد کے رنگیں ہوا دامانِ کوہ / کیوں نہ سوچ شیریں یہ دھبہ چھڑا کر لے گئی

تم نے تو چھوڑا ہی تھا اے مہربانِ قافلہ / لیکن آوازِ جرس ہم کو جگا کر لے گئی

نوکِ مژگاں سب ہوئی سینہ نگاہ وقتِ دوچار / پارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لے گئی

دیکھی کچھ دل کی کشش لیلیٰ کہ ناقہ کو ترے / سوئے مجنوں آخرش رستہ بتا کر لے گئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہمیں دم بھر کے بعد / بدگمانی ان کے گھر سو گھر پھرا کر لے گئی

واہ اے سوزِ دروں کوچہ میں اس کے برقِ آہ / رات ہم کو ہر قدم مشعل دکھا کر لے گئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا / کیا کہوں تقدیر اسے کیونکر اٹھا کر لے گئی

دشتِ وحشت میں بلوایا تھا کہ دیوانہ ترا / روحِ مجنوں بہرِ استقبال آ کر لے گئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو / آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لے گئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ / دل اڑا کر لے گئی یا پر لگا کر لے گئی

**ذوق** مرجانے کا تو اپنے کوئی موقع نہ تھا / کوئے جاناں میں اجل ناحق لگا کر لے گئی

عالمِ شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہیں

لہ لڑکپن کا کلام ہے۔ گر یہ پہلو خوب طرح بیٹھا ہے۔ جاننے والے ہی جانیں گے۔ اللہ کی قدرت ہے جس کو جب چاہے دیدے

دکھلاتا اک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ
اس سادہ پن کے ساتھ ترا بانکپن مجھے

جیسے کوئیں میں ہو کوئی تارا چمک رہا
دل سوجھتا ہے یوں تہِ چاہِ ذقن مجھے

آکر اسے بھی دو کبھی آنکھیں ذرا دکھا
آنکھیں دکھا رہا ہے غزالِ ختن مجھے

آ اے مرے چمن کہ ہوا میں تری ہوا
صحرائے دل ہوا ہے چمن در چمن مجھے

یارب یہ دل ہے یا کہ ہے آئینۂ نظر
دکھلا رہا ہے سیر و سفر در وطن مجھے

آیا ہوں نور لیکے میں بزمِ سخن میں ذوق
آنکھوں پہ سب بٹھائینگے اہلِ سخن مجھے

یہ غزل بھی آغازِ شباب کی ہے۔ مضمونِ مطلع بھی گواہی دیتا ہے:۔

مار کر تیر جو وہ دلبرِ جانی مانگے
کہہ دو ہم سے نہ کوئی دیکھے نشانی مانگے

اے ستم دیکھ کے ہر دم کی تری کم سخنی
موت گھبرا کے نہ کیوں یہ خفقانی مانگے

نوک سے تشنۂ دیدار کے سبزہ جو اُٹھے
تو زباں اپنی نکالے ہوئے پانی مانگے

مار پیچاں تو بلا ہیگا مگر تو اے زلف
ہے وہ کافر کہ نہ کاٹا ترا پانی مانگے

دہنِ یار ہوا اور مانگے کسی سے دل کو
وہ جو مانگے تو باندازِ نہانی مانگے

دل مرا بوسہ بہ پیغام نہیں ہے ہمدم
یار لیتا ہے تو لے اپنی زبانی مانگے

جلوہ اُس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ لے حسنِ معانی مانگے

نہ دیں گواہی جو داغِ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پہ چمن نہیں دیتے

جفا میں بات وہ کیا حکمۃً نہیں دیتے؟
کہ دردِ جاں ہمیں اب زخمِ تن نہیں دیتے

جو بولوں کچھ تو مجالِ سخن نہیں دیتے
سیوں بھی میں تو وہ سینے دہن نہیں دیتے

سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید
دکھا اُسے مرا داغِ کہن نہیں دیتے

ہیں منع کر رہے رونے کو یہ جو ناداں دوست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

یہ پڑ گئیں تنِ لاغر میں دھجیاں ہیں مرے
کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

تنگ ہو زیست سے ہیں تختۂ تابوت انہیں
مر کے اک تخت ہوا دار نظر آتا ہے

وُہ مضموں ہیں ترے ذوق زبس بیش بہا
کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے

---

دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گلبدن مجھے
ہر لالہ یاں ہے نافۂ مشکِ ختن مجھے

ہمدم وبالِ دوش نہ کر پیرہن مجھے
کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے

پھرتا لیے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے
زنجیرِ پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے

تسبیح دو ۔ بزم میں دیکھو امام کو
بخشی ہے حق نے زیبِ سرِ انجمن مجھے

اے میرے یاسمن[1] ترے دندان آبدار
گلشن میں ہیں دکھلاتے گلِ یاسمن مجھے

محرابِ کعبہ جب سے ہے تیرا خمِ کماں
صیدِ حرم سمجھتے ہیں ناوک فگن مجھے

ہے تن میں ریشہ ہائے نئے خشک استخواں
کیوں کھینچتا ہے کانوں میں آکے ضعفِ تن مجھے

لے لبِ مسی کو پھینک کہ نیلم ہے کم بہا
یاقوت دے دیا کوئی لعلِ یمن مجھے

ہوں شمع یا کہ شعلہ خبر کچھ نہیں مگر
فانوس ہو رہا ہے مرا پیرہن مجھے

اک سرزمینِ لالہ بہار و خزاں میں ہوں
یکساں ہے داغِ تازہ و داغِ کہن مجھے

بس دے تیشہ بولا جو چاہوں نہ تیرا خون
شیریں نہ دے خونِ سرِ کوہکن مجھے

رخ پر تمہارے دام جو ڈالا ہے سبزے نے
آتا نظر ہے دیدۂ عنقا دہن مجھے

یہ دل وہ ہے کہ کردے زمیں آسماں کو خاک
اک دم کو برق دے جو پہنا پیرہن مجھے

کوچہ میں تیرے کون تھا لیتا بھلا خبر
شب چاندنی نے آکے پہنایا کفن مجھے

دکھلاتا آسماں سے ہے روئے زمیں کی سیر
اے رشکِ ماہ تیری جبیں کا شکن مجھے

رکھتا ہے چشمِ لطف یہ کس کس ادا کے ساتھ
دیتا ہے جام ساقیِ پیماں شکن مجھے

ہے جذبِ دل درست تو چاہِ فراق سے
کھینچے گی تیری زلفِ شکن در شکن مجھے

---

[1] اس شعر کو پڑھکر ایک دن فرمایا کہ ایسے موقع پر اب تک زبانِ اُردو کے شاعر اے رشکِ یاسمن کہتے ہیں ۔ مگر خیر یہ بھی ایک انداز نکلا ۔ ہوگیا تو ہوگیا ۔ رہا تو رہا ۔"

خاک اُن زیست پہ جب سنگِ دَر اس کے ہوئے
مرکے ہم خاک میں جیتے تھے تو کیا پتھر تھے

میرے نالوں نے تو پتھر سے بہائے چشمے
اے بتو تم ہی پسیجے نہ ذرا پتھر تھے

کعبۂ عشق کا اے ذوق کیا ہے طواف
آئینہ خاک تھی اور سنگِ صفا پتھر تھے

دلیئے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مرکے کر خاک میں تو چھاتی پہ پتھر ہی دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاج شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھر سے گر ترے در پہ تھے تو کیا پتھر تھے

کہہ نہ بتخانہ میں اے شیخ بتوں کو دل سنگ
وہاں ترے کعبہ کے اندر تھے تو کیا پتھر تھے

کتنا رویا ہوں ولیکن نہ پسیجے وہ سنگ
سنگدل گر نہ ستمگر تھے تو کیا پتھر تھے

ساقیا خاک ہے گر شیشۂ دل میرا تو کیا؟
اور بلوریں ترے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے

سنگدل وہ رہے اے ذوق صداقت میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی
وہیں معلوم کروں ہونٹ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نے کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری
شکوہ کیا کیجے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پاؤں کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارۂ مصحفِ دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آتے پاؤں کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آکے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزنِ در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گھٹاتا ہے کبھی مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شب ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں اک نالے میں محشر میں برپا سو حشر
شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

تھے تمہی نکلے جو اس دامِ بلا سے اے ذوق
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آتے تو سہی

شہیدِ ناز کے چہلم پہ ہے نظر شاید
کہ سرمہ آنکھوں میں تم جانِ من نہیں دیتے

اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتہ یارو![۱]
بتا اُسے مرا بیت الحزن نہیں دیتے

عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گزر
کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

جو مانگا آبِ دمِ تیغ اُس سے بسمل نے
تو بولا - زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

بیانِ شیخ جو ہے وصفِ حور و شعلۂ طور
ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

وہ تیر کھینچے ہے پہلو سے کہہ کے اے دلِ زار
کہ ہے نشانیِ ناوک فگن نہیں دیتے

ہو اُن کی زلف سے کیا زخمِ دل کو چشمِ امید
لگا بھلے کو وہ مشکِ ختن نہیں دیتے

پڑے ہیں دامنِ کہسار و دامنِ صحرا
ترے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

زباں حلاوتِ اُلفت کا لے مزہ کہ نہ لے
لبِ یمی مدت گزرنے سخن نہیں دیتے

پلایا زہر۔ دکھایا ہے مے کا پیمانہ
یہ دھوکے اے بتِ پیماں شکن نہیں دیتے

سنبھال ناخنِ وحشت کو اب تو دستِ جنوں
کہ سینے پہ مرا پاک کفن نہیں دیتے

گلوں سے بن چکے جب دونوں ہاتھ گلدستہ
تو بولے ذوق بھلا تن بدن نہیں دیتے

---

اے صنم ہجر میں ہم جیسے بھلا پتھر تھے
سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے

وہ بھی دن یاد ہیں جب کوئے صنم میں اے دل
بسترِ خاک تھا اور تکیہ کی جا پتھر تھے

دلِ مجروح نے جو کھائے جنوں میں پتھر
اس کو وہ سنگِ جراحت سے سوا پتھر تھے

پوچھا اُس بت نے تو نکلی نہ زباں سے اک بات
حضرتِ دل وہاں کیا بارِ خدا پتھر تھے

جن دلوں نے ہے کیا چور مرا شیشۂ دل
اے بتو دل تو نہ تھے وہ۔ بخدا پتھر تھے

عمر بھر کھاتا رہا سرو قدوں کی دشنام
اس شجر سے مری قسمت کے سدا پتھر تھے

کون ہمدم شبِ غربت میں تھا بیکس کا ترے
یا تو سناٹا تھا یا دیتے صدا پتھر تھے

تھے دلِ سنگ میں جبتک تو رہے قطرۂ خوں
تاجِ شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے

---

[۱] یہ غزل بھی شاہ نصیر مرحوم کے عہد کی ہے۔ اُستاد مرحوم کی آخر عمر میں جانِ من اور یارو غزلیت کے دائرہ سے نکل گئے تھے ۱۲

# متفرقاتِ یا

زباں پیدا کروں جوں آسیا سینہ میں پیکاں سے
دہن کا ذکر کیا یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے

اُڑائے خوب گلچھرے نکل مجنوں نے زنداں سے
برستے پھول ہیں سر پہ شرارِ سنگ طفلاں سے

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشمِ فتاں سے
گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اُنکی مژگاں سے

چمکتی ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ باراں سے
لگی ابرِ رحمت کی جھڑی اب چشمِ گریاں سے

یہاں تک ناتواں ہیں ہم گزر جائیں اگر جاں سے
اُٹھائے مور لاشہ کو ہمارے دستِ مژگاں سے

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

---

سب کو دنیا کی ہوس خوار لیے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مُردار لیے پھرتی ہے

پھرتا سرگشتہ زمانہ میں بھلا کیوں خورشید
ہوسِ گرمیِ بازار لیے پھرتی ہے

وہ مرے اخترِ طالع کی ہے وارژوں گردش
کہ فلک کو بھی نگونسار لیے پھرتی ہے

کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قتل
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لیے پھرتی ہے

جا کے پھرنا نہ تھا اک بار جہاں-وہاں مجھکو
بے قراری ہے کہ سو بار لیے پھرتی ہے

---

کون وقت اے وائے گزرا جی کو گھبراتے ہوئے
موت آتی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے

آتشِ خورشید سے اُٹھتا نہیں دیکھا دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سلجھاتے ہوئے

وہ نہ جاگے رات اور یاں ضد سے بختِ خفتہ کی
بج گیا آخر گجر زنجیر کھڑکاتے ہوئے

چاک آتا ہے نظر پیراہنِ صبحِ بہار
کس شہیدِ ناز کو دیکھا ہے کفناتے ہوئے

یہ غزل بھی اسی زمانہ کی ہے ۔

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے
تم آتے آؤ نہیں نہ آؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہ دل ہے آئینہ تم ہو صورت نہیں ہے یہاں ام کو کدورت
کسی کو گھر میں بُلا بٹھاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

خلل بنانے مکاں کو پہنچے تو ہوگا نقصاں مکیں کو پہلے
مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

غلط ہے تہمت ہے افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے
کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

گئی ہے رات اب بہت زیادہ کدھر کا کرتے ہو تم ارادہ
نہ گھر کے جانے کی اب سناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اپنے رُخ میں ہو کر رہے دن ہو زلف میں شب کے عقدے گن گن
ہزار دل سے نہیں بھلاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

مکانِ دیدہ پسندِ خاطر اگر نہیں ہے کہ ہوں گے ظاہر
تو خیر تشریف تم نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اُس کو وہ داغ مثل لالہ دیا کرو بیٹھ کر اُجالا
بگاڑو تم اس کو یا بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہی زباں سے ہے ذوق کہتا تمہارا ہے دھیان ایسا بتا
جُدا مکاں اور کیوں بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

کیا وہ دنیا جسمیں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے
واسطے وانکے بھی کچھ پاس ہیں کے واسطے

خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے
اے سکندر رکھئے ؟ دو گز زمیں کے واسطے

ذوق عاصی ہے یہ اس کا خاتمہ کیجو بخیر
یاالٰہی اپنے ختم المرسلیں کے واسطے

سوزِ دل سے مرے نالے جو شرربار ہوئے
مدعی جل گئے اچھا ہوا فی النار ہوئے

ٹکڑے اُڑ جائیں قفس کے تو اُڑینگے نہ کبھی
ہم ہیں صیاد کی اُلفت میں گرفتار ہوئے

چمن دل سے ہوئے کم نہ گلِ لختِ جگر
دو اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے

رنگین کی غزل تھی ۲ شعر یاد رہ گئے :-

چھپا کے پھولوں میں منہ صبا سے جو مُسکرائے سحر کلی ہے
تبسم اُس گُل کا یاد کر کے عجب ہوئی دل کو بے کلی ہے

تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر
دکھایا تم نے جو روئے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

بنا لِلّٰہ چوب صندل سے میرا تابوت اے عزیزو
کہ قتل مجھکو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

فرماتے تھے ہمارا لڑکپن تھا۔ مشاعرہ میں طرح ہوئی۔ ہم نے بھی غزل لکھی تھی:-

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائینگے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائینگے پر جائینگے

لیک جب زیرِ زمیں ہم دیدۂ تر جائینگے
خشک ہیں جتنے کنوئیں پانی سے سب بھر جائینگے

ابر رحمت ہے پچھے اسد مر لگا دے تو بھری
کہتے ہیں جانے کو وہ دیکھیں تو کیونکر جائینگے

ن نالۂ دل مرے سو بار شرربار ہوئے ۔ پر جو سرگرم شرارت تھے نہ فی النار ہوئے

پیشوائی کو بڑھے گر کششِ دل آگے
دور ڑے مجنوں کی طرف ناقۂ محمل آگے
جاتے اس طرح سے اُس کوچہ میں ہیں یاں او ہم
دل سے ہم آگے کبھی ہم سے کبھی دل آگے
گرچہ ہے وادیِ عنقاء سے پرے سو سو قاف
لیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے
تجھ سا ناقص ہی غنیمت ہے اب اس وقت میں ذوق
کاملیت ہے کہاں ہو چکے کامل آگے

ناقص کا صفا کیش سے مطلب نہ بر آئے
جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے
فردوس میں ذکر اُس لبِ شیریں کا گر آئے
پانی دہنِ چشمۂ کوثر میں بھر آئے
بتخانہ میں گر آہ کروں عشقِ صنم سے
ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے
ممکن نہیں کم ہووے تپِ سوزِ محبت
جوں شمع مجھے لاکھ پسینا اگر آئے

نعل جب شکلِ مہ نو ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے
بوسہ کے مانگتے ہی پھیرنے چتون کو لگے
ایسے کیا لعل لب غیرتِ گلشن کو لگے
آشیاں ہو جیو مرغان ہوا کا برباد
بند کرنے تری دیوار کے روزن کو لگے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے
بے درد اگر دل بخدا بھی ہے تو کیا ہے
آزارِ محبت کا مزہ کیا کہوں جس کی
ہے درد دوا۔ دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے
سیراب نہ ہو جس سے کوئی تشنۂ مقصود
اے ذوق جو وہ آبِ بقا بھی ہے تو کیا ہے

گر رُخ کا بوسہ دیتے نہیں لب کا دیجئے
ہے مثل وہ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی
فرہاد ضربِ تیشہ سے ہے سخت ضربِ غم
سچ پوچھئے تو چوٹ ہیں دونے کڑی سہی
تم دو گھڑی کو آؤ تو میں لب پہ جان کو
ٹھہرا رکھوں کہ اور بھی یہاں دو گھڑی سہی

یاں لگ چکے سب یہ دل و جان ٹھکانے
اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے
کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد
آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

---

مرے حسنِ عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ۔ توبہ استغفار کرتی ہے
اگر انسان قانع ہو تو ہے اکسیر سے بہتر
ہوا و حرص لیکن اس کی ہی خوار کرتی ہے

---

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں وفا کے بندے
اس کو یقین کرنا گر ہو خدا کے بندے
مت بھول بندگی پر غرہ میں آ کے بندے
زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

---

ہم بتوں کو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائیں گے
یہ بڑے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے
دیکھیں تو کب تک نہیں کرتے ترے دل میں اثر
ہم بھی نالے اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے

---

کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے
ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے
کیونکہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار
چار آنکھیں ہوئیں مجھ قوت بینائی سے

---

کونسے دن نگہِ تیز نہ خونریز رہی
مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی
آتشِ عشق تو ہے گلشنِ جنت کی ہوا
ہاں مگر آتشِ دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی

---

ہم کو کیا یاں راہ پر ہے یا کوئی گمراہ ہے
اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے
کیا بشر مانند یوسف کیا بشر ہاروت وار
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیر چاہ ہے

---

لہ مری طاعت
لہ نفی ہو دے دو عالم سے

رنگین کی غزل ہے۔ والد مرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے۔ ۳ شعر ہی یاد تھے۔

گر زرد ہے کھونا دلِ مضطر سے کسی کے — بالی تو بلا وار کے سر پر سے کسی کے
دل میں ہیں تڑپا اُسے کہ جو بس میں نہ آیا — جادو سے نہ ٹوٹنے سے نہ منتر سے کسی کے
اللہ کرے یاں بھی ہو یونہی زمیں کا — جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

---

جو دل کہ کشمکشِ طرۂ دوتا میں پڑے — تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے
ہوا ہے سایۂ طوبیٰ نہیں ہے مستوں کو — رہیں گے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے
بتوں کے دزدِ نظر سے دلِ مسلماں — یہ چور وہ ہیں کہ جو جا کے خدا میں پڑے

---

ایک کلک آہ بس ہے شرحِ غم کے واسطے — کون نیزے واسطی ڈھونڈے قلم کے واسطے
سر تو ہے تن پر مرے تیغِ ستم کے واسطے — پر لگا رکھتے ہیں وہ جھوٹی قسم کے واسطے

---

تم بیٹھے بغل میں ہو رقیبِ بغلی کی — کی گرم بغل ہمنے بھی گو بغلی کی
اے ذوق نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت — کیا کام تبرّا کو محبت میں علیؑ کی

---

مقابل اس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے — صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے
وہ دم میں کھینچتا ہوں میں آہِ آتشیں اے ذوق[1] — کہ برق دیکھے تو فی النار و السقر ہو جائے

---

اسیری پہ ترستا ہوں اے قمری از بس — جدا تن سے ہوئی گردن نہ اترا طوق گردن سے
مجھے گہوارہ بھی تھا کشتیِ طوفاں زدہ آسا — رہا جوں طفلِ اشک آفت رسیدہ میں تو بچپن سے

---

لہ ہمارے سینہ میں وہ آہِ آتشیں ہے ذوق

رہی اس طرح بعد از مرگ دنیا کی ہوسناکی
شرابی کر کے توبہ جس طرح ہو جائے تریاکی

راتوں کو نہ ہو حق کرا ے شیخ مناجاتی
سوتے ہوئے چونکیں گے رندانِ خراباتی

کیا ہم سخنی کرتا ہے اُس گُل کے دہن سے
غنچہ سے یہ کہدو کہ چٹخ جائے چمن سے

قطرہ قطرہ آنسوؤں کے طوفاں شدت ہے
ٹکڑے ٹکڑے دل جو پڑا ہے تودہ تودہ حسرت ہے

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بتِ گمراہ بھی چاہے
ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

کل کے جو وصل کے عالم میں نظر میں پھرتے
آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ہم اور غیر یکجا دونوں بہم نہ ہوں گے
ہم ہونگے وہ تو نہ ہونگے۔ وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

جنوں کے دستِ مبارک میں پیرہن کو لگے
رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

لاشہ کو دفن کیجے میرے کہ پھینک دیجے
مردہ بدستِ زندہ جو چاہیے سو کیجے

معلوم ہوا بھنی وابروے بتاں سے
اک تیر ہے گویا کہ چڑھا ہے دو کماں سے

عزیز و ناقۂ لیلیٰ کے دیکھو گے خستہ غمزے
کہاں ہم۔ اور کہاں غم سیکشو نکو غم سے کیا نسبت

اگر ملجائیگی مجنوں کو خدمت ساربانی کی
مگر اے حضرتِ دل آپ نے یہ مہربانی کی

---

یہ دو شعر سب سے اخیر کلام ہے۔ اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ حافظ ویران نے کئی دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اس محاورے کو کیونکر باندھیں۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بیماری کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ فرمایا۔ حافظ تم نے اُس دن کیا کہا تھا؟ پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھ سے کہا لکھ لو یادداشت میں سے

رہے خاطر نہ بے شغل محبت کیونکہ بند اپنی
زمیں کیا ہے؟ فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے

کلید قفل دل فریاد ہے مثل سپند اپنی
ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

---

جو دل سے اپنے دمِ آتشیں نکل جائے
ستم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم

فلک کے پاؤں تلے سے زمیں نکل جائے
الٰہی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے

---

اُٹھا تا عشق کی کیوں لے لیا دان جوکھوں ہے
ابھی تو مال جوکھوں ہے پھر آگے جان جوکھوں ہے

---

پیش آ اکرام سے ساری کرامت ہے یہی
عادتِ بد ترک کر تو خرقِ عادت ہے یہی

---

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں ال اللہ کے
طفل مکتب بنتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

---

لحد کو چاہیے یوں پیر پشت خم دیکھے
سرا کو جیسے تھکا اونٹ دمبدم دیکھے

---

پلا مے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری
خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

وہ لعلِ شیریں کسی کے دل کی الٰہی کیا ہو گیا دوا ہے؟
کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو گیا ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے
خاک میں جب مل گئے دونوں برابر ہو گئے

اب ہے جا زیرِ مغیلاں ترے دیوانوں کی
مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جانے
یہ دردِ سر ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے
بہہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے

کوئی جو اس کو پڑھ کر عاشق کا خط سنائے
اک حرفِ مدعا پر سو بے نقط سنائے

لاشے کے ساتھ بھی نہ مری قبر تک چلے
ہوتے ہی اذنِ عام کے گھر کو کھسک چلے

نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے اک دم ٹھہرتی ہے
ترے بیمارِ غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

ناخن سے منقار کی میرے داغِ جنوں کو زاغ کھجائے
عشق یہ تیری فطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

چاہیے زر ان بتانِ سیم تن کے واسطے
یاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کے واسطے

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پہ پیمانہ ہے
ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے

| | |
|---|---|
| بیقراری کا سبب ہر کام کی امید ہے | ناامیدی سے مگر آرام کی اُمید ہے |
| اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے | لگا یا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے |
| باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی | کالا کرے گا مُنھ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی |
| عیاں ہے اشک کی گرمی ہویدا سوزشِ دل ہے | کہ آتا اپنا اشک سوختہ مانندِ فلفل ہے |
| دردِ دل سے لوٹتا ہوں میرا کس کو درد ہے | میں ہوں لفظِ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے |
| دل گرفتار ہوا یار کی عیاری سے | ہم گرفتار ہوے دل کی گرفتاری سے |
| جو کہوگے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یوں ہی سہی | آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یوں ہی سہی |

جس در پہ یہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی
عقل سحر اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

رازِ درونِ خم سے کسے اس پردہ میں آگاہی ہے
یوں تو ہر اک زعم میں اپنے افلاطونِ الٰہی ہے

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا مُن سُن اپنے
کرکے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن[۱] اپنے

بیارِ غم جو اُس کا کھا کر زمین دیکھے
خوش خوش وہ مقبرے کی جا کر زمین دیکھے

کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے
ملتی اس پر کفِ افسوس ہے مقراض کہ ہائے

وحشت اگر پتنگ کو ہووے گی داغ سے
زنجیر گھنگھرو کی ڈالیں گے دو چراغ سے

تری عمر دو روزہ غافل ایک پتلی ہے دو کل کی
کہ اک کل روزِ آخر کی ہے اک کل روزِ اول کی

دکھانے کو نہیں ہم مضطر حالت ہی ایسی ہے
مثل ہے رو رہے ہو کیوں کہا صورت ہی ایسی ہے

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی
پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی

جو تیرے ناخنِ پا تیر امائل دھو کے پی جائے
تو اُس کے دست و پا پھر ماہِ کامل ہو کے پی جاوے

جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے
یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

[۱] کتب تصوف میں لکھا ہے کہ جب انسان کو بہت ہنسی آئے تو ناخنوں کو دیکھنے لگے ہنسی تھم جائے گی سبب اس کا یہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدمؑ بہشت سے نکلے تھے تو ان کا جسم مبارک ایسا صاف اور روشن تھا جیسے ناخن - دنیا میں آکر بدلنا شروع ہوا اور اولاد کا رنگ بدلتے بدلتے ایسا ہو گیا کہ ظاہر ہے - جب انسان ناخنوں کو دیکھتا ہے تو روحانی آگاہی سے دل متنبہ ہوتا ہے اور افسوس میں ہنسی جاتی رہتی ہے - ۱۲ اُستاد رحمۃ اللہ علیہ

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی
ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

مصروف چارہ دیکھا کیا چارہ گر کو میرے
مرچیں سی لگ رہی ہیں زخم جگر کو میرے

مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی
جو کچھ کہ تھی مُراد محبت میں مل گئی

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

لال کتاب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے
میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے

کیا تاب دل جلوں کی جو برق لاگ رکھے
دوزخ بھی ہو تو اُن کی جلوں پہ آگ رکھے

کرے کعبے میں کیا جو سرِ بتخانہ سے آگہ ہے
یہاں تو کوئی صورت بھی نہاں اللہ ہی اللہ ہے

ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے
بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پاے مردی سے

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے
کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یونہی اک ہیولا ہے

خاک اُڑاتا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے
پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی بولائی پھرے

جہاں دنیا میں دیکھا سچ کے اوپر جھوٹ سابق ہے
کہ پہلے صبح کاذب ہے تو پیچھے صبح صادق ہے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے ۔ فرمایا قلعے سے آتا ہوں ۔ مرزا شاہرخ[1] آج کہنے لگے کہ بھئی اُستاد تم نے مولوی صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سُنایا تھا۔ اُنھوں نے کہا "شنود نہیں "شنید" چاہیئے ۔ اسی وقت مجھے شعر یاد آیا ۔ میں نے کہا مولوی صاحب تعجب ہے کہ ایسا کہا ہو ؎

گر عشق نبودے و غم عشق نہ بودے
چندیں سخن نغز کہ گفتے و شنودے

مطلع مرقوم الذیل میں خدا جانے بادشاہ کو کیا پسند آگیا تھا۔ اُستاد فرماتے تھے کئی دفعہ حضور نے اس کے مضمون کو ہیر پھیر کرکے لینا چاہا۔ ہم نے ہر دفع اپنے مطلع کا پہلو بچا دیا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اُستاد نے ایسا کیا ورنہ اُن کا یہ طریقہ نہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ سبب بھی پوچھا۔ فرمایا خدا جانے جب ہوا کچھ ایسا ہی خیال ہو گیا۔

کیا کہوں اُس ابروئے پیوستہ کے دل میں ہے پیچ
ایک حلقہ پیچیدہ دو کشمکش آپس میں ہے

ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالم شباب تھا۔ ایک بزرگ کہن سال نے کسی پُرانے شاعر کا مطلع سُنایا ؎

آبلے دکھلائے جب اس لب رنجور نے
دانتوں میں تنکا لیا خوشہ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اُسی وقت یہ مطلع ہوا ؎

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اکٹھے ہو گئے
خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہو گئے

اُس زمانے کے لوگ بڑے بالانصاف ہوتے تھے سُنکر بہت تعریف کی ۔

## قطعہ

کہوں کیا ذوق احوال شب ہجر
کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے

نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر
مرے بخت سیہ کی تیرگی نے

تپ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم
اور آتے تھے پسینوں پہ پسینے

[1] مرزا شاہرخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہدِ وقت سے چھوٹے تھے ۔ وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے ۔

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے
تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر
سو بھی آ کر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

اس شعر پر خاتمہ اُن کا اور اُن کی شاعری کا ہو گیا۔

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

سنہ ۱۸۳۲ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی نام ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں مر گیا۔ حسین بھی تھا اور بادشاہ کو بھی اُس سے محبت تھی۔ رنج ہوا۔ اور ایسا ہوا کہ کئی ہفتے تک شعروں میں غلطاں رہا۔ انہی دنوں میں اُستاد مرحوم ایک دن قلعہ سے پھرتے ہوئے والد مرحوم کے پاس آئے۔ مجھے یاد ہے اول بادشاہ کے ملالِ طبع کا حال بیان کیا۔ پھر ایک مطلع سنایا۔ کہ اُسی وقت غزل درست کر کے آئے تھے۔

گل کچھ تو اُس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے
وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کُملا کے جھڑ پڑے

پھر کہا ردیف مناسب مقام نہیں۔ اور ذرا سوچ کر آپ نے مطلع پڑھا اور خود کتاب یادداشت میں لکھ دیا۔

گُل بھلا کچھ تو بہار اے صبا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

یا اللہ۔ کیا وقت تھے اور کیا کیا موقعے پیش آتے تھے۔ پھر فرمایا حضور کا ایک قطعہ بھی درست کر کے آیا ہوں۔

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسبِ حال
دیکھے تماشے میں نے جو ملکِ وجود کے
اک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دُود کے
پھر یہ ہوا گزرنے لگی کھیل کود کے

اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفرؔ
باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی
تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہوا پیوست

رہا وہ خدمت مُرشد کی قید میں برسوں
کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست

گر ایک عمر میں پہنچا مقام عالی پر
کہا یہ شوق نے ہو ہمت بلند نہ پست

جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اُس کو
تو یہ ارادہ ہوا اور بھی ہوں بالا دست

ہمیشہ جنگ رہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجے شکست

جو ہوشیار رہے تو ہے وہ شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست

نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکل جائے کوئی کر کے جست

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اُسکی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدہٗ زہمہ - با خدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم
مثل نرگس حیرت تلکسا ہے اس چمن میں چشم وا

آخرش ہوگا دہی اکدن خزاں کے ہاتھ سے
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا

ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگ بہار
پھر کہاں یہ گلشن اور گل - اور سبزہ یہ ہوا

در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت
ایں تماشائے جہان امفت می بنیم ما

# رُباعیات

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا
جو کچھ کہ ہوا - ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

---

اعلیٰ جو علیؑ کی ہے امامت کا مقام
رکھتے ہیں خبر اُس سے یہاں خاص نہ عام
جو لوگ صفِ اولِ میثاق میں تھے
پوچھے کوئی اُن سے کہ وہ کیسا تھا امام

یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے — کہ او بے مہر بد اختر کمینے
کہاں تو اور کہاں یہ شب گزرتے — مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا ظلمت کے پردے سے نکلے ظلم — ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے تجھے آج — پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے — قرینے سے ہوے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر — پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گہ بٹھایا — مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جاں کنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوع صبح سے منھ روشنی نے
کہا جی نے تجھے یہ جیسے کی رت — نہیں ہے صبح تک دیگی نہ جینے
لگے پانی چوانے منھ میں آنسو — پکڑ لی پائیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریب خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی بارے کسی نے
بشارت مجھ کو صبح وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

کل ایک تارک دنیا سے میں نے پوچھا ذوق — کو توڑ کے ادھر سے ادھر ہوا پیوست
گزرتی ہوگی بآرام زندگی تیری — کہ تجھ کو اب نہ غم نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اس نے کہ قید حیات میں انساں — کبھی نہ ہوگا دل آسودہ گو ہو مست الست
اٹھائے ہاتھ جہاں سے و لیک کیا امکاں — کہ با فراغ کرے کنج عافیت میں نشست

| | |
|---|---|
| ان آنکھوں سے روئے لالہ گوں بھی دیکھا<br>کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوق | اور پھر ان کو پُر اشکِ خوں بھی دیکھا<br>یوں بھی دیکھا جہاں میں دوں بھی دیکھا |
| دُنیا کے الم ذوق اُٹھا جائیں گے<br>جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے | ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائیں گے<br>اب جائیں گے اوروں کو رُلا جائیں گے |
| دل جن کا ہے آہن کی طرح سخت و سیاہ<br>بد اصل کو کیا نام خدا کوئی بتائے | وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ<br>بندوق کا طوطا نہ کہے حق اللہ |
| اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی<br>ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے | دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی<br>جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی |
| مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا<br>ہم پیروِ عشق و عشق اپنا ہادی | اس وحشیِ رم دیدہ کو کیسا رمنا<br>جو عشق کہے ذوق کہو سلّمنا |
| کھلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں<br>کیسے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے | ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں<br>کل حزب بما لدیھم فرحون |
| اے زاہد، تم سے کیا جھگڑا کروں میں<br>میخوار و صنم پرست کہیے تو مجھے | غصّہ سے کروں کس لیے دل کو خوں میں<br>تم ہو تم ہو۔ جو کچھ کہ ہوں میں۔ ہوں میں |

سبطین نبیؐ یعنی حسنؑ اور حسینؑ
زہرا و علیؑ کے دونوں وہ نور العین
عینک سے ہے تماشائے دو عالم کے لیے
اے ذوق لگا آنکھوں سے انکے نعلین

---

دل کو سر بازارِ جہاں کر نہ اُچاٹ
جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ حصے
سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

---

جب تک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے
سب کہتے تھے اُن کو آپ ایسے ایسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے اے ذوق
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون۔ ایسے تیسے

---

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
اِک دم نہ ترا صرفِ مناجات ہوا
جب تک تھا جوان تھا جوانِ بدمست
اب پیر ہوا۔ پیرِ خرابات ہوا

---

آنکھ اُس کی نشہ میں جب گلابی ہو جائے
صوفی اُسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ روئے کتابی اے ذوق
سب مدرسہ کافرِ کتابی ہو جائے

---

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل
اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہِل ہِل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے
اے ذوق بڑھاپے سے ہے دانتا کِل کِل

---

اے ذوق فرشتے ہیں یہ کہکر روتے
اے کاش کہ انسان ہی ہم بھی ہوتے
غفلت میں یہ رہتا ہے یہاں تک ہُشیار
شیطان کے چلا دیتا ہے سوتے سوتے

دل سے میں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام
دل کہو۔ جان کہو۔ جانیں ہیں اس بات کو سب

میں حضوری میں ہوں اس کی نہ کس طرح مدام
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیش عرب

ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازع تھا۔ اُستاد کے مزاج میں سلامت روی اور صلح جوئی بہت تھی۔ دوست کو مجبور کر کے صلح کروا دی۔ اور اس قطعہ سے اس کی کج لجوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھکو ملامت تو نہ کر
کس طرح میں عشق سے بیزار ہوں

بسکہ مجھکو عشقبازی کا ہے شوق
کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

نواب زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا لکھکر زرنگار کاغذ پہ لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھکر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں گزرانا۔

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادے جواں بخت کے سر پہ سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھکو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہو گا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی ہے کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

رُباعی[ل] مرقومۂ حاشیہ میں نے ایک دن اُستاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی اور تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے۔ فرمایا کاٹ دو۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے۔ فرمایا رُباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا۔ اچھا قطعہ کر دیتے ہیں۔

دُنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے — جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑیگا اس پیرہ زال کو — یہ پیرہ زال گر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جنکو اس وقت میں اسلام کا دعوے ہے کمال — غور سے دیکھا تو اے ذوق ہے اُنکا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر — نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق — ہے بُرا وہ ہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے — کیوں بُرا کہنے سے تو اس کو بُرا مانتا ہے

قدم سنبھال کے رکھ راہِ عشق میں اے ذوق — گزرنا اس رہِ دشوار سے نہ آساں ہے
جو کوئی آبلہ پا ہے مور بھی ہے یہاں — ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

نذر دیں نفس کس کو دنیا دار — واہ کیا تیری کارسازی ہے
سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق — مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

[ل] رباعی مرقومۂ ذیل دیوانِ مروج و مطبوعہ میں مؤلفوں کی بے خبری سے درج ہو گئی تھی۔ الحمد للہ کہ جو اس میں اصلاح ہوئی۔ بندہ آزاد کو یاد تھی۔ ایسی اصلاحیں ان کی ہمیشہ جاری تھیں۔

اے ذوق کرے گا کوئی دنیا کیا ترک — دنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا — جب تک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے — دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا
دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا **ذوق** ثناگر سہرا
جن کو دعوے ہو سخن کا یہ سنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اُسی وقت اُنہیں ملا۔ اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے اداشناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہوگیا کچھ۔ اور یہ قطعہ لکھکر حضور میں گزرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی — اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری — کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل — ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں — مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ۔ ہاں اس سے مدعا — جُز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زِرہِ امتثالِ امر — دیکھا کہ چارہ غیرِ اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری — ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ — کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

## مثنوی

نواب حامد علی خاں مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک شوقیہ خط کی استاد مرحوم سے فرمائش کی۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لیے کب فرصت دیتی تھیں

جبکہ اپنے میں سمائیں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک گوہرِ غلطاں کی چمک
کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا

تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگِ ابرِ بہار
لائیگا تاب گرانباریِ گوہر سہرا

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرہ کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع کو دیکھکر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ اُستاد مرحوم جو حسب معمول حضور میں گئے تو وہ سہرا دیا کہ اُستاد اسے تو دیکھو! انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی۔ پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا تم بھی ایک سہرا کہدو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ ابھی لکھدو اور کہا۔ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی۔ حضور دیکھا۔ عرض بیٹھ گئے اور عرض کیا:۔

اے جواں بخت مُبارک ترے سر پہ سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک
کشتیِ زر میں مہِ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حُسن سے مانندِ شعاعِ خورشید
رُخِ پُرنور پہ ہے تیرے مُنور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ۔ یہ کہے سُبحان اللہ
دیکھے مُکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم
گوندھئے سورۂ اخلاص کو پڑھکر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی
گائیں مُرغانِ نواسنج نہ کیونکر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار
تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش
سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اِک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا
تیرا بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار
اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّہ ہے مزیّن تو گلے میں بدھی
کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دیں مہ و خورشید فلک
کھولدے مُنھ کو جو تو مُنھ سے اُٹھا کر سہرا

ہے فلک اک نمونہ قدرت کا ۔۔۔ یا قلمداں ہزار صنعت کا
رُخِ قرطاس کو صفائی دی ۔۔۔ اور سیاہی کو روشنائی دی
دیا قمری کو مصرعِ نالا ۔۔۔ مصرعِ قدِ سرو پر بالا
کی نو خطوں کو کلکِ ادا ۔۔۔ کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا
نمک افشاں ہے عشقِ شور انگیز ۔۔۔ زخمِ دل کرتے ہیں بریز بریز
عکس ہے سبزۂ لبِ جو کا ۔۔۔ وسمہ قوسِ قزح کے ابرو کا
آئے گلشن میں فصلِ گُل سو بار ۔۔۔ بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار
ساقیا جلد اُٹھ درنگ نہ کر ۔۔۔ عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اُتار لے شیشہ ۔۔۔ طاق پر رکھ کتابِ اندیشہ
شیشۂ مے کی یہ دراز زباں ۔۔۔ اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں
میں ہوں مانندِ ساغرِ لب ریز ۔۔۔ جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز
جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے ۔۔۔ پاؤں توبہ کے لڑکھڑانے لگے
ق
کر دے یا تک مجھے نشہ میں چور ۔۔۔ تا کہ مانندِ خوشۂ انگور
دل کے سارے پھپھولے پھوڑوں میں ۔۔۔ نکتہ باقی کوئی نہ چھوڑوں میں
شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی ۔۔۔ نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
بسترِ رنج و کنجِ تنہائی ۔۔۔ رات کیا آئی اک بلا آئی
شام سے حال ہے یہ صبح تلک ۔۔۔ نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بولتے فلک کے ڈھلو ۔۔۔ کیا شفق نے کھلا دیا سیندور
گر لکھوں خط میں بیقراریِ دل ۔۔۔ نامہ بر ہو کبوترِ بسمل
مضطرب اب جو ہو رہا دل ہے ۔۔۔ دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے
دل کی وا شد کی کیا کروں تدبیر ۔۔۔ غنچۂ دل ہے غنچۂ تصویر
جانِ بیتاب جیسی بیکل برق ۔۔۔ وہ بھی گرمِ رہِ فنا کا لبرق

مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں رمضان آگیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کردیے۔ ان کی زبان کب رہ سکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا۔ انہوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کردیا۔ اور کئی دن میں ۰۰ شعر ہوگئے۔ لیکن ادھر رمضان ہوچکا ادھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کردیں۔ مثنوی وہیں رہ گئی۔ بیچ میں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اُٹھی مگر ایک دن کبھی دو دن ۲۰ - ۲۵ شعر ہوئے۔ پھر رہ گئی۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا۔ تو اکثر اس کا ذکر کیا کرتے اور کہیں کہیں سے شعر بھی پڑھا کرتے۔ میرے بار بار کہنے سے اُسے نکالا تو دیکھا کہ ۲ تختیاں مشق اطفال کی تھیں۔ دونوں طرف سے سیاہ تھیں۔ اور کچھ کاغذی مسودے تھے۔ تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی نہ جاتی تھیں۔ فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچ کر بتاتے گئے میں لکھتا گیا۔ ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے۔ نامہ ناتمام تھا۔ مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا۔ میرے دامن کے ہوئے جز بھی اُنہی غزلوں میں تھے جو خلیفہ صاحب کے ہاں جاکر ضائع کیا کرتا تھا۔ سب کے ساتھ وہ بھی گئے اس کا نام "نامۂ جاں سوز" تھا۔ اول حمد و نعت تھی۔ پھر ساقی نامہ۔ پھر القابِ معشوق۔ اسی میں اس کا سراپا۔ اس کے بعد یادِ ایامِ وصل۔ اس میں چاروں موسموں کی بہار۔ معنوں کی نزاکت۔ لفظوں کی لطافت۔ ترکیبوں کی خوبیاں۔ اندازوں کی شوخیاں۔ کیا کہوں۔ سامری کا جادو اس کے آگے دھواں ہوکر اُڑتا تھا۔ چند متفرق شعر دیوان مطبوعہ میں ہیں۔ چند شعر مجھے یاد تھے یکجا لکھ دیتا ہوں کہ جو یادگار رہ جاوے وہی غنیمت ہے۔

## مثنوی

| | |
|---|---|
| چاہیے نام اُسی کا اے خامہ | زینتِ نامہ زیبِ سرنامہ |

# قصیدہ نمبر (۱)

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے:۔

سحر جو گھر میں۔ بشکل آئینہ۔ تھا میں بیٹھا نزار و حیراں
تو اک پری چہرہ۔ حور طلعت۔ بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت۔ چمن کی رنگت۔ گر اس کا شیوہ۔ تو اس کا جلوہ
زبان شیریں۔ بیان رنگیں۔ کلام رنداں۔ خرام مستاں
انیس خلوۃ۔ جلیس جلوۃ۔ حریف حکمت۔ ظریف صحبت
بہ بزم یاراں۔ بدل بہاراں۔ باہل عزلت۔ کلے بداماں
حسین بشکل و سر منور۔ عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو۔ نگاہ جادو۔ خدنگ مژگاں و چشم فتاں
بروے رنگیں۔ نگار بستاں۔ شگوفہ خنداں۔ کرے خنداں
ہوئے پیچاں۔ بے شکن تیچاں۔ جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب کج کلاہی۔ جو دیکھو بینی تو یا الٰہی
دہن میں غنچہ۔ لبوں پہ گل برگ و روے روشن پہ مہر تاباں
نگاہ ساغر کش تماشا۔ بیاض گردن صراحی آسا
وہ گول بازو۔ وہ گوری ساعد۔ وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں
کمر نزاکت سے لچکی جائے۔ کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اس پہ سو نور لہر کھائے۔ پھر اس پہ ہیں دو قمر فروزاں
وہ ران روشن۔ وہ ساق سیمیں۔ وہ پاے نازک حنائیں رنگیں
وہ قد قیامت۔ وہ فتنہ قامت۔ دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا۔ کہا خوشی ہوں۔ جو وصف پوچھا۔ تو دلبری ہوں

نبضیں چھوٹی ہوئی غشی طاری ‏ ایک فرقت ہزار بیماری
دل سے رخصت ہے تاب طاقت کی ‏ بیقراری نے استقامت کی
ہوس سیر باغ ہے کس کو ‏ دل ہے کس کو دماغ ہے کس کو
کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر ‏ سگ دیوانہ بن گیا ہے گھر
اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت ‏ تن بہ تقدیر سنگ آمد و سخت
ہو چکی دل کی اپنے عشق میں خیر ‏ رہوں دریا میں اور مگر سے بیر
ماہِ بے مہر ملکہ دشمنِ مہر ‏ ہر ستم میں ستم شریک سپہر
برق کا وہ ذرا چمک جانا ‏ اور بغل میں ترا دبک جانا
فتنۂ استاد نرگسِ فتاں ‏ گردِ مژگاں ہجوم شاگرداں
رخ تعالیٰ و زلف صلِ علیٰ ‏ قد وہ سبحان ربی الاعلیٰ
زلفِ جنباں میں رخ کی براقی ‏ کرے مشائیوں کو اشراقی
لو انا ربکم نہ منہ سے کہے ‏ لیک جاری زبان ہر موسے
مچھلی بازو کی یا ہے ذو العین ‏ غرقہ کش بحرِ خوں سے مردمِ عین
کمر و ناف از پئے دلِ زار ‏ رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

رنگِ پاں لعلِ روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر

ت زلف و رخسارہ دہ کر صل علی

تری سخاوت کا ٹن کے عالم - اُمنڈ پڑا ہے تمام عالم
عرب سے آیا ہے چل کے حاتم - بلب سوال و بدست داماں
جو آئیں جنبش میں لعل شیریں - چمک ہو اُن کی کلام رنگیں
جو حکم دیوے تو ہو دیں آئیں - تو ہنس کے بولے توگل ہو خنداں
جو ہو سوار سمند تازی - کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دور فلک کو بازی - بپائے گوئے و بدست چوگاں

(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)

وہ تیرا ہے فیل کوہ پیکر - کہ جس پہ کہتے ہیں سب نظر کر
فلک پہ دُم اُس کی دو اختر - و یا نمایاں ہیں اس کے دنداں

(یہاں چند شعر اور تھے کہ پڑھے نہ گئے)

ترا جو وصف خجستہ شانے - قلم کو کہاں ہے یارا؟
ثنا دعا پہ ہے ختم کرتا - جو ذوقؔ تیرا ہے تہنیت خواں
کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں - حسود ہوں سرنگون و محزوں
یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں - سدا بصد فرّ و شوکت و شاں

## قصیدہ نمبر ۲

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے - افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا - ورنہ عجب جلوہ دکھاتا - اکثر شعر اُس کے زبانی سُنا کرتے تھے - دل روشن ہو جاتے تھے - کئی شعر مسودہ موجودہ میں نہ تھے - بندہ آزاد کو اُن کی زبانی سُنے ہوئے یاد تھے وہ بھی درج کئے ہیں -

صبح سعادت نوید ارادت تن بہ ریاضت دل بہ تمنّا
جلوۂ قدرت عالم وحدت چشم بصیرت محو تماشا

سبب جو پوچھا تو مجھ سے بولا ۔ کہ ذوق تو بھی عجب ہے نادان
وہ شاہ جو ہے ۔ محمد اکبر ۔ جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوس جشن اس کا ہے فلک پر ۔ اسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں
یہ سنتے ہی میں نے زیب آیت ۔ لکھا وہ مطلع شفق سے شبا بہت
کہ جس کو سن کے حضور ۔ پڑھنے یہ تحسیں ہر اک سخنداں

## مطلع

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں ہے چتر بن بن کے ہوتا قرباں
کہ بخت اختر بہ صفت لشکر ۔ ہیں آج یکسر تبیع فرماں
وہ ہے ترا اختر ہمایوں کہ ہو کے روشن چراغ گردوں
بامر کو شب ہے شمع آسا ۔ بزیر فانوس چرخ گرداں
سحاب ہمت جو درفشانی کرے بہنگام حشم ۔ پانی تو
ہو موجیات سے پانی پانی ۔ ہوا یہ یکدست ابر نیساں
تری عدالت میں ہے یہ قدرت ۔ کتاں کو دیکھے نہ ماہِ روشن
دگرنہ ہالہ ہو طوق گردن ۔ کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں
جو تیغ برّاں کو تیری شاہا ۔ کرے علم تو بزور ہیبت
تو زیر داماں ابر چھپتا ۔ دکھائے جلوہ نہ برق رخشاں
یہ تیرا خنجر ہے یا کہ شہپر ۔ کہ جس کے لگتے ہی دم میں اڑ کر
قفس سے ہوتا ہے تن کے پراں ۔ ترے مخالف کا طائر جاں
ہے بید بستہ جہاں میں تیری ہمیوں ۔ رکھا بزرگوں نے شتر گردوں
کہ کل کے گاؤ زمیں نہ ہیبت ۔ کہیں بزیر زمیں ہو لرزاں
رکھے گا فغفور چینی خانہ ۔ تو حکم دے اے شہ زمانہ
بنا صفاہاں یہ آستانہ ۔ کہ بیٹھے دارا بجائے درباں

کانِ ملاحت بحرِ صباحت جوئے فصاحت گلشنِ راحت
شور میں لیلےٰ نور میں سلمےٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لبِ میگوں عارضِ گلگوں وہ قدِ موزوں چشم پُر افسوں
برگِ گلِ تر لالہ احمر سرو صنوبر نرگس شہلا
خال بلب ہے نقطۂ مشکیں۔ یا ہے ہلال و چشمۂ شیریں
مردمِ دیدہ محو بدیدہ لالہ پہ داغ و دل پہ سویدا
فوجِ نظارہ جوں رمِ آہو۔ آہوئے کعبہ نرگس جادو
چیں پہ جبیں محراب پہ کعبہ۔ طاق دو ابرو سجدہ اقصےٰ
چاہِ زنخداں آبِ زلال۔ اور اس پہ تکلم چشمۂ شیریں
ناصیہ روشن ہوں کف موئے زلف شکن در خطِ چلیپا
پان کی سرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوسِ قزح سے
دامِ برائے گردنِ عنقا چشم و چراغ دیدۂ حورا
بیت زلالی لب پہ تکلم۔ فردِ خیالی رنگِ تبسم
موئے میاں جوں معنیِ نازک تنگ دہاں سر ابۂ معما
عارضِ گلگوں چشمِ پُر افسوں سبزۂ تر سے طرۂ زلف سرے
پائے نازو۔ غمزہ طرازو۔ گلشن رازو۔ رازِ بدلہا
فتنۂ سراپا۔ محشر سرا۔ پشت و فا پیش و پشت جفا میں
شرم سے ڈوبا سر حیا میں۔ ناصیہ رو پر عالمِ بالا
رمز سے ہو کر صرفِ تکلم۔ ناز سے ہو کر لب پہ تبسم
مجھ سے کہا ہو زمزمہ پیرا۔ تو بھی تو بول اے بلبل شیدا
میں نے پڑھا اک مطلعِ روشن مدح میں تیرے جس سے ہو گلشن
روح معطر اے شہ عالم خوش ہو جہاں اور شاد ہو اعلیٰ

قصر رفیع و صحن وسیع و طرزِ صحیح سطحِ مربع
باغِ ارم یا روضۂ رضواں خلدِ بریں یا جنتِ ماوائے
مرغِ خوش الحاں بر سرِ بستاں ہر گلِ بستاں خرم و خنداں
گوشِ شقائق محوِ سرود و دیدۂ نرگس مستِ تماشا
لحنِ قماری شکلِ مسبح صوتِ عنادل وردِ مہلّل
سروِ بقامت نخلِ دعا و نکہتِ گل یا دمِ مسیحا
فصلِ ربیع و موسمِ اردی معتدل اک جا گرمی و سردی
میل عناصر سوئے طبائع ربط قوئے با عالمِ اشیاء
چہرۂ گلشن آتش رخشاں سرخیِ گل میں لعلِ بدخشاں
سبزہ پہ شبنم رشکِ جواہر لالہ پہ ژالہ لولوئے لالا
قلب کو فرحت روح کو راحت عقل کو قوت طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمۂ مطرب نالۂ چنگ و نشہ پہ صہبا
خندۂ گل پر نشۂ مُل پر سروِ چمن پر لطفِ سخن پر
نغمۂ بلبل نالۂ صلصل قہقہۂ قلقل بر لبِ مینا
غلغلہ اندر محفلِ مستاں وجد میں خیلِ بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں یار پہ آسا چنگ نوازاں شکلِ نگینا
جامِ بلوریں یا مے لعلیں صبحِ بہار و گلشنِ رنگیں
پنبۂ مینا پہ سرِ مینا اخترِ صبح و گنبدِ خضرا
ساقیِ مہوش مستِ شبانہ مطربِ دلکش صرفِ ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسم وقتِ سعید انوار سراپا
آں بتِ ترسا بادل سنگیں لعبتِ کافر با ہمہ تمکیں
صورتِ لات و شکلِ منات و رشکِ یعوق و غیرتِ عزّے

رو بہ رضا دُ لب بہ دعا و دست بہ ہمت پا بہ اقامت
لب بہ ہدایت دل بہ درایت صرف بہ زہد و محو بہ تقوےٰ
تو بہ حقیقت تو بہ طریقت تو بہ شریعت تو بہ ودیعت
پاک سرشت و نیک نوشت و بسمہ مظہر قلب مصفیٰ
رو بہ تجمل خو بہ تحمل کف بہ تکلف لب بہ تکلم
روکش یوسف ہمسر صالح ہمرہ موسےٰ ہمدم عیسےٰ
تیری محافظ آیۂ کرسی ۔ تیری معاون آیت قدسی
زیب تمایم سورۂ یسین حسن عزائم سورۂ طٰہٰ
جانب اعدا تو سر میداں کھینچ لے جبدم صارم بُراں
نعرہ ہو اس کا قتل ذ قتل ۔ ندیہ اس کا نحن قتلنا
جلوے تیرے ہوں نہ منور شام و سحر آفاق تو کیونکر
مہ ہو دوائے دیدۂ شپرمہر ضیائے حیرت حربا
تو دم فرحت تو دم عشرت تو دم نصرت بر سر دولت
ماہ نبرد طلب زرہ میداں تیر بہ قوس و شمس بہ جوزا
فہم ترا وہ عقل ارسطو بالعرض جس سے جوہر ثانی
عقل ترا دے درس فلاطوں فلسفہ جس کی ابجد اولیٰ
حال دو عالم تجھ میں ہے پیدا ۔ اور ہے یہ نور کشف ہویدا
غیب قیافہ غیر سرودہ غیب تفاؤل غیب بہ رویا
تیری شمیم خلق سے طاری ۔ تیری نسیم طبع سے جاری
باد بہاری مشک تتاری ۔ عود قماری عنبر سارا
فکر فرنگ و دانش یوناں آگے ترے ہے طفل دبستاں
تو ہے وہ ماہر ۔ تو ہے وہ باہر ۔ تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا

اے شہِ عالم درہمہ عالم۔ عالی اعلیٰ والی والا
لب پہ ستائش۔ دل پہ نیائش جلوہ طراز عرش معلیٰ
نقش خلافت از رہ رتبت تخت خلافت عرش پہ عظمت
تو ہے بحکم وجہ جو صورت وہ ہے پہ نفس رتبہ ہیولے
روح مجسّم عقل مکرّم نفس مقدس جسم مطہر
باطن صافی جان ہوائی پردہ پہ دنیا جلوہ پہ عقبےٰ
علم حقیقی علم مجازی تیرے حلول ساری و طاری
اصل مبانی نقش معانی عقل کو تیرے عیش بہت
سارے پڑھتے اسمائے الٰہی سب میں مؤثر اے شہِ اکبر
اسم جو اعظم ہے تو وہی ہے جس سے ہے تیرا اسم مسمّیٰ
فہم میں لیکر صافی طینت رکھ کے نظر میں اوجِ قرینت
عرق حیا میں زمزم و کوثر ہے زمیں میں سدرہ و طوبےٰ
خلق کریم و نقش نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقا و خاک شفا و نارِ خلیل و بادِ مسیحا
تو سرِ دنیا ظلِ الٰہی حکم ترا تا ماہ پہ ماہی
تحت ہے تیرا تا بہ ثریٰ۔ اور فوق ہے تیرا تا بہ ثریا
حکم پہ حاضر نظم پہ ناظر۔ تیرے جلوس جشن کی خاطر
فوجِ سکندر لشکرِ دارا۔ تختِ فریدوں مسندِ کسرےٰ
تجھ سے ہی قائم شام و سحر ہے۔ تجھ سے ہی دائم تازہ و تر ہے
بارِ مراد و برگِ نشاط و شاخِ امید و نخلِ تمنا ؛
تو بہ ریاست تو بہ فراست۔ تو بہ مقالت تو بہ سیاست
فطرت لحیاں لشکر جماعت حسنِ بیاض و غصنہ حمرا

پیش نظر ہے دور کا عالم سن تو سہی افلاک پہ بنے کیا
وردِ ملائک نامِ خدا ہے دیکھ زباں پر کس کی ثنا ہے
دل کہ سراپا دستِ دعا ہے۔ دست دعاؤ دامن شبہا
تاکہ زماں منضم بہ زمیں ہو۔ دور میں چترِ چرخ بریں ہو
شاہ کا عالم زیر نگیں ہو۔ سطح زمیں ہو عالمِ بالا

## قصیدہ نمبر ۳

یہ شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔ افسوس کہ نظرِ ثانی سے محروم رہا۔ آغاز جوانی کا کلام ہے

خضر نصیب کی گر دنیا میں رہبری ہو
اور شاہ راہ دل پر چشم سکندری ہو

منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں
روشن قلم سے میرے تاجِ سکندری ہو

ذرہ کی طرح چمکے ذرہ مرے سخن کا
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو

میں رستمِ معانی اور سیستاں سخن ہے
دیتا جو زور قسمت دل کو نہ داوری ہو

برگشتہ بخت اپنا گر آسے راستی پر
گردوں بھی سرنگوں پھر کرتا اپنی سروری ہو

یہ کہہ رہا تھا میں جو۔ یکبار عقل بولی
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی دلبری ہو

تجھکو خبر نہیں کیا ہے دورِ شاہ اکبر
رفعت سے پست جس کی شان سکندری ہو

بے فکر کیا جب ایسا فیاض ہو جہاں میں
اور دل کا اس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

مثلِ حباب جا کر باندھے ہوا افلاک پر
جس پر کہ اسکی چشم الطاف سرسری ہو

دربار میں تو اسکے ہو بہرہ یاب جا کر
بہروزی ہو وے میری اور تیری بہتری ہو

لیکن یہ رسائی اس وقت ہوگی روشن
جب خضر راہ تیری طبع سخنوری ہو

تو ہی تو سوچ دل میں تیرے در سخن کا
اس کے سوا جہاں میں کون آج دہر میں ہو

اس کی نظر جو جیں گر یہ تا بدار گوہر
پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو

تب بحر فکر میں دل غواص ہو کے اترا
معلوم تا کہ سب کو زور شناوری ہو

تیغ ہے تیری پیکرِ دشمن ۔ حلقہ بہ حلقہ جب ہو بہ جوشن
ہیں حکیماں کب ہے ثابت ۔ عقل سے جزوِ لایتجزّیٰ
زینت لوح شوکت و شاں تو زیب سر توقیع جہاں تو
اس پہ مزین جوں گل طغرے ۔ اس پہ تجلّی جوں خط امضا
حاتمِ دوراں منذر نعماں رستم دستاں شیر نیستاں
تو بہ سخاوت تو بہ عنایت تو بدم جرأت تو سرِ ہیجا
حسن ادائیں نکتہ موزوں ۔ طرز بجائیں ۔ گوہر مکنوں
شغل و عمل میں نظم مسجع ۔ حرف سخن میں نثر مقفیٰ
تیرا ہے توسن سایہ ذوالمنن ۔ بر سر جستن در دم رفتن
برق جہان و آب روان و شعلہ آتش موجہ دریا
باد بوقتِ تیز روانی ۔ ابر بوقتِ قطرہ فشانی
جب تو اُڑادے کوہ و جبل پر جب تو رواں ہو جانب صحرا
(یہاں سے دو شعر رہ گئے)
فیل ہے تیرا ابر بہاراں ۔ پر بہ خیالِ بادہ گساراں
ہو دے درخشاں برق بہ باراں دے جو ہلا زنجیر مطلّا
بحر بوسعت کوہ بہ رفعت ۔ پردۂ کوہ نور بہ ظلمت
اُس پہ طلوعِ جلوۂ طلعت ۔ طور پہ گویا نور تجلّیٰ
پشت پہ اُس ہودجِ زرّیں قوس قزح سے مستک رنگیں
تیرا طلوع اے خسروِ جاں اور صبح شفق میں کردے ہویدا
تھا جو سخن آغاز ثنا سے ختم سخن ہو حسنِ ادا سے
ذوق سخنداں تیری دعا سے طرز سخن موزوں ہو سراپا
دل ہے ترا یا نور کا عالم بلکہ فروغ طور کا عالم

جاروب کش ہے تیرے مشکوئے خسروی کا ۔۔۔ زیبا ہے ماہ کو گر فرمانِ بہتری ہو
خورشید نذر لائے جب افسر شعاع سے ۔۔۔ منشور افسری پر توقیعِ خاوری ہو
ابروئے تاج بخشی جس دم کرے اشارت ۔۔۔ کشتی میں لیکے حاضر وہ افسر زری ہو
لامیں پئے سواری توسن کو جب سجا کر ۔۔۔ صورت میں ہووے تیلی پرواز میں پری ہو
ہیت ہوا ہے افسوں اُڑتا ہوا چھلاوہ ۔۔۔ پھر اس سے آگے بڑھکر کیا سحر سامری ہو
گیا برشِ قلم وہاں دکھلائے شہسواری ۔۔۔ جب توسن تصور کھاتا سکندری ہو
خاک قدم ہو اس کی اہل نظر کو سوتا ۔۔۔ جو نقش سم ہے اُسکا وہ مہرِ اکبری ہو
تو اس پہ برسر زیں جوں حل پڑا دبے ۔۔۔ ام الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو
کس وصف کی ہو سیڑھی ہاتھی ترے عدو ۔۔۔ کرتا نہیں گردوں جس کی برابری ہو
اس طرح جلوہ گر ہے تو برسرِ عماری ۔۔۔ برجِ حمل میں جیسے خورشید خاوری ہو
جار آئینہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو ۔۔۔ اور سر پہ اُس کے ٹوپی فولاد کی دھری ہو
پر جیسے آئینے سے تیرِ نگاہ گزرے ۔۔۔ یوں غرق اس میں تیری ہر تیر کی سری ہو
کیا سعد و نحس کا یاں ہووے حساب باقی ۔۔۔ جب چھائی آسماں پر فرخندہ اختری ہو
ختمِ ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر ۔۔۔ تو مدعا یہ اس کی گر ملتفت ذری ہو
ہو جو ترا دعاگو گر تنگ ہو وہ کھل کر ۔۔۔ بدخواہ اگر ہو خنداں صد برگ جعفری ہو

ہو سیر بخت میری گر اوج میمنت پر
رفتار بخت اعدا بر رجع قہقری ہو

## قصیدہ نمبر ۴

یہ قصیدہ ایام طالب علمی کا ہے ۔ مطالب اس کے عہدِ مذکور پر شاہد حال ہیں
افسوس کہ نظر ثانی سے نوبت نہ پایا ۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے :-

تا زباں زد دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام ۔۔۔ ہے پئے افلاک لازم نفی خرق و التیام

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار بن کے موتی — شرمندہ جس کے آگے صد کانِ جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جب ذرہ پہ ذری ہو
وہ آسماں پہ جا کر خورشید خاوری ہو

دیکھی ہے چین ابرو آئینہ جبیں میں — کیونکر نہ تن میں اسکے ہیبت سے تھرتھری ہو
کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے — گر بہر پاسبانی ایسا دلاوری ہو
یہ آستانِ دولت ہے سجدہ گاہ عالم — دل کو تری عقیدت اور رنگ سروری ہو
دارا کو تیرے در تک ہو تا تلخ رسائی — دربان جو تیرے در کا کرتا سکندری ہو
سورج مکھی کا تیرے اک پھول مہرِ انور — قربان چترِ دولت نہ چترِ چنبری ہو
باغِ جہاں میں نرگس لے کیوں نہ جام زریں — جب ہر گدا کو دیتا اک ساغرِ زری ہو
دکھلائے آبداری جب تیغ شعلہ دم کی — شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو
کشتِ امل کو سرسبز آبِ گہر سے کر دے — ابرِ کرم کی تیری جب فیض گستری ہو
بیشہ میں معدلت کے وہ شیر ہے تو شاہا — نوشیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو
شیوہ مہوسوں کا مہرِ کرم میں تیرے — تیری گداگری ہو کیوں کیمیاگری ہو
گر آفتاب تیرا ڈالے کرن کو اپنی — تاجِ گدا کا جلوہ جوں تاجِ قیصری ہو
تیری ثنا میں شاہا لکھتا ہوں اب یہ مطلع — جس کی چمک سے کاغذ جوں کاغذِ زری ہو

پابوس نقشِ پا سے تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پہ اسکو تاروں سے برتری ہو

ابرِ کرم سے تیرے کیا دور ہے کہ شاہا — کشتِ فلک میں پیدا سرسبزی و تری ہو
سورج کی جو کرن ہے گردوں سے لے زمیں تک — مانندِ عشق پیچاں پھر بسر سری ہو
مریخ کو فلک پر جس تیغ سے ہو ہیبت — دشمن کو بھاگ کر پھر کیا اس سے جانبری ہو
نعرہ سے تیرے ہو دے ہیبت کا چاک سینہ — دل پر دلاوری کے وہ تیغِ حیدری ہو
تیرے سوا جہاں میں کون آج ہے توانا — جو دل کے ناتواں کو دیتا تونگری ہو

…کریں تا دعوئے رویت کو اہل اعتزال
اور ملاحد وسوسوں سے دین نبی کو اتہام

…ہو جب تک کہ جوگی شغل استدراج میں
سینہ و سر میں رکھے مرغ نفس کو اپنے تھام

…کہ سالک مسلک تقوے میں کرتا ہو سلوک
تا رہے مجذوب مست بادۂ غفلت مدام

…جو دیاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظام اہل عالم ہووے عالم میں تمام

…خراسان و عراق و زابل و نیمروز سے
نغمہ ریز فارس آباداں کرے اپنے مقام

…جم و پنچم کھرج گندھار دھیوت اور نکھاد
نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

…و زردی ابارد - آب ایلول اور دئیل
ماہ شمسی ہو مطابق مہر ولایت میں مدام

…رب اس کا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں
دولت اس کی ہو کنیز اقبال ہووے غلام

…کہ وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ
نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام

…دینداری سے بس کی ہے دکھائی خود بخود
بیخ و بنیاد ضلال و کفر شکل انہدام

…یا تعجب ہے اگر اس کی ہوا و فیض سے
گلشن گیتی ہو رشک روضۂ دار السلام

…مرغزار عالم اس کی فیض سے ہے دبلہ سبز
پانے ہے رنگ زمرد پارۂ سنگ رخام

…کہکشاں سے لے عصائے نقرئی پیر فلک
کرتا ہے وقت سواری شکل چاؤش اہتمام

…سے شمیم خلق اگر اُس سے تو ہو جائے ابھی
طبلۂ عطار کی صورت معطر ہر مشام

…گلشن مدح و ثنا سے اس کے لئے گلچین فکر
لا گل مضمون تازہ جلد بہر اشتمام

مختصر ہم یوں ذات عالی ہے یہ جمہور انام
حلقۂ تسبیح میں جوں سر برآوردہ امام

…مائدہ اور من و سلویٰ کی کسے ہے احتیاج
مطبخ عالی سے تیرے سب کو پہنچے ہے طعام

…مہر و در خورشید سے کوہ بدخشاں ہے فقط
تیرا اجلال کہ تیرے نظر عالم پہ عام

غنچۂ تصویر کو بھی مثل گلہائے چمن
ہے نسیم لطف سے تیرے ہوائے ابتسام

ق

ہے ملا دست خلک کے ساتھ تجھ کو زور حکم
دست قسام ازل سے اس کے وقت انقسام

فیض تیرا ہے کہ پائے خرقۂ ماہی درم
حکم تو دیوے تو ہووے نیز دریا تشنہ کام

تا خطِ محور پہ ہووے گرم گردش آفتاب ۔ تا نہ قطبین فلک تک پہنچے دو صبح و شام
سبعہ سیارہ ہوں ساں تا سر سمت آسماں ۔ ہو ثوابت کا سپہر ہشتمیں پر اثر دوام
منجمد ہو کر میان طبقۂ باد زمہریر ۔ قطرہ افشاں تا بخارا بہ ہوں بن کر غمام
آب باراں سے گزر کر منعکس تا ہو شعاع ۔ انعکاس رنگ سے قوس قزح پائے نظام
تا حقیقت کے لیے لطف سخن ہووے مجاز ۔ صنعتیں ہوں اس سے پیدا با مرام و بے مرام
تا کریں روشن معانی و بیان حسن بدیع ۔ جن سے ایراد معانی ہو بہ تحسین الکلام
تا اَنۡ و لَنۡ کے اِذَنۡ دیں فعل مستقبل کو نصب ۔ جازم فعل مضارع اِنۡ و لَمۡ لَمَّا و لام
تا کہ علم شعر ہو داخل بہ اوزان بحور ۔ تا افاعیل و تفاعیل اس سے پاویں انتظام
اور زحافوں کا عمل لیکر ردیف و قافیہ ۔ گر عیوب اس کا ہے مہم میں ان کو دے مقام
تا اطبا زماں کو ہونئے علم طب کے ساتھ ۔ خوش بنفش و نقد بحران و فکر الوان قوام
تا حس و حکاک لازغ و رخوۂ و تاب ثقیل ۔ جنبش و مرض جو ہک کا اطبا میں ہو نام

یہاں سے چند شعر چھٹے نہ گئے

کیا تب منسہ ہوں منطق میں ایسا عوجیا ۔ یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرض عام
مادی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ ۔ علت غائی یہ دیویں اہل دانش انصرام
تا ریاضی و طبیعی سے بزور فلسفہ ۔ فیلسوفان جہاں علم و عمل میں لیویں نام
تا کہ بیت سعد اکبر ہوں فلک پر قوس و حوت ۔ تا کہ جوزا اور حمل میں شمس کو ہو احتشام
سنبلہ کو تا منجم کہوے ہے شاید عقیمہ ۔ تا کہ ہو دست دلو جوزا فلک پر شادکام
حکم ہو برجیس و کیواں کا رواں ...[illegible] ۔ تا کہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام
تا خراساں مہر کو بہرام کو ہو ملک ترک ۔ ماورا النہر پہ ناہید کو تا ہو قیام
تا کرے معلوم اصطرلاب سے اختر شناس ۔ ارتفاع ہر ستارہ روز و شب یا صبح و شام
تا زحل کے ساتھ شکل عقلہ دا نکیس کو ۔ زائچہ میں دیتے ہوں صاحب دل نسبت مدام
ہووے دائرہ عرصۂ برزخ میں تا بحث حکیم ۔ ہوں نہ مذہب جبر اور تفویض میں اہل کلام

وادیٔ بطحا میں جیسے بر سرِ اصحابِ فیل
معجزِ طیور ابابیل آیا وقتِ انہزام

جنبشِ خامہ سے میرے سرد ہو برقِ جہاں
گر کروں شاہا رقم وصفِ سمندِ تیز گام

ترک تازی میں پڑی تھی اسکی شوخی پر نظر
ابلقِ چشمِ بتاں کی ہوگئی ترکی تمام

سنبلۂ عبرا پہ کھائے نقطۂ رمال رشک
دیکھیے نقشِ سم جو اُس کا جلوہ گرد وقتِ خرام

سرعتِ طیِ منازل کا لکھوں گر اُسکے وصف
حال و مستقبل کا داخل فعلِ ماضی میں ہو نام

عرصۂ چوگاں میں جب اس کی بوقتِ معرکہ
لائے جولانی میں دیکھ جنبشِ دستِ لگام

گاہ سرپٹ گہہ اُڑان اور گاہ میٹھا پویہ
گاہ ڈُلکی ایجیہ اور گاہ جائے شاہ گام

اور اشارہ ہو اگر اس قاف تا اُس قاف پر
اس طرح اُڑ جائے جوں رخِ نظر بالائے بام

نیل کو تیرے شبِ یلدا تو کہتا ہے جہاں
پر جو ہے نقشِ قدم اس کا ہی ماہِ تمام

یہ نہیں ہے نیل کا دیا ہے تسمہ گو
جانِ قیسِ تشنہ دل بنکر ہوا شکلِ غمام

حلقۂ زلفِ بتاں کب کھائے پیچ و تاب
جب اُٹھا خرطوم کو اپنے کرے بندہ سلام

منزلِ توصیف کو کیونکر تری طے کر سکے
دم کہاں پیکِ خرد میں یہ خیال اس کا ہے خام

تہنیت کو ہے دعا پر ذوق کرتا مختصر
ہو مبارک تجھکو یا عیش و طرب سید سیام

جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگیں رہیں
اور ہوا خواہوں کے دل ہو ویں ہمیشہ شادکام

# قصیدہ نمبر ۵

افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا

صبحدم تک جو تھا سیرِ فلک کا مشتاق
عرش پر اُڑ گیا اک آن میں مانندِ براق

چمک اس برقِ جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر
افقِ صبح پہ دکھلائے فروغِ اشراق

شعلۂ رنگِ حنا کرکے اُڑا دیوے ابھی
قفسِ دل میں جو ہیں بندِ طیورِ اشواق

رات مجھکو یہ فلک گردو ہاں لیگئے
کہ عقولِ عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

دشمنِ بد بیں کو آبِ خنجر بھی زہراب ہے
اور دم جیسے گلے میں ہر بن آبِ حسام

پر ہوا خواہوں کو تیری مرحمت سے خسروا
فیض انفاسِ الٰہی میں نفوسِ انتسام

دستِ صحت سے رگِ ہر سنگِ کوہ و دشت میں
نبض سالم کی طرح جنبش دکھائیگی مدام

دیں مریضوں کو دمِ عیسیٰ تو یوں نکلیں دہاں
قطرۂ ریزش گرین بن طرح سے وقتِ زکام

مستفیدِ نورکب ہے شمس سے جرمِ قمر
نیّر اقبال سے تیرے جلا لیتا ہے دام

رو برو دستِ کرم کے ہوتی گرد و باد ہے
آبروئے ابرِ گوہر بار اے ذو الاحترام

تو جھروکوں میں جو بیٹھے آکے بہرِ عدل و داد
شیر و آہو گھاٹ پر جھک کے ہوں آپس میں رام

تا نہ آلے زخم عاشق کے دلِ ناکام پر
تیغِ ابرو یہ بتاں رکھتے ہیں وسمہ سے نیام

ق
اے فریدوں تو جو کر دے راہ خونریزی کو بند
اور لبوں سے جام کے چھلکے رحیقِ لالہ فام

شانۂ ضحاک کی مانند ایک ایک اس کی موج
مار پیچاں بنکے ہووے متحد با خطِ جام

معجز انصاف سے تیرے سرِ دشت و جبل
ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام

قصدِ صید اس کا کرے کوئی معاذ اللہ اگر
ہو خدا کا قہر نازل اس پہ بہرِ انتقام

آیا جب تیرے مقابل اے نہنگِ بحرِ رزم
شکل خرچنگ اُلٹے پاؤں ہٹ گیا دستانِ سام

گنجِ استقلال پہ ہے قفل اگر تیری سپر
وقت پر شمشیر ہے مفتاحِ ابوابِ مہام

جوں عصا حضرت موسیٰ سرِ دریائے نیل
نیزہ تیرا لشکرِ اعدا میں کر جاتا ہے کام

ہے خدنگِ تیر تیرا یا ہوا پر ہے عقاب
دم بدم دے ہے قضا کا اُڑ کے اعدا کو پیام

گر عدو سدِ سکندر کو کرے چار آئینہ
آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

تیرے وصفِ ناوک اندازی پہ تیر اندازِ فکر
مطلعِ برجستہ کو بے لکھ کے دیتا انتظام

برسرِ پرواز ہوں جب تیرے شہبازِ سہام
جوشنِ جسمِ عدو میں ہووے دم محبوسِ دام

دستِ دہقاں میں فلاخن شعلۂ جوالہ ہو
لیں ترے برقِ غضب کا کشتِ اعدا پر جو نام

گر سحابِ قہر تیرا ہو تگرگ افشاں تو ہو
حالِ اہلِ قافِ دہ اے خسروِ عالی مقام

نعت [illegible] کے لئے اُس کی جیسے [illegible] میں سب
[illegible] مشتاق

اُن دنوں یعنی شہنشاہ **محمد اکبر**
دست [illegible] سے [illegible] آفاق

ہیچ و قادری گر اُس کی رقم ہو توصیف
مہ و اختر کو ہوا [illegible]

[illegible] جام سے خورشید ہلال آسا ہے
کاہش رشک سے رکھتا ہو بہ تدقاق

خط سے شیشۂ افلاک ہو دم میں لبریز
ہووے گر کھلنے سا اس کی نسیم اخلاق

[illegible] کو تھا منزل ایں میرے
کاروان شہر سمرقند کا [illegible] [1]

[illegible] سے [illegible]
[illegible] حاضر کے [illegible] بعد استغراق

[illegible] تاتار [illegible]
جس نے توران سے تا ہند تک [illegible] قشلاق [2]

[illegible] ہو بہ [illegible] سے غضب
[illegible] پیلاق [3]

[illegible] قلم تو پھر ایک سینہ میں [illegible]
[illegible]

[illegible] نعت میں سب [illegible] طفلان [illegible]
[illegible]

[illegible] شیلان کرم پر ہے زمانہ عیال
[illegible] فلک [illegible] میں ہوتا اطباق

[illegible] تیرے فلسفۂ حکمت سے
[illegible] کا اطلاق

ہوں [illegible] کبھی [illegible] سے
تیرے [illegible] کا ہے استحقاق

[illegible] اعراض کریں جبکہ [illegible] تیرے
[illegible] ہو [illegible]

[illegible] سعادت کا ترے حسن [illegible]
[illegible] قدم [illegible]

تو جو محراب عبادت میں رکھے سر بسجود
طاق مسجد میں جھکے آکے سر هفتم طاق

[illegible] تیرا جو زمانہ کی پائے تبدیل
[illegible] منطقہ ہو خط نطاق

[illegible] سیماب سے ہے [illegible]
[illegible] آگے [illegible]

جب شمشیر ترا [illegible] سیرت [illegible]
جیسے [illegible] سے [illegible] ساق

---

[1] [illegible] [2] قشلاق [illegible] [3] پیلاق [illegible] جہاں [illegible] [illegible]

فلسفی دہر کے جو جو تھے ہوئے مشائین
نور اشراق سے تھے ہوگئے سب اہلِ وفاق

تھے سعادت سے جو سب برجِ فلک مالا مال
بخت و دولت سے یہ لبریز تھا ہر قصر و وثاق

تھی تعجب کی نہ جا بارِ جلالت سے ہو گر
حرکتِ جیبِ گرانبار کی قطبین پہ شاق

انجمِ ثابت و سیار سعادت سے بہم
یوں نظر آئے کہ جوں مست بہ بغلِ اہلِ وفاق

نجمِ ناہید لقب جس کو ہے رقاصِ فلک
تھا نشستہ بہ آہنگ ربابِ عشاق

بدر مقابل میں قمر جلوہ نما نظر آتا ہلال
خدمتِ دائرہ داری میں تھا ہر رنگ کے طاق

اس کا ظہور جو دیتا تھا سبزوں کو حیات
جرمِ خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اشراق

تیرِ گردوں کا خوشی سے تھا جو دل بھرا تا
دیکھے ترتیب دنیا کو باقسام ایاق

چلتہ تک ایسی بجاتا تھا کہ نہیں تھے
لعبتانِ فلکی صورتِ اہلِ اذواق

نظر آتا تھا اگر اخترِ ذی مدار کوئی
دیتا مریخ دمِ تیغ سے اس کو الحاق

ہاتھ پھیر ہارتے چو رنگ تھا اک پھرتی سے
دم میں تھا اپنے طمنچہ پہ چڑھاتا چقماق

جو چلا بارہ تن اس کا سوئے عالمِ خاک
یہ اڑا اس پہ تڑاقا وہ اڑا اس پہ تڑاق

سعدِ اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضیِ فلک
حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربط و وفاق

ہوتا زاہد بھی تھا آمادۂ شادی دامادی
زالِ دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دیکے طلاق

چرخِ ہفتم پہ فلک سے ہے تو بطی الحرکت
عالمِ خاک میں پڑے تنگ و دو کا مشتاق

نفخ تفریح سے پُر باد ہے گردوں کا شکم
لیکن اس وقت میں تھی بہت اس کو شاق

ہے جو ہر کوچہ میں آراستہ نوبت خانہ
خالی آواز و باجے سے نہ کوئی رواق

یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزمِ طرب
گلشنِ عیش و طرب کیوں نہ ہو بزمِ آفاق

آج وہ روز ہے تابوں سے جسے کہتے ہیں عید
بدا سبھی ہیں شگفتہ دلِ اہلِ مذاق

بزمِ خسرو میں چل اے یار یہ بزمِ سخن
سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق

تیرا قانون ترے پاس بخطِ مسطر ہے
چھیڑ دے زابل و تبریز و خراسان و عراق

تیرے نغمے ترے مضمون ہیں یہ شہنائے قلم
دلکشی پہ ہے سرو ست کمربستہ و چاق

دختِ رز کو یہ سرِ محفلِ اہلِ تقویٰ سے
جب تلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فراق

بخشوا آفاق میں ہو تیرے رمضاں بھی مۂ عید
ہو ترے رویتِ دیدار پہ عیدِ آفاق

اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن
یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایامِ محاق

صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے از ماق

## قصیدہ نمبر ۶

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے :-

گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا اگر
اور کھولے پاٹ دانہ کی یوں آسیا گرہ

سینہ میں دل اگر نہ گرہ تھا تو کس لئے
ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ

اپنا دلِ گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا
غنچہ ہزار حیف پہ کھلا اور ہوا گرہ

چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل
ہے ایسی چشم ترے ہم آشنا گرہ

قمری سے لائی چاک گریباں تئیں تری آہ
اے سروِ گل سے دے سرِ بندِ قبا گرہ

ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر ہجومِ اشک
ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگور آ گرہ

میں بحرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند؟
کھولے ہے کالبستہ کی میری سدا گرہ

تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں
وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ

مرقد پہ میرے طرۂ شمشاد کی طرح
پھوٹے گی نخلِ شمع میں بھی جابجا گرہ

آیا ہوں زیں سرشت میں لیکر گرفتگی
ہوویں گے استخواں پہ گلوئے ہما گرہ

رہویگا شکلِ دستِ حنابستہ حشر تک
قاتل کے دست و دل میں مرا خوں بہا گرہ

گر میں گرفتہ دل ہوں تو جوں دانۂ انار
محفل میں ہوگا خندۂ دنداں نما گرہ

میں عکس اپنا دوں تو ہو جوہر سے آئینہ
جوں دامِ موج و شکلِ خطِ بوریا گرہ

عکسِ دلِ فسردہ سے مینائے بزمِ مے
رہ جائے شکلِ دانۂ انگور کما گرہ

ہو ترے فیضِ تکلم سے شفا عام تو ہو
زہر کی جا دہنِ مار میں پیدا تریاق

عدل نے تیرے شہا دفع یہ کی خونریزی
فصد کی منع اطبا نے پئے رفعِ خناق

اللہ اللہ رے لشکر کا ترے خیل و حشم
ہم عدو جس سے نہ ازبک ہو نہ ہمسر قلماق

تیرے دربارِ جلالت کے جو ہیں میرِ غضب
کہکشاں کو ہیں سرِ دوش لئے مثلِ چماق

اور اک مطلعِ دلکش نے طبیعت سے مری
ہے ترے عدل کی تعریف میں پایا الصاق

اُٹھ گیا مدرسۂ دہر سے یہ شر و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبدِ بے در میں رہیں گے محبوس
دم نہ ماریں گے مگر گونج کے شور و غلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپِ جہانگرد کا میں
دے فلک زیرِ پئے پامالِ قلم صفتِ اوراق

تن میں اطلح سے ہے اُسکے بھری سی شوخی
قفسِ تن میں ہو جوں طائرِ جانِ عشاق

ماہیِ زیرِ زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندھکے فتراک میں اکب اُس کا
چرخ پہ دائرے کھینچا کرے مانند نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شاہا
جودتِ طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سوئے فلک جیسے بنفرت مشام
بوئے گل جائے تنفس میں دمِ استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیلِ فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اسکی تنِ البرز پہ شاق

عمر بھر مطبخِ عالی میں رہا نعمت خواں
صفتِ اطعمہ پہ خام رہا جوں بسحاق

ہیں ستاروں کی بھی آنکھیں انہی ہاتھوں کو لگی
نورِ رحمت کا زمانہ میں جو ہے عام اتفاق

بر سرِ دشمنِ بداندیش بہ ہنگامِ وغا
گر قشوں ہووے جلو ریز بہ دشتِ قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اس کشورِ ویرانی میں
شعلۂ تیغِ شرربار ہو برقِ حراق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالمِ نور
جس کی مشرق سے کریں نورِ معانی اشراق

کر دعا صدقِ ارادت سے کہ ہے وقتِ دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوقِ زباں کو مشتاق

دوشِ گردوں پہ ہو تا فرغلِ سنجابِ غمام
سبزۂ تا خاک پہ ہو پیرہنِ استبراق

گل کی گرہ بہار کرے گر صبا سے وا
وہ کھولدے دلوں کی بفضل خدا گرہ

لایا ہوں بہر نذر میں وہ دُرِّ آب دار
ہو جس کو دیکھ آب دُرِ بے بہا گرہ

جوں برق لکھ کے مطلع برجستہ خامہ نے
مطلع سے آفتاب کے دی ہے لگا گرہ

مطلعوں میں حسن سے کی تونے وا گرہ
کیوں میرے دل میں خال سویدا رہا گرہ

کھل جائے نام پاک سے اک آن میں ابھی
گر ہووے کوہ مردہ کو و صفت گرہ

ہیبت سے تیرے نطق کے تجالہ نکلے ہے
دعوے کے لب پہ آ سخن مدعا گرہ

چاہیے جو اس کو آب فصاحت کرے رواں
لکنت وہیں زبان پہ دیوے لگا گرہ

تیرے سحاب جود سے گلشن میں صبحدم
لے شست تر بہ غنچۂ گل باندھتا گرہ

گردوں خنگ کی جان فرو بستہ کھینچ کے ہو
مابین کوہ قاف میان ستا گرہ

تو ناخن نگاہ سے مانند آفتاب
دے کھول دم میں دیکھ کے یہ ماجرا گرہ

کھولے ہیں کار بستۂ عالم سے دانہ وار
تیری بہ الطف و سحاب عطا گرہ

دست گرہ کشا نے ہے باقی کہاں رکھی
جز تکمہ ہائے پیرہن اغنیا گرہ

البتہ دل میں غنچۂ پیکاں کے سے ہے ترے
جانب سے حاسدوں کے صباح و مسا گرہ

یا جو تری کمان نگاریں میں ہے نمود
وہ ابروے نگار پہ ہے خوشنما گرہ

القدم میں تیرے ناخن شمشیر سے ہوں وا
ہیں سر جو حاسدوں کے بروز وغا گرہ

تیرے فروغ نیر حشمت سے کیا عجب
گر مہر ہو ہمت کے بشکل سہا گرہ

اللہ رے تیری قوت بازو کہ مثل گوے
چوگاں کے آگے کوہ کو ہے جانتا گرہ

تو چاہے گر تو دامن ساحل میں بحر کو
دونوں طرف سے کھینچ کے دیوے لگا گرہ

پنجہ سے تیرے مہر کے گردوں پہ ہر سحر
کھل جاتی ہے ستاروں کی لا انتہا گرہ

منقار ماکیاں کی طرح ناخن ہلال
ہے بیضۂ فلک کی سدا کھولتا گرہ

لائے جو شعلہ حرف شرارت زبان پہ
تاثیر عدل سے ہو تری لب پہ آ گرہ

یہ زہرِ غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیرِ زلف
سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

میں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں
حیرت سے اپنا کر ہو نہ بانِ درا گرہ

رویا میں شکل شیشہ کبھی کھول کر نہ دل
میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

دلبستگی کا اپنے قلمبند کرکے حال
بازو پہ مرغِ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوترانِ گرہ باز کی شکست
سینہ سے آن کر سرِ دوش ہوا گرہ

وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے
جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبینِ صبا گرہ

پھیلاؤں گر شمیمِ مضامیں کو منہ میں
ہووے ختن میں نافۂ مشکِ خطا گرہ

رجعت سے نجمِ بد کی مری ماہِ سپہر
خرچنگ بن کے بیٹھ رہے ایک جا گرہ

پیدا ہوں سو گرہ اگر اک دل سے کھولئے
جوں کوکنار لالہ و تخمِ حنا گرہ

گھٹنا نہ ماہ رو کا ہے کہتا کہ دیکھیو
قینچی کی طرح کترے ہے چرخِ دوتا گرہ

ق
آہیں تو کھینچیں سینۂ صد چاک سے بہت
کھلنی تھی میرے دل کی مگر کیا بھلا گرہ

سوزن کا رشتہ نکلے کھنچا بستری میں آہ
ہے زیرِ پا سے رشتہ بپا دوسرا گرہ

قطروں سے خونِ دل کے ہوں سو سو گرہ عیاں
اک آئینہ سے دل کے جو کھولوں ذرا گرہ

یہ عقدہ مثلِ ابروئے خوباں کینہ جو
ہے ڈالتا بہ ناخنِ عقدہ کشا گرہ

رمّال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پر تو ہو
انگلی سے پوری پوری میں اس کی جدا گرہ

ہر قطرۂ سرشک مرے روئے زرد پر
خاطر گرفتگی سے ہے جوں کہربا گرہ

یارب وہ شانہ پاؤں کہاں میں جو دل سے آہ
دے کھول شکلِ عقدۂ زلفِ دوتا گرہ

وابستہ تار موئے میاں سے ہوں شکلِ تاب
چشمِ کشادِ کار رکھے مجھ سے کیا گرہ

نقطہ کی طرح مرکزِ گردش رہا سدا
میں تھا مگر یہ دائرۂ دیرپا گرہ

دل تھا گرہ خیال میں جو آکے عقل نے
یوں کھول دی بہ ناخنِ فکرِ رسا گرہ

اُس آفتاب پر تو نظر کر کہ جوں تگرگ
پل بھر میں اک زمانہ کی ہے کھولتا گرہ

وہ کون یعنی اکبرِ ثانی کہ جس نے وا
تیرے بھی کامِ دل سے ہے کی بارہا گرہ

پر تیرے مدعی کی نہ وا ہووے جوں حباب
ہرگز محیطِ دہر میں غیر از فنا گرہ

## قصیدہ نمبر ۷

اس قصیدہ پر بھی نظرِ ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے:-

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار
تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادوکار

سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ
زباں سے اسکی ہیں وابستہ اُنکے سب اسرار

سوارِ توسنِ دستِ رواں پہ ہووے یہ جب
کرے قلمروِ معنی کو دم میں باجگزار

جو شاخ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں
تو اُڑ کے صورتِ شاہیں کرے یہ اسکو شکار

زبانِ تیغ نگہ سے لیا فنوں شاید
کہ اس پہ اُڑ کے مضامیں میں کرتے جی کو نثار

ہیں دست بستہ کھڑے جا ہوں باندھلوں جنکو
کہ لفظ و معنی و مضموں ہیں بے شمار و قطار

بے کری کام جہاں جا کے اُسکی نوکِ زباں
قلم دبیرِ فلک کا ہے واں پڑا بیکار

سخن زباں پہ ہے اور ہے نگاہِ دل دل پر
کہ سو ہیں دل تو ہر اک کی ہے اپنی اپنی بہار

سخن شناس اُنہیں دیکھکر یہ کہتے ہیں
کہ جو گہر ہے وہی اس میں ہے دُرِ شہوار

کروں میں اُس کو نگر کیا کہ مشتری نہ رہے
متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار

شرابِ دردے دل ہو گیا ہے مست ایسا
کہ شامِ روزِ جزا تک نہ جس کا اُترے خمار

بنائے ناوکِ تقدیر خاک تودہ جسے
بچا سکے اُسے کیا خاک بُلبُلے کا دھار

ہزار درد اُسے بے دردیِ زمانہ دکھائے
زباں پہ لایا نہ لائے گا شکوہ یہ زنہار

ق
میں لایا سینہ میں تما دل کی جا پہ آئینہ
کہ اہلِ دل اسے سمجھیں گے مطلعِ انوار

سو اُس کو توڑا ہے لوگوں نے سنگِ باراں سے
میں کہتا تھا کہ گہربار ہونگے یا گلبار

صفا کا اُسکے اک ادنےٰ سا وصف یہ دیکھو
غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو اس پہ ہے بار

ہیں آبگینہ کے آگے ہوں آپ شرمندہ
کہ ایک بات سے پڑتے ہیں بال اس میں ہزار

اللہ رے ہیمِ عدل کہ خون زمانہ میں
دشنہ بھی رکھے کرکے جبیں پا گرہ

ق
زلفوں کے دام جیسے حسینانِ نازنیں
ہیں ڈالدیتے دیکھے بو سے قفس گرہ

مارِ سیہ کے سر میں اسی طرح زہر مار
ہو دیگا مثلِ مہرۂ مار ایکجا گرہ

انجم سے تیری سالگرہ کے لیے فلک
ہر سال کہکشاں میں ہے دیتا لگا گرہ

توسن ترا زمیں پہ جو کاوے کا ڈالے نقش
سمجھیں کہ بیٹھا مار کے ہے اژدہا گرہ

جولاں پہ اپنے آئے تو جوں جنبشِ صبا
غنچوں کی کھولے باغ میں وہ بادپا گرہ

دامانِ ابرِ تر پہ وہ پاتا ہے برق نام
اُس کا غبار نعل جو دے ہے اُڑا گرہ

گر اُس کی گردِ سُم سے بمیدان کارزار
ہو گردباد دامنِ صحرا میں کھا گرہ

لائے اُڑا کے تو اسے از شرق تا بغرب
کھلنے نہ پاے یہاں بہ جبینِ ہوا گرہ

رفعت پہ تیرے فیل کی طبعِ رسا نے رات
پھینکا کمندِ وہم کو جو کرکے دا گرہ

آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں
اک نقطۂ مشکِ ناب کا ہے ہو رہا گرہ

ہے بسکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دلمیں شوق
دیکھا جو نیشکر میں کہ ہیں جابجا گرہ

کرتا ہے آشنا اُسے دنداں سے وہ فقط
اس واسطے کہ اُس کی بھی ہو دل کی وا گرہ

بلکِ دُرِ سخن میں دلا صبح تا بہ شام
جوں سبحہ دیگا بیٹھا ہوا تا کجا گرہ

وا کر لبِ سوال بدرگاہ ذوالجلال
تا رہ نہ جائے سینہ میں دل کی دعا گرہ

غلطاں بزیرِ گنبدِ گردوں ہوا کرے
بن بن کے تا زمانہ کی صبح و مسا گرہ

تا چرخِ واژگوں پہ سرِ شاخ کہکشاں
ہو خوشہ وار عقدِ ثریا سدا گرہ

میداں ہو تا سپہر کا اور گوے ماہ و مہر
اور دورِ مہ سے ہو ذنب و راس تا گرہ

تا دل گرفتگی سے زمانہ کی بزم میں
ہر دم گلوے شیشہ میں ہو قہقہا گرہ

حبِ نبات کو دیے دردِ مریضِ عشق
تا دیں بحالِ لبِ بُتِ شیریں ادا گرہ

جبتک شمیمِ کاکلِ پیچاں کے رشک سے
نافہ میں ہو دے مشکِ ختن بے خطا گرہ

ہر سال تجھکو جشن مبارک ہو خسروا
اور مشکلاتِ خلق کی ہو اُس سے وا گرہ

یہ شعبان فلک پر ہوا خوشی کا جوش
سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

یہاں سے کئی سطریں پڑھی نہ گئیں۔ آگے چند شعر متفرق آتشبازی کے ہیں:-

شب برات کی وہ روشنی کہ جس کے تلے
ہو روز عید اگر آئے سامنے شب تار

جو ٹہنیوں پہ ہوئی روشنی تو ستو را ٹھ
فلک نے کھینچی زمیں پر ستاروں کی دیوار

دیا ہے لایا ارسطو طلسم یوناں سے
کھلایا سدِ سکندر میں چین کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتشباز
تو بولے اہلِ نظر دیکھنا ہے طرفہ بہار

پڑا نکلے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو
تو آکے ہو دینگے طاؤس خلدان پہ نثار

سب اک طرف کو لگی جگمگانے چادر گنج
زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانوں کے پردے تو اڑ گئے اسدم
پٹاخے گرنے لگے چھٹ کے جب بہم تکرار

پٹارے سب کو تو اعدے فوق ہیں شاید
کہ تیر اڑتے ہیں تو سقف میں ہیں قطار قطار

عجب تماشہ ہوا ہتیوں کو جب دی آگ
کہ ناچنے لگے ملکر ثوابت و سیار

ہوئی کھچی تھی جا کر شہاب ثاقب سے
لہو زیادہ جب آیا میں ذروں ہوئی آتشبار

ہیں ابر طورے جیسے زمیں پہ نور کے پھول
زمیں تو تودۂ گل بنگئی آسمان گلبار

(کئی شعر اور پڑھے نہ گئے)

اب اس دعا پہ قصیدہ کو ختم کرتا ہے ذوق
کہ دوست تیرے سرافراز اور عدو ہوں خوار

پر اس ہوس کی ابھی جھٹ رہی ہے مہتابی
قلم میں سالِ عروسی کا پھول دیوے بہار

اسی خیال میں تھا دیکھتا خدا کی طرف
کہ ہاتفِ فطرت نے دی والیِ گفتار

کہو سر لب بستہ سے شادیِ فرزند
مبارک آپ کو ہووے شہِ سپہر وقار

| | | |
|---|---|---|
| ۳۰ + ۲ | جو ہوویں اُسکے ہواخواہ وہ رہیں سرسبز<br>ہوں اُسکے دشمن بدکیش خالداً فی النار | ۱۱۹۳<br>۳۲<br>۱۲۲۵ |

مگر تردّدِ ایام کیوں کروں اے چرخ
نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار

لے آیا حسنِ مقدر اُس آستاں پہ مجھے
کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جس پہ لیل و نہار

سحاب جود سے اُس کے زمانہ ہے گلشن
نہال ابرِ کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سن کے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں
کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُس کے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی
کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار

سو میں زباں کو گیا لے کے دل کے دریا میں
مذاقِ آبِ گہر میں ملا لیا کئی بار

اور اُس کے بعد ہوں کہتا کہ نام پاک ہے وہ
جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

خدا کا سایہ ہے اور نائب رسولِ خدا
محمد اکبر عالم نواز و عرش وقار

ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت
ہدیٰ پناہ و بدل دولت و بہ رخ انوار

خدا شناس و طریقت نما حقیقت بیں
بدستِ جود ہے دریا بہ تمکنت کہسار

نہ حقِ وصف ہو اُس کا ادا کبھی لب سے
زباں بہر سرِ مو آ کے گر کرے گفتار

ہوا ہوں لیکے میں حاضر یہ تہنیت کے پھول
کہ اور پاس رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شہا! ہے آج اُسی شاہزادے کی شادی
جہاں میں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

وہ شاہزادہ ہے پر ہے ابھی سے شاد نشاں
وہ شاہزادہ جواں ہے وے کہن کردار

پڑھوں حضور میں اک قطعۂ دعائیہ
قبول جس سے دعائیں ہوں بر سرِ دربار

شہا خدا سے یہی ہے مری دعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

شکوہِ شادیِ شہزادہ کس زباں سے کہوں
کہ جوں شگافِ قلم بند ہیں لب اظہار

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

جو لکھنے بیٹھا میں ساچق کا وصفِ آرائش
تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خطِ گلزار

یکایک اُتریں پرستاں سے آ کر پریاں
ہوئیں جو تختِ ہوائی پہ ناچنے کو سوار

ہجومِ عیش و طرب اس قدر زمیں پہ ہوا
دبیرِ چرخ سے بھی ہو سکا نہ اُس کا شمار

بزمِ عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظارہ ۔۔۔ پڑھتا یہ مطلعِ رنگیں ہے وہ ہو کر خرم

ہے اُٹھا عیش کا طوفان بسرِ ساحلِ یم
زمزمہ نوح کا برلبِ طرب ہوا ہے ہمدم

گنگا جی کا سا ہے پھایا یہ گلو سے میت ۔۔۔ ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم
لوگے جس سازِ خنداساز کو آغوش میں آج ۔۔۔ تار چھیڑو گے طرح کا تو سنو گے پیہم
نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا ۔۔۔ کہ سوا راگ کی تم کے ہے کوئی اور بھی تم
جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ کو حرام ۔۔۔ وجد میں آئیں سنیں آج گر آ ہوے حرم
لالطنبوری آج رگِ سنگِ صفا ۔۔۔ بے زباں زمزمہ سازی کرے موجِ زمزم
نہیں کچھ دور کہ تبدیل ہو کعبہ کا لباس ۔۔۔ تا کہ دکھلائی نہ دے صورتِ اہلِ ماتم
دھوم اس شادی کی ہے کہ منڈھے کی صورت ۔۔۔ چھا گیا گلشنِ آفاق پہ ہے ابرِ کرم
رقعۂ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہوا ۔۔۔ کہ جو انانِ چمن آئیں جو مل کر باہم
شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا ۔۔۔ زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھانے عالم
عطرداں میں گلِ نرگس وہ بھرے عطرِ سہاگ ۔۔۔ سارے گل بھرنے لگیں بلبلِ بیتاب کا دم
یاں ہے تیاری پوشاک کہ چرخِ اطلس ۔۔۔ لایا اطلس جو لگانے تو یہاں نکلی کم
یہ خیاطوں کی ہے جلدی کہ کھلا جاتا ہے ۔۔۔ شکمِ کرمِ بریشم ہی میں تارِ ریشم
یہ چڑھاوے کی ہے کثرت کہ جٹے ہے ہر صبح ۔۔۔ ڈگڈگی پہ گل داؤدی کے ہیرے شبنم
اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ ۔۔۔ جس کی انگلی میں پہنائیگا سلیماں خاتم
ہوئی نوبت کی یہ نوبت کہ سحر اس کی ٹھکور ۔۔۔ گوشِ افلاک سے بھرتی ہے سوا گوشِ اصم
نئے قلیاں کو بھی گر منہ سے لگاتا ہے کوئی ۔۔۔ تو وہ بھرتی ہے ہم آوازیِ شہنا کا دم
پہنچا یہ طنطنۂ کوس کا گردوں پہ دماغ ۔۔۔ کہ نہیں کھتا مہر سے زمیں اپنا قدم
آئی اس طرح سے پیہم ہے جلاجل کی صدا ۔۔۔ کہ پریزاد ہے آتی کوئی کرتی چھم چھم
کہتا ہر دم ہے یہ نقارچیِ پیرِ فلک ۔۔۔ کہ بعادت سے دمامہ کا گلے پھولا شکم

# قصیدہ نمبر ۸

اکبر شاہ مرحوم کی مدح ہے - عالمِ شباب کا کلام اور نظرِ ثانی سے محروم ہے :

اُفقِ دل پہ مرے عیش و طرب دونوں بہم
آج یوں آئے نظر جیسے دو پیکر توام

ایک کا ایک سے وہ ربطِ سخن تھا گویا
دو لبِ یار ہیں یا حضرتِ عیسیٰ ہمدم

دوشِ ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی
لام الف لکھا تھا اسلام کا یاقوت رقم

یا تھے دو مصرعِ مربوط بہم دست و بغل
یا کہ پیوند تھے دو نخلِ گلستانِ ارم

ملکے دو تارِ نظر ایک ہوئے تھے دونوں
یا وہ اک بینی کے دو پرے تھے باہم ہمدم

دونوں پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں
کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھتے نہ جعدِ پُرخم

ایک معنی کے وہ لفظِ مترادف تھے دو
ایک مضموں کے دو فقرے تھے مگر مستحکم

تھے جڑے دو دُرِ شہوار کہ ہرگز نہ ملیں
ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرۂ یم

ایسے تھے دونوں وہ یکدل کہ دو قالب یکجاں
یکزباں دونوں وہ اس طرح کہ جوں چاکِ قلم

آئے لپٹے ہوئے یوں عالمِ سرشاری میں
نالۂ زیر کی ہمراہ ہو جوں نالۂ بم

میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونے کا
تو یہ الفت نے کہا غیب سے ہو کر مُلہم

کیوں نہ ہوں کے دلِ تنگ میں بھی ہوں یہ تنگ
جب معلوم تو پھر بات ہے کیوں مبہم

آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادیِ طوئی[1]
کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم

کون وہ ظلِ خدا ۔ شاہ محمد اکبر
جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ابرِ کرم

شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم
ہو سلامت روی اُسکی بہ سلامت منعم

اس لیے عیش و طرب مثلِ قران السعدین
متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اس دم

یُمن اس عقد نے بخشا ہے جہاں کو ایسا
جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم

آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر
دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم

دیتا شکلوں میں ہے پیوند بدیع الانتاج
یہ تکلم سمجھے نہ تہذیب نہ جانے سلم

[1] طوئی - عروسی ۱۲

سر اٹھایا یہ ہوائی نے ہے آخر کہ ہوا
شعلہ اس کا علمِ کاہکشاں کا پرچم

ٹہنیاں جھومی ہیں اس ننگ سے نافرماں کی
جیسے رکھے ہوں تراشے ہوئے جامِ تسلیم

اتنی اڑتے نہ سمجھا۔ بلِ عشرت سنے بزور
سر کو دو کوہ کے ٹکرایا ہے مانندِ غنم

نخل بہوا ہوا دم بھر میں نکل آتا ہے
ہے اناروں میں اچنبھے کا تماشا عالم

چھوٹے گن چکر اس انداز سے کھا کر چکر
چرخ میں آیا ہے دیکھ کے گردونِ دژم

پھولیں کیونکر نہ چمک کر گلِ آتشبازی
شاخ تھی گل کی قلم بنگئی شوسے کی تمام

جھاڑ ابرک کے ہیں۔ چادرِ مہتاب کے ہیں
جڑ تک لپٹے ہوئے نخلِ گلستانِ ارم

جز طور کا جوں وادیِ ایمن ہو نور
شمع ابرک کے کنول میں ہے دکھائی عالم

ہیں جو سرگرمیِ شادی سے فتیلے روشن
تاب کیا خانۂ گیتی میں رہے سایۂ غم

باندھے سو شعلۂ فندق بسرِ ہر انگشت
پنج شاخوں کو کہوں میں نہ کبھی دستِ صنم

کھولا مصحف تو زہے یمن کہ سرِ لوحِ ورق
اسمِ اعظم تھا عیاں خطِ شعاعی سے قسم

رونمائی یہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روے تو دیدن نہ دہم

ایسی شادی کے تجمل کو لکھے کیا کوئی
دھوم ہے جس کی گئی تا سرِ ہفتم طارم

جی میں ہے توسنِ خامہ کی عناں پھیر کے میں
مدحِ اکبر شہ ثانی کروں پھر زیبِ رقم

جس کے باعث سے منور ہے چراغِ خورشید
جس کی دولت سے ہے آراستہ بزمِ عالم

جسکے دینداری کے نقارہ کی اللہ سے صدا
از عجم تا بہ عرب اور ز عرب تا بہ عجم

جس سے پوچھو کہ تو آگہ ہے؟ کہیگا کہ بلے
انت تعرف کہو جس سے وہ کہیگا کہ نعم

مدح میں اسکی رقم کرتا ہوں اک تازہ غزل
کہ غزلخواں ہے ہر اک آج بجانِ خرم

تو ہے وہ ابرِ سخا۔ تو ہے وہ دریاے کرم
جس میں ہوں فلس کی جا کیسۂ ماہی پہ درم

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب
مشک سودہ کرے ہر زخم پہ کارِ مرہم

پہنچی ہے روحِ عدو سہم کے ناوک سے ترے
مثلِ آہوے رمیدہ سوے صحراے عدم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اس شادی میں — اس کے سینے سے جو نکلیں گے آوازہ بم
جو گھڑے روپے کے اور سونے کی ٹھلیاں ہیں — صف بہ صف دیکھ کے ان کو یہ پکارا عالم
ہے یہ سلک دُرِ شہوار بگوشِ بہجت — یا کہ ہنستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم
ہر سبوچے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ — اپنے اُبھرے ہوئے پستاں پہ چڑھائے محرم
دیکھ نقلوں کو سبوچوں میں یہ حیراں ہے خلق — کہ بھرے موتیوں سے کیونکہ حباب لب یم
ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پیراں کو — وصفِ شیریں سخنی پائے زبانِ ابکم
کروں تحریر جو رنگت کو حنا بندی کی — شاخِ گل مہندی ہو پھولوں سے ابھی پیر قلم
ہوے روشن جو کنول شکلِ گلِ آتشناک — تو لٹیں اُنپہ دعوئیں کی ہوئیں زلفیں پرخم
کاغذِ زر کے پھولوں میں یہ گل کترے تھے — آ گیا تھا گلِ صد برگ کا پھر کر موسم
نخل آرائش اگر دیکھو تو ایسے دلکش — نوجوانانِ چمن جیسے بعہد ناز و نعم
بیاہ کی شب وہ تجمل تھا کہ اللہ اللہ — کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم
سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہاں کا جب سے — کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا نہیں آنکھوں کی قسم
دیکھے دولہا کے نہیں دستِ حنا بستہ ابھی — ورنہ تھی کا غنچے کے کھل جب تا ہر دم
منھ پہ نوشاہ کے یوں سہرۂ زرتار کی زیب — روئے خورشید پہ جوں خطِ شعاعی کی جھلم
ہوا شبدیز فلک سیر پہ دولھا جو سوار — روز نے صدقہ کیا اشہب و شب نے ادہم
وصف میں اُس کے پڑھوں کیونکہ نہ اک مطلع میں — توسنِ طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم

یار ہمدم نہیں لیکن ہے وہ نسلِ آدم
ہے وہ اُس نسل میں جس اصل میں ہے رخشِ رستم

رمز راکب سے یہ آگاہ وہ صرصر رفتار — گزرے گر دل میں توقف تو وہیں جائے ہی تھم
ہے تو وہ حور شمائل۔ نہیں پر زادۂ حور — خوئے آدم ہے ولیکن نہیں نسلِ آدم
چادریں بھیجتا مہتاب کی ہے بسکہ فلک — چاہیے اس کو زمیں پہ نہ گلیم و نہ گلم
نور کے قطرے فلک سے ہیں جو میں پڑ پڑے — چھوٹتے گنج ستاروں کے کہاں ہیں پیہم

ہیں وہ مجنوں نگر تفتہ ہوں جس کے دم فصد
سر ہر بن مو سے عوض خون کے نکلتا ہے دھواں

چشم سوزن سے نہ لو سلسلۂ زنجیر کا تم
دل وحشت زدہ ہے لاغر و بےتاب و تواں

ہوں وہ افتادہ کہ محبت کبھی یاور ہو تو ہو
دستگیر آپ کے عصائے مژہ ہو موئے مژگاں

ہوں وہ تصویر سر صفحۂ عالم جس پر
ہو قلم رو تو لرے کا رسنان و پیکاں

دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار
اک گرہ وا ہو تو صد دانہ ہوں اندر داماں

ہوں وہ فرسودۂ غم جس کے کہ چشمہ بینش
کرتا سرو چمن دہر ہے کا رسو یاں

قطرۂ شبنم کا ہو گل پہ تو مری نظروں میں
سنگ حسرت ہے کہ رکھتا ہوں بزیر دنداں

میں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے
ابر اگر ہے تو ہے آغشتۂ زہراب سناں

فلک سبز کے نیچے ہوں میں تلوار کا کھیت
آب شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے مری جاں

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمر تلف آوارہ ہے
حشر تک ڈھونڈیں تو نکلیں نہیں میرے نشاں

ماہ نخشب کی طرح پھرتا میاں ہوں سر کوہ
اور اسی چاہ میں ہو دیکھے تو میاں ہوں نہاں

ہوں وہ سرگشتہ کہ گر ساقی دے ساغر پہ پیا
حلقۂ دور فلک میں ہو تو ہے دہقاں

اس گلستاں کی روش پہ گل بازی ہوں میں
نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

دل نے لیموئے کیا رنگ طلا کا روشن
ترش روئی سے رخ زرد ہے میرا تاباں

میں وہ گردش زدۂ دہر ہوں جس کا پس مرگ
سنگ تعویذ بھی چکر میں ہو مانند فساں

بیخ ہوں سنبل دل خون شدہ جس کے خوں میں
تیغ قاتل بشکل کشتی دریا ہو رواں

اشک خونیں ہے مرا آتش یاقوت یمن
گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

دل اڑا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا
طائر رنگ حنا بن کے ہوا ہوں پراں

سنبل حصوم کا ہے خواب مری موت و حیات
کبھی لب مرا خنداں ہے کبھی ہے گریاں

وہ سیہ بخت ہوں میں خاک نے جس کی اکسیر
جب سیہ کر دیا آئینۂ چرخ گرداں

میں وہ بیمار ہوں مایوس شفا جس کے لیے
دم عیسیٰ نے کیا کار رفو بس ثعباں

اشکوں کا سر نہ مرا مرز رہا گیتی میں رہا
دل ہر دانۂ روئیدہ تہ سنگ گراں

تیرا خنجر ہے نہنگ ایسا کہ غرق زہر آب
تیری شمشیر وہ اژدر ہے کہ ہے آتش دم

حق میں اعدا کے ترا تیر ہے پیغام قضا
اور ترا جوہر شمشیر تمنائے عدم

توڑے دل شیشہ کا ہرگز نہ ترے عہد میں سنگ
زخم کھائے کہ لیا اُس نے مرے گھر میں قدم

تیرے انصاف کا پرتو ہے جو عالم پہ محیط
تو نہ پایا ہے نہ پائیں گے فروغ اہل ستم

روبرو بچۂ آہو کے نہ روشن ہو چراغ
ڈالے روغن کی جگہ اس میں جو پیہ ضیغم

ق

گلشن مدح میں دے تیرے ترا ذوق لگا
خرمن گل کی جگہ تازہ مضامیں کا [illegible]

پہ یہ سمجھا کہ ہے جز کرتا دلالت گل پر
کیجئے اک شمہ تری وسعت کا اے نیک شیم

یہ دعا کرتا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے
شادی وصلت فرزند بعید جاہ و حشم

ہوں شبستاں میں ترے دست و بغل عیش و طرب
گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

## قصیدہ نمبر ۹

یہ قصیدہ مبارکبادی مرزا سلیم شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا۔ بندہ آزاد ان دنوں طفل مکتب بھی نہ تھا۔ جب حاضر خدمت ہونے لگا۔ تو حضرت مرحوم اکثر اسکے اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اور بندش کی فرصت نہ تھی۔ ایک برس وفات سے پہلے فرمایا کہ ہوتا تو اُسے درست کرتے طبیعت عالم جوانی میں بلند مضامین پیدا کیے تھے۔ مگر اکثر اشعار اور مطالب خیال میں ہیں۔ ایک قطعہ لکھ دیتے ہیں چنانچہ ۲ شعر کا قطعہ لکھا اور عید قرباں کی تہنیت میں ابوظفر بہادر شاہ کو سنایا۔ بعد انتقال کے یہ قصیدہ بھی نکلا۔ الحمدللہ کہ یہاں تک پہنچا۔ اول قصیدہ لکھتا ہوں۔ پھر قطعہ۔

دل کہ اس دہر میں ہے گرسنۂ ناز بتاں
غم تیغ اسکو غنیمت ہے کہ دیکھا لب ناں

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامن دریا سمجھوں
برق پر سوز کا ہاتھ آئے جو طرف داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جس کے نفس سرد سے آہ
دم میں یخ بستہ ہو سرچشمۂ مہر درخشاں

میں ہوں وہ شعلۂ جوالہ بزیر گردوں
کہ اگر دل کو قرار آئے تو جگر میں ہو جاں

ترے خنجر کو ملا شہپرِ قدرت سے ہے زور
مرغِ دل سینوں سے جوں زاغ وزغن ہیں پرّاں

تیر ناوک کو ترے دیکھ کے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کرے گا طیراں

آتشِ قہر کی ہیبت سے تری نار سعیر
رکھتی شعلے سے بہ انگشت بزیر دنداں

گنبدِ چرخ ہوا کلبۂ پر دود اُسے
روح کو سینۂ حاسد میں بجائے خفقاں

تیرا فرماں تھا کہ فرماں بر دولت کے سوا
ہووے اک برگ نہ پیدا بہ گلستانِ جہاں

ہوے یہ سنکر اقبال ترے نا پیدا
کہ چمن میں نہیں اُگتا ہے گُلِ نافرماں

تیرے مہتابِ کرم سے جو ہے قلزم قہر
پردۂ نور میں بلاشبہ تنورِ طوفاں

عدل نے تیرے دکھائے ہیں بہم آتش و آب
آبِ آئینہ میں روشن ہے رُخِ برق وشاں

دلِ افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے تنگِ جراحت پہ سرِ زخم ہراں

تیری تاثیرِ محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خطِ سبزِ خوباں

اُفقِ صبح سے کافور کا لیکر مرہم
رکھتا مہتاب ہے بر سینۂ صد چاک کتاں

سرزنشِ عہد نے کی تیری بیا تنگ عدم
کہ نظر آتا نہیں شست میں کانٹوں کا نشاں

بے علف ناقۂ لیلیٰ ہے مگر قیس غریب
نہیں دیتا بہ ضیافت سرِ خارِ مژگاں

خسروا تیری توانائی اقبال سے آج
ناتوانوں کو ہوئی دہر میں یہ تاب و تواں

مور کا سلسلۂ نقشِ قدم گر ہو کہیں
اپنے حلقہ میں جکڑ لیتا ہے صد پیل دماں

آگے جلوہ کے ترے پرتوِ خورشید ہے گرد
آگے رتبہ کے ترے خاک ہے جرمِ کیواں

اس تصور میں جو ہے پیشِ نظر عالمِ نور
اس کو اک مطلع موزوں میں ہوں کرتا میں بیاں

گر تری ذات نہ ہو کعبۂ اقبالِ جہاں
آسماں ہووے نہ چہ پیر کے زمیں کے دِیاں

موس ناصیہ سائی تری خورشید کو روز
مولشاں لائق ہے در پہ ترے سرگرداں

مہرگاں ہمتِ عالی کا جو بادل لائے
ایسے نیساں سے وہ آفاق پہ ہو قطرہ فشاں

جن کی شادابیِ گوہر کو اگر دیکھے تو دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یہ تاب

شرحِ جاں سوز سے میری نَے قلیاں کی طرح — کیا عجب نالۂ قلم سے جو نکل آئے دھواں
دلِ مایوس یہ تھا کہہ رہا مجھ سے کہ حسرت — یوں لگی کہنے کہ بیجا ہے یہ کیوں آہ و فغاں
پھر تو کر غور کہ مدّاح ہے کس شاہ کا تو — دیکھ وہ ابرِ کرم قلزمِ جود و احساں
وہ شہنشاہ کہ جشن اس کا ہے افلاک کی سیر — ہنستے ہوش میں تو کرتے ہیں ستارے افشاں
ماہِ گردوں پہ ہے اور آکے زمیں پر مہتاب — کثرتِ عیش سے دریا میں ہے شب کو رقصاں
سن کے یہ مژدۂ جاں بخش فلک کو یہاں تک — شوقِ نظارہ ہوا عام بہ گلزارِ جہاں
دیکھتا ہوں کہ سرِ شاخ مژہ ہے چشم — رخِ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس داں
آج عالم کا ہے دل شاد کہ ہوں عالمِ نور — جلوہ گر ہے سرِ اورنگ بصد شوکت و شاں
ماہِ فرخندہ لقب شاہ نجیب اکبر — تاجِ شاہانِ زماں فخرِ سلاطینِ جہاں
دیکھا ہے دولت و صولت نے جو اسکے اقبال — دہر پہ سرکش کا بھی قد ہو گیا خم مثلِ کماں
مدحِ حاضر کیلئے حاضر و تیار ہو ذوق — تو ہے خاقانیٔ ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

پوچھ تو آج فلک سے کہ ہے خورشید کہاں؟
گر ہے کچھ وزن تو آجائے سوئے میزاں

تیرے جلوہ کے تجلّی نے جو روشن کیا دل — ہو گیا شمع مرے سینہ میں تارِ رگِ جاں
آستیں اپنی ہلا دے جو ترا دستِ کرم — ہر شکن سے ہو عیاں بحر بحرِ عمّاں
کیوں نہ اربابِ ہمم ہوں تری ہمت کے غلام — سچ یہی ہے کہ اَلْاِنْسَانُ عَبِیْدُ الْاِحْسَان
آگے دریا ترے خود کھولے ہے لب ہائے سوال — کہوے کس منہ سے کہ کچھ بھی ہے کہتا مرا حال
سرخروئی ترے حاسد کو جگر خواری ہے — شیر کے بال سے ہے تیز تر اُسکو رگِ جاں
کانپتے ہیں ترے ہیبت سے پلنگ اور نہنگ — بحر و بر پر ہے تری تیغ کی بُرش یکساں
ہے زرہ رکھتی اسی واسطے ماہی تہِ آب — پہنے جوشن ہے نیستاں میں ہر اک شیرِ ژیاں
تیغِ ہندی تو کمر میں ہے پر اک جوہر — رکھتا در زیرِ نگیں ہے صفحاتِ صفواں
کوہ پر بیٹھ کے یوں بیٹھے پہ پشتِ ماہی — جیسے ابروئے بتاں ہو تہِ آئینہ عیاں

جو دعا گو ہیں ترے ان کی دعائیں ہوں قبول — صبح جشن طرب افزا میں ہو دائم خنداں

اور برنگ شب دیجور ترے سب بد خواہ
روسیہ محفلِ عالم میں ہوں جوں ناشیاں

یہی قطعہ ہے کہ قصیدہ مذکور کی طرح میں دفات سے ایک سال پہلے تحریر فرمایا۔

خسروا جلوہ ترا وہ طرب افزائے جہاں — کہ جسے دیکھ کے ہو عید بھی قرباں قرباں
حکم دے تو جو شہا واسطے قربانی کے — سعد ذابح بھی کرے ایسا چھری کو براں
گاؤ گردوں نہ فقط خوف سے اس دم کانپے — بلکہ ہو زیر زمیں گاؤ زمیں بھی لرزاں
تو جو ہو حامیِ اسلام تو بُت خانہ میں — بُت کرے قصدِ نماز اور رکھے ناقوس اذاں
نیرِ جاہ شب و روز ترا جلوہ فروز — مہر تاباں کبھی ظاہر ہے کبھی ہے پنہاں
قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحابِ ہمت — لیلے پنجہ میں گہر بحر سے نکلے مرجاں
اور گہر بھی ہوں وہ خوش آب جنہیں دیکھ کے دور — طرفۃ العین میں ہو کاہ رُبا کا ہرتاں
نطق شیریں ترا وہ ہے کہ ثنا میں اس کے — تر زباں موجۂ دریا ہو اگر ایک زباں
آبِ دریا میں ہو یہ جوشِ حلاوت پیدا — لبِ دریا بھی بہم ہو کے ہوں ذنون دہاں
اس قدر تابعِ فرماں ہے زمانہ تیرا — نہ ہو گلشن میں بھی دیدہ گلِ نافرماں
ہو کے سر سبز بہارانِ کرم سے تیرے — شاخ پہ گل چمنِ دہر میں ہو شاخ کماں
بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ سرِ شاخ خدنگ — روشِ غنچۂ گل ہووے شگفتہ پیکاں
وہ ترا زورِ حمایت ہے کہ جس کے باعث — ناتوانوں کو بھی ہو دہر میں یہ تاب و تواں
ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گر باندھ رکھیں — ایک تارِ نگہ مور سے سو پیل دماں
دیگ مطبخ پہ ترے یہ فلکِ پر انجم — کیا عجب صورتِ سرپوش ہو گر قطرہ فشاں
پیل تیرا گل سوسن کا پڑا ہے انبار — گل مہتاب کے گلدستہ ہیں اُسکے دنداں
اُس کی خرطوم کسی دلبرِ لیلیٰ وش کی — جعد مشکیں ہے کہ ہے کاکلِ عنبر افشاں
لکھوں شوخی جو ترے توسنِ چالاک کی میں — جنبشِ خامہ بھی ہو موجِ رمِ برق جہاں

آتشِ قہر غضب تیری عیاذاً باللہ
ہے یقیں صورتِ نخلِ گلِ آتشبازی
ماجرے خامہ نے شیریں سخنی کا تیری
سخن دانِ عرب سب سرِ ساحل تھے کھڑے
وصفِ شوخی ترے توسن کا ہو کس طرح رقم
باندھوں کس طرح سے مضموں سواری میں اسے
قلم و حرف نہیں پیشِ نظر ہیں اس دم
کہوں شائستگی اس بادیہ پیماں کی میں کیا
نہیں انساں ہے مگر کام ہیں انساں سے فزوں
خسروا سرعتِ رفتار ہو گر مدِ نظر
جلوہ گر خانۂ زیں پر ہو پھر اس شان سے تو
تازیانہ جو لگا دے تو کفل پر اس کے
ابھی گھوڑے کی صدا کوہ سے پھر کر نہ چلے
کیا دکھاؤں ترے ہاتھی کی بلندی شاہا!
جھومتا جھامتا آتا ہے درِ دولت پر
سمتِ قبلہ پہ ہے ابر آیا سرِ دوش ہوا
اس کی مستک پہ سپیرا اور وہ نگارِ خرطوم
اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی مہوش کی
اس کے دنداں یہ نہیں غور سے دیکھا میں نے
کیا لکھوں آگے ترا وصف کہ منہ میں میرے
ختم کرتا ہے ثنا تیری دعا پر اب ذوقؔ
تجھکو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ و جلال

مشتعل ہووے اگر سوے گلستانِ جہاں
نخلِ فوارہ بھی پانی میں رہے شعلہ فشاں
صورتِ موج میں دریا کے دیا تھا بزباں
دونوں لب سکے حلاوت سے ہم تھے چسپاں
کہ تنِ صفحۂ کاغذ پہ ہے جوں برق طپاں
تڑپ اٹھتا ہے ارے جنبشِ اگر طبع رواں
سرِ حاسد سے ہے دل کھیلتا گوئے چوگاں
تازیانہ ہے بکار اس کو نہ درکار عناں
پر نہیں پر وہ پری سے ہے زیادہ پرّاں
چلے ہو قاف سے تا قاف سراسر میداں
بر سرِ دوشِ صبا جیسے نسیمِ ریحاں
اور چمک کر کبھی اڑ جائے وہ بجلی ترساں
دو کئی بار ہے ہے وہاں سے یہاں یہاں سے وہاں
آتے کوسوں سے نظر سب کو عیاں اچہاں
کہتے ہیں ساقیِ طنّاز سے یوں بادہ کشاں
خم کے خم آج چلے جام نہ آئے بمیاں
کریں آنکھوں پہ توسِ قزح کا عنواں
زلف پر گُل ہے و یا کاکلِ عنبر افشاں
کشورِ زنگ میں آئے ہیں فرنگی بچگاں
پار آ دا سے جوں شعلہ زباں ہے لرزاں
کہ زباں کو بس اب آگے نہیں یارائے بیاں
عقل ہو پیر تری بخت میں تیرے جواں

ہے بحر اُسکے سامنے کشتی بکف گدا — پھرتا صدف ہے کھولے ہوئے لب سوال کے
ہیں اُس کے در کے خاک نشینوں کے دل غنی — خواہاں وہ ملک کے ہیں جو ہاں ہیں مال کے
دنیا نے خاکساری اُسے دی ہے نذر میں — مٹی خمیر یہ ہے کہ گھر میں کُلال کے
ہو اُس کا حکم عام جو بہر منع انقطاع — رہ جائے آرہ چوب میں دندان نکال کے
دشمن کا اُسکے زور حمایت سے ہے قوی — وہ پیرزال سمجھے ہیں رستم کے زال کے
ہیبت جو اُسکی وادی حق میں کرے ظہور — جا بیٹھے چھپ کے شیر بھی بر میں غزال کے
اُس کی شمیم خلق معطر کرے جو گل — لے ایک تو [illegible] اہل چمن [illegible] کے
خوشبو سے اُسکی فیض کے ہوتا ہے مشکبو — سجدہ وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے
[illegible] استعداد میں تغیر ہو پائمال — [illegible] زمانہ میں دن انتقال کے
[illegible] سے اگر اس کی کامیاب — لب بند ہو وہیں طوطی شیریں مقال کے
دریا بھی اُس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوے — نکلے ہے تیر [illegible] صدا منھ سے [illegible] کے
آب گہر میں ہووے رواں کشتی گدا — دست کرم سے اُس شہ دریا نوال کے
[illegible] ہو کے مخاطب بیاں کروں — اوصاف ایسے شاہ کرامت خصال کے
ہے سپہر جلال کے خورشید پر جلال — قربان جائیے تو سے [illegible] جلال کے
[illegible] بزم خاص کہ ہے آ گیا تجھے — صانع نے اپنے نور کے سانچے میں ڈھال کے
[illegible] بھی پست ہو کے ہوا خوب مشتعل — تہ لو دیکھا جب ترے اوج کمال کے
[illegible] نہیں ہیں کہتے منجم جو سال کے — [illegible] ہیں یہ [illegible] انفعال کے
[illegible] — شطرنج [illegible] میں [illegible] خیال کے
دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا — دریا بھی منھ چھپا کے گریباں میں ڈال کے
[illegible] پہ تونگا دکر [illegible] آسکے سامنے — [illegible] کے
ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال — ق — روشن ہوا کمال سے قطب شمال کے
سُنتے میں جان نثار ہوں جب تیرا ذکر خیر — گویا اذاں کو سنتے ہیں [illegible] بلال کے

وقت کا دیکھے دمِ معرکہ راکب اُس کا — سرِ حاسد کو رکھے صورتِ گوئے چوگان
دل میں ہیں جوش ثنا میں تو نہایت لیکن — دل حوادث سے زمانہ کے ہے بیتاب و تپان
ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیری — کیا لکھے وہ ترے اوصاف کہ قاصر ہے بیان

عید اضحےٰ تجھے ہر سال مبارک ہووے
تجھ پہ ہو سایۂ حق اور ترے سایہ میں جہان

# قصیدہ نمبر ۱

جب پچھلے سال سنہ ۱۳۲۲ ہجری میں سائیں نثار علی شاہ وارد دہلی ہوئے۔ بیان کیا کہ اورنگ آباد ہمارے وطن میں میاں عاشق نہال حقی ایک بزرگ ہیں اُن کے ہم دیکھنے والے ہیں اُستاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جنھیں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ اور تعجب یہ کہ اُن کے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا۔ کوئی کوئی شعر سُنایا کرتے تھے۔ سائیں نثار علی شاہ ان دنوں ایک سید بزرگوار کے گھر میں اُترے تھے۔ خدا کی قدرت۔ ۶۰ برس کے بعد اُس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس۔ پاکدامن۔ اہل اللہ بی بی۔ میں کبھی کبھی اُن کے سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایک دن اُنہوں نے مجھے ایک بستہ اجزا کا دیا کہ یہ سائیں چھوڑ گئے تھے۔ اُن میں دیکھا تو قصیدہ مذکور ہے۔ جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اُس کی تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے۔ بچ تو گیا ہے۔ اللہ شہرتِ عام اور بقائے نام نصیب کرے۔ اصل سے نقل ہوتی ہے۔

پیشانی پر یہ عبارت لکھی تھی:-

قصیدہ در مدح عمدۃ العارفین زبدۃ السالکین حضرت سید عاشق نہال حقی ادام اللہ برکاتہم

ہے ابر درفشاں وہ چمن میں کمال کے — عاشق نہال کیوں نہوں عاشق نہال کے
ہیں دیدہ ور ستاروں میں خورشید و ماہ اگر — روشن ہیں دونوں نور سے اُس کے جمال کے
اُس کی نگہ سے گر جگرِ سنگ پاسے رنگ — بھر جائیں پل میں لعل سے دامن خیال کے

کہا، اسی وقت بیگم صاحب[۱] کا حکم پہنچا ہے۔ کہ کل اُستاد قصیدہ سنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نہ کرے۔ آپ کو خیال رہے۔ اُستاد نے کہا بہت خوب میری طرف سے اُنہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے اور ایک دم گرم ہو کر کہا ان بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کے منہ بند کرتی ہے! میں جب قصیدہ پڑھوں گا تو دیوانِ خاص کے در و دیوار سے واہ واہ اٹھوں گا یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے۔ وقتِ معین پر ایما ہوا کہ اُستاد اپنا قصیدہ عرض کریں۔ انہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے سب صم بکم۔ جب ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ۔ اور آگے آؤ پاس پہنچے تو اشارہ کیا کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا۔ ہوں؟ (یعنی پھر پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے۔ خوب تعریفیں ہوئیں۔ بیگم نے بھی سنا کلیجہ مسوس کر رہ گئیں۔ سنہ ۱۲۶۹ھ میں لکھا تھا۔

پیری میں پر ضرور ہے جام شرابِ ناب — پائے فروغ صبح سے سب نورِ آفتاب
ناصح نہ ہو تو اس سے کہ ڈاڑھی ہوئی سفید — کر خوب میکشی کہ یہ ہے سیرِ ماہتاب
ہے پیرِ دل خنک کی ہوا پر بقائے عمر — یہ برف وہ نہیں جسے رکھیں بند تہ داب
ہستی کا اپنی کر نہ بھروسہ حباب وار — تعمیر بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

[۱] بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت ان کے نام کر دی تھی۔ وہ اُن کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کل دربار اور کاروبار کا مختار مطلق تھا۔ خلیفہ اسمٰعیل کے پاس بعض تدبیریں تھیں وہ بیگم نے لے لی تھیں اس لیے۔ سے ہمیشہ خطر تھا۔ کہ شاید اُستاد بھی کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ اُستاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے مگر اُستاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ نہیں کہا۔ نہ بیگم کی شکایت کی بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ اُن کا قول تھا کہ زبان جوہرِ لطیف ہے اسے غیبت آلودہ کرنا اچھی بات نہیں ۱۲

سرتا قدم ہیں شوق ترے طالب جمال — مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے
ساعت بقدرِ روز ہے۔ اور روز ہفتہ وار — ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے
بیتاب اس طرح ہیں ترے اشتیاق مند — جیسے طیور تازہ گرفتار جال کے
مرغِ نظر کے ساتھ اُڑا جاتا ہے دل — مژگاں سے دونوں بازو ہیں پرِ بنگال کے
جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف — دھو دھو کے پاؤں پیچھے پلک خیال کے
شاہا یہ تیرا ذوق ہے امیدوارِ لطف — ہو حال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے
تا جلد اس کا کوکب طالع پئے عروج — آجائے سمتِ اوج پہ گھر سے وبال کے
کرتے بہار نام سے اپنے اسے نہال — جھونکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے
دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر — ایمان اس کے ساتھ ہو وقت انتقال کے

نکلے یہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

بقلم مصنف عقیدت کیش صداقت اندیش۔ سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق۔ برائے نذر جناب فیض مآب گلشن فضل و کمال حضرت سید عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم جمادی الاول روزِ پنجشنبہ ۱۲۴۵ھ ہجری قدسی مطابق ۲۴ اکبر شاہی در قلعہ شاہجہان آباد۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

## قصیدہ نمبر ۱۱
## در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم

اُستاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھیں گے۔ چند شعر لکھے تھے جو مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے۔ (اور آہستہ سے

بے ہنر میرا یہ ہے کہ تقوے سے ہے گریز
تقوے سے ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب

لیکن ہے ابرِ رحمتِ باری سے زر فشاں
دامانِ تر مرا روش دامنِ سحاب

مداح ہوں میں اُس کا کہ ہے جس کے دور میں
شیبِ زمانہ کے لیے کیفیتِ شباب

پیرِ فلک بنے ہے جوانِ سیاہ مست
ریشِ شعاعِ مہر رہے جب ابر سے خضاب

مانندِ نافِ آہو اگر جام میں ہو خوں
اُس کی نسیمِ فیض سے ہو جائے مشکناب

اُس شاہ کے نمِ کرم و بوئے خلق سے
ہر خار بن ہو مجمر و فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا بہادر شہ اسمِ پاک
ہے درجِ یک زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب

ظلِّ الٰہ خسروِ دیندار۔ دیں پناہ
شاہِ ملک جاہ و خدیوِ فلک جناب

تیغ اُس کی وہ ظفر رقم و نصرت اثر کہ ہے
گنجِ ہزار فتح کے مفتاحِ فتح یاب

روشن دلی سے اُس کی عدو تیرہ بخت کے
دزدِ سیاہ کے لیے آفت ہے ماہتاب

ہے مغزِ جانِ کافرِ لعنت کے واسطے
مطبخ میں اُس کے اینٹ مزہ دہر تاب

ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں
اُس میں بہم وفورِ عطا گرمیِ عتاب

کج خلقی اُس کی طبعِ رواں میں نہیں ذرا
دریا سے موجزن کو ہزاروں ہیں پیچ و تاب

پڑھتا ہوں میں وہ مطلعِ روشن حضور میں
جس کا ہووے مطلعِ خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نورِ مجسم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو ترے سایہ سے اکتساب

تلوار تیری ہے وہ غضب برقِ کفر سوز
ہے جس کی آنچ آتشِ دوزخ کا التہاب

جوہر سے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا
کرش کلام کے بجرت آیتِ عذاب

ق

اللہ رے پاسداری اسلام و پاسِ شرع
اللہ رے تیری عدالت اللہ رے احتساب

نکور زخمِ دل پہ نہ بدخواہ کے بندے
اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب

کیسا ہی مے پرست ہو مانندِ چشمِ یار
مقدور کیا کرے قدحِ مے کا ارتکاب

بلکہ نہ لے دعا میں قدح کا بھی منہ سے نام
بالفرض گر ہی ہو دعاؤں میں مستجاب

آئی ہے جب قالب خاکی میں تیری جاں
غافل پئے سفر ہے اُسی دن سے پا بہ رکاب

جو دم مرے سے گزرے غنیمت سمجھ کر روز
گردش سے آسماں کو زمانہ کو انقلاب

ہر بازی فلک پہ تو نوروز روز کر
رکھ آفتاب گنجفہ پہ سال کا حساب

حاصل ہے کیا ... دلا آئینہ کو دیکھ
جو ہے سے دل میں رکھتا ہے کس جی پیچ و تاب

گر ہو سکے تو خاک در ... ہو تو
اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب

آسودگان کنج ... کے لیے
جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب

یا سند ہیں ... سے وہ
دنیا جو اب ... کو جواب

کہتا ہے ... اہل ... مذاق
گزران ہے ... سر رونق کا سبب

دیکھے جہاں کو دیدہ عبرت سے تو اگر
جام جہاں نما ہے ہر اک کاسۂ حباب

ساقی جو مجھکو دین عنایت سے جام دے
لے لو لگا کے آنکھوں سے پی جاؤں مثل آب

گر دے حساب جام پہ جام ... تیرے ہاتھ
روز حساب تک تو پئے جا علی الحساب

مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سنا
جامی بھی لکھے دل پہ جسے کر کے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
... سے بلبلوں کے ہو پیدا بط شراب

گلگون نشہ سے گلگوں ... ہو ...
پاؤں آسماں روش حلقۂ رکاب

مستی مری سکھائے اگر ... کی طرز
ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب

بیہوشیوں میں ہیں مری ... ہوشیاریاں
ہوتے ہیں ... خواب

جاگ اٹھیں وہ جو خواب ... ہوشمند
غفلت میں گر ... صفیر خواب

نہ پردہ فلک کو اٹھا دوں اک آن میں
ہو جاؤں میں جو عالم مستی میں بے حجاب

ہو وہ صدا ... نغمہ ... نشیں
کہہ بیٹھوں گر نشہ میں کوئی حرف ناصواب

یہ ذہن کو ہے عالم مستی میں روشنی
... حکمت اشراق کی کتاب

ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھکو شغل
ہے مثل شغل آئینہ و شعلۂ آفتاب

ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی

سردی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دست حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش کا عالم
ہے مدرسے میں بھی سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مے سے روش دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ریائی

ہو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینا سے مے کاہ رُبائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی لخلخہ سائی

تھا سوزنی خار کا صحرا میں جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی

آرائش گلشن کے لئے جامۂ رنگیں
زیبائش غنچہ کے لئے تنگ قبائی

ہے نرگس شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی

ہر دیدہ کرے قوس قزح وسمہ تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی

چہرہ گلچیں کا ہے سرخی سے یہ عالم
جوں وقت غضب چہرۂ ترکان خطائی

کیا ساغر رنگیں کو کیا جلد مہیا
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی

ہوتی متحمل نہیں اک سر عنبر گل کی
شاخ گل احمر کی نزاکت سے کلائی

عجائب نواسنجی مطرب سے چمن میں
ہر خار کی ہے نوک زباں شعر نوائی

حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر
ہر طائر تصویر کرے نغمہ سرائی

شاہا ترے جلوہ سے ہے یہ عید کو رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی

کہتے ہیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیری
کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی

پر تو سے ترے جام مے عیش سے ہر بزم
لے ساغر جمشید کرے کارروائی

ٹپکے لب ساغر سے وہ قطرہ گہر کی شکل
ہو شمل فلک میں ہیں تماشائی خدائی

کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہو سکے کاسے میں سمائی

پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
احسنت کہیں سن کے ہمالی دانائی

شاہا تری حمایت و دولت کے سایہ میں
گنجشک ننگ باز ہے رشک ہما غراب

کرتا ہے روز شب کو برابر شہنشہا
تعمیل عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشید شیر چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ
چاہے ہے شیر جنگ یہ تجھ سے مگر خطاب

کہئے ترے تکلم شیریں کو شہد کیا
یہ شربت خضر ہے شہا وہ قئے ذباب

ق
چالاکی ہے وہ توسن چالاک میں ترے
شوخی ہے چشم یار میں عاشق میں اضطراب

کاوے میں یوں وہ جیسے کہ طاؤس وقت رقص
اُڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چمکائے اک ذرا سر میداں جو تو اُسے
بے پر ہوا پہ جائے وہ جوں ناوک شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر اب اختصار
یارب دعائے ذوق ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عیدگاہ ہو اور خطبہ و نماز
تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھکو عید ہو فرخ بعز و جاہ
ناکام ہوں عدو ترے اور دوست کامیاب

# قصیدہ نمبر ۱۲
## در مدح ابوظفر بہادر شاہ مرحوم

ساون میں دیا پھر مہِ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی قدح کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروے پُر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سُرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہو دے نہ تمیز کرۂ ناری و مائی

پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

خورشید ومہ کو دیر وتیرے کہاں مقدور لاف ‖ کرتے ہیں دونوں روز وشب گرتے در کا طواف
اے قبلۂ روشن دلاں اے کعبۂ اہلِ صفا

ہے تیری فر و فری فر فریدوں کا نشاں ‖ نصفت کو تیری دیکھکر کسریٰ کی بھی ہو کسر شاں
وہ سکندر قدر ہے اے فخر شاہانِ جہاں ‖ تیرے ضمیر پاک کو پہنچے ہے جام جم کہاں
وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

تیری بہار لطف سے ہر دشت ہے رشک چمن ‖ پیدا ہواں خار خشک میں گلہائے نسرین و سمن
ہے سحاب فیض سے اے خلق رتبہ ذوالمنن ‖ جس جا کہ موج ریگ ہے بحر رواں ہو موجزن
اور وہ زمیں ہر موج پر لاکھوں ہوں دُر بے بہا

اللہ رے دریا دلی تیری یہ ہم جود و کرم ‖ ہے اس ہی دل کا شاہ تنہا تو سرتے لیکر تا قدم
آگے تری بخشش کے ہے دریا میں تہ بے یم ‖ تو بخش دے اک آن میں سو گنج دینار و درم
پیسہ بھی رہنے سکتا نہیں وہ فلس ماہی کے سوا

جس پر عنایت ہو تری اسکو نہیں پرواے زر ‖ جس کا کہ حامی تو ہو کیوں دل شکستہ ہو کمر
اللہ نے تجھکو کیا بیچارگاں کا چارہ گر ‖ اے خسرو والا گہر تیرے تلطف کی نظر
ہے مفلسوں کو کیمیا ٹوٹے دلوں کو مومیا

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسرو والا نگاہ ‖ اب یہ دعا ہے ذوق کی حق میں ترے شام و پگاہ
جب تک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پر مہر و ماہ ‖ فرخ ہمیشہ عید ہو تجھکو شہا باعز و جاہ
بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

# تمت بالخیر

یوں کرتی زرِ پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرِ جدولِ طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا سامنے جیسے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہرِ گدائی

گمرہ کو ہدایت جو تری راہ پہ لاوے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہ نمائی

تا ناخنِ شمشیر نہ ہو ناخنِ تدبیر
دشمن کی ترے ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے در کی ترے ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تیری نذر سدا نقدِ سعادت
سب مشتریِ چرخ کی کیا نیک کمائی

اک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نہ چھوٹے
گر سر بہوا ہو وے ترا تیرِ ہوائی

ہر کوہ اگر کوہِ صفا ہو تو عجب کیا
ہو تیں رساں جیب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دل سنگِ صنم میں
ہر بت میں کرے صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعرِ غزل میں ترے حسنی شفا ہیں
قربانِ غزل کے تری دیوانِ شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانے کو بھی شمع نے انگلی نہ لگائی

زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ
خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رسائی

دیتا ہے دعا ذوق کہ مضمون تھے جس میں
ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ جشنِ عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

## قصیدہ نمبر ۱۳ اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظرِ ثانی نہیں پائی

شاہا جمال و حسن کا لکھوں میں کیا تیرے وصف کیا
ظاہر میں تو ظلِ خدا باطن میں تو نورِ خدا

جلوہ ترے دیدار کا ہے اس قدر بہجت فزا
روئے مقدس کو ترے جس نے کہ دیکھا یہ کہا

صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ صلِّ علیٰ

انوارِ عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا ہے صاف
جس کی پہنچتی روشنی ہے قاف سے لیکر تا قاف

بھوک کی شدت سے اسکو یکنفس فرصت نہو
قرص سے خورشید کی جب تک نہ کرے ناشتا

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کا دانہ چرخِ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اس کی نہیں مطلق شکم میں امتلا

ہضم کامل اس قدر معدہ نے پہنچایا بہم
جید الکیموس ہے جو حلق سے اتری غذا

ہے مزاجِ اہلِ عالم یہ قریبِ اعتدال
ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بخطِ استوا

رکھیگا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
باغِ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سکے نقش دھو
پھینکدیگی توڑ کر گنڈا گلے سے فاختا

اس قدر جاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگسِ بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ اک عالم کو ہو
جبکہ ہو اس کی نویدِ غسلِ صحت جانفزا

وہ ولیعہدِ زماں مرزا محمد بو ظفر
اس کی قوت کر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

تقویت کا یہ اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہوں مقویِ دل و جاں مثلِ اوراقِ طلا

شادیِ صحت سے اُسکے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشکِ چمن محفل میں وہ مطلع پڑھوں
بلبلِ تصویر سنکر بول اٹھے مرحبا

مطلع

آج ہے عالم میں وہ روزِ سعادت اِنتما
لے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جاں بخشِ صحت ہے ترا ماء الحیات
جس سے جوں سیماب کشتہ مردہ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمرِ خلق
ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آبِ بقا

قطرہ افشانی سے آبِ غسلِ صحت کے ترے
ہوں دُرِ خوش آب پیدا اس قدر قوت فزا

ہو وے استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر
بخشے پیرانِ کہن کو نوجوانوں کے قوٰے

جسم کو مل کے دھو دیا تو نے جو دم وقتِ غسل
گرد کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا

دل عدو سے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیر پا پامال ہوتا ہے برنگِ سنگ پا

# قصیدہ نمبر ۱۴

مرزا ابو ظفر بہادر شاہ نے عالمِ ولیعہدی میں ولیعہدی کے بعد غسلِ صحت کیا تھا۔ اس کی مبارکباد میں استاد مرحوم نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ عالمِ شباب کا کلام ہے ؛

واہ واہ کیا معتدل ہے باغِ عالم میں ہوا
مثلِ نبضِ صاحبِ صحت ہے ہر نبضِ صبا

بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار
بن گیا گلزارِ عالم رشکِ صد دار الشفا

ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہمِ زخمِ جگر
شاخِ بشکستہ کو ہے باراں کا قطرہ مومیا

ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق
لالہ بے داغِ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاجِ دہر سے یاں تک جنوں
بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا

ہوتا ہے لطفِ ہوا سے اس قدر پیدا لہو
برگ میں ہر نخل کی سرخی ہے جوں برگِ حنا

پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں
زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا

ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولیدِ خوں
چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا

نام کو اشیا میں تلخی رہی نہ سمیت
بن گئی تریاک افیوں زہر میٹھا ہو گیا

کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زقوم
کیا عجب گر آبِ حنظل دیوے شربت کا مزا

نیش کی جا نوش ہو دنبالۂ زنبور میں
کام میں افعی کے ہو مہرہ بجاے آبلہ

راحت و آرام کا اس دور میں ہو دور دور
چاہیے واقف نہ ہو دورانِ سر سے آسیا

موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف
اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا

آ گیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج
تا زبانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا

نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا جو اس کا طبیب
کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

فرق جا پایا نہ تک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کہاں تاب و طاقت یہ شتاب
کیسے وہ مفتہ ہلال اک شب میں ہو بدر الدجیٰ

صبح صادق کے ہے گو سر پہ سفیدی آ گئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ویسی ہی تھا

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے نہ تھا شکل سے کام
ذہن میں سب مرے حاضر صغریٰ علمیہ
یار روزانہ چار جو ترغیب یاروں کی کبھی
کبھی ہمت تھی مری قاعدۂ صرف مرتب
کبھی منطق کو تفوق ہے مرے نطق سے
کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی تفہیم قرآن کبھی تفہیم اصول
کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانند حکیم
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہات
کبھی انکار قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
حشر اجساد میں تھا گاہ تردد مجھکو
کبھی تھی عرصۂ تدویر فلک کی مجھے سیر
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش
کبھی میں کرتا تھا اعراض میں جو ہر قائم
کبھی منقول پہ مائل کبھی سوے معقول
کبھی میں حافظ قرآن بعلم تفسیر
کبھی کرتا تھا بسطی پہ حواشی تحریر
کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
کبھی نباتات کی آگاہ [illegible] کیفیت سے

عقل کو تجربہ کی [illegible] کبھی کثرت
کبھی مری فکر کا ہر [illegible] حکمت
پر جنانی مجھے منظور [illegible] علمیت
درس تدریس پہ آتی تھی مجھکو رغبت
کبھی تھی مو میں [illegible] تحقیق
[illegible]
کبھی میں کرتا تھا تشریح نجوم و ہیئت
کبھی تعلیم عقائد بکتاب و سنت
کبھی کرتی تھی طبیعی پہ طبیعت رغبت
کبھی مثل [illegible] مجھے پاس ملت
اور کبھی کرتا تھا باطل سما و انشقت
کبھی انکار تناسخ پہ مجھے سو حجت
کبھی تھی عالم برزخ میں مجھے اک حیرت
کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی وسعت
کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت
کبھی میں کرتا تھا حلول سے ثابت علت
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت
کبھی میں قاری قرآن بعلم قرأت
کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی خدمت
کبھی میں کرتا تھا قاموس پہ تصحیح لغت
کبھی میں نبض سے [illegible] ضعف و قوت
کہ جمادات کی معلوم [illegible]

خوردۂ گل کو صبا لائی تصدق کے لیے
دے گیا ابرِ بہاری نذر دُرِ بے بہا

شادیِ صحت کا تیری کیا لکھوں عالم کہ آج
جوشِ عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑنے ہر شمع کو گرنے لگی موجِ نسیم
بزم میں پیدا ہوئی ہر سازِ مطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے پیدا موجِ تبسم سے
شورِ قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے قہقہا

بزم میں حوریاتِ فانوس پری کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیرِ گردوں جابجا

کر رہا ہے مہ چمن ہی میں ... طاؤس رقص
آتشِ نیریں ہے رقصاں ... قبلہ نما

تھا نہانے ... میں ہی ... کہ رقص نے
ہے جو منظورِ نظر سب کو تماشا رقص کا

... ... ... ... ... ... ... ...
رات کو کہتے تھے آپس میں ... ...

صنعتِ آتشبازی پرمسرت ... ... ...
سنگِ پارس سے کہیں باروت کو پیسا تھا کیا

ہو گئی ... ... ... ... ...
ریزہ نور ... نکلے ... کھلائے ...

گنج ... تاروں ... ...
ماہ پاروں کا تھا گویا خندۂ دنداں نما

منہ پہ کیا جو رنگ سے ... مہتاب ہو
غازہ سے ہر چند چمکے رنگِ روئے مہ لقا

برج جو اُڑ کر ہوئے قندیلِ شب زیرِ فلک
برق تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ جس کے رو برو
جشنِ جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبانِ خامہ عاجز آگے اس تعریف میں
ذوق کہتا ہے اُٹھا کر ذوق سے دستِ دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شادِ مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

## قصیدہ نمبر ۱۵

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت جمولی کے ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا تھا۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت
نشۂ علم میں سرمستِ غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا اہرام میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاجِ حصولِ صورت

فائدہ کیا جو ہر اک علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا جو ہر اک فن کی کھلی ماہیت

فائدہ کیا کہ جو دیکھیں کتب ہر مذہب
فائدہ کیا جو ہوئی آگہی ہر ملت

عقل سے گرچہ کیا مادہ ایسا پیدا
کہ بہرشکل ہوا اک تازہ محل صورت

بنائی کوئی صورت کہ جسے دیکھ کے ہو
ہیکل روم سے بتخانہ چیں تک حیرت

بے مقدر نہ پڑے صورت بہبود نظر
دو سا آئینہ دل سے نہ ہو زنگ کلفت

پڑھوں اک قطع برجستہ میں اس موقع پر
جس کو سن کر کہیں احسنت سب اہل فطنت

گر نہ دے صاحب جوہر کو مقدر عزت
جو ہر فرد ہے بالقوہ تو کیا ہے قسمت

کیا ہوا علم معقول سے اگر آیت کی ہے
نیک جب ہے یاوری بخت نہیں کیفیت

قاضی چرخ جو تو ہے تو کیا گر تیرے
مثل دہقان فلک رکھتے ہوں طالع ثابت

دور گردوں نہ موافق ہو تو ہوا ضعیف
جز انتقال میں تو جیتی اٹھا نے نعمت

ہے برگشتگی بخت کے چلنے کی نہیں
نظری و عملی کوئی نہیں تیری حکمت

گو فصاحت میں تو سحباں ہے ولے بے تقدیر
حرف مطلب پہ زباں کو ہو تری سو لکنت

ریاضی میں ہے صناع اگر بخت ہیں بد
نقش باطل ہے تری شکل وہ جس میں صنعت

کیا ہوا جانا اگر مسئلہ ہیرو سنا ر
پستی بخت سے تجھکو جو نہیں سب نفرت

ہم تقویم نہ آئے نہ تو اسطرلاب
طالع بد ہے اگر نیک نہ آئے ساعت

عمر سے ہو نہ کبھی چارۂ آزار نصیب
ہو سینا ہے تو کیا سینہ میں خون حسرت

دوائیں ترے نسخہ میں ہوں بہر تقدیس
نہ ہو بائی صد تاثیر نہ بالکیفیت

علم نیرنج سے گر ہوا ہے تو مخصوص نہ بچ
بے مقدر نہ ہو حاصل ثمر خوش لذت

علم سے جو سبق آموز ملک تھا وہ بھی
بخت بد سے ہوا مستوجب رجم و لعنت

ہوا مسجود ملائک یہ ظلوم و جہول
یعنی انسان قوی بخت و ضعیف الخلقت

گر نہ ہوتا تو صوفی سجادہ نشیں
بے مقدر نہ کرامت ہو نہ خرق عادت

کبھی مشائیوں سے کرتا تھا میں بحث ودی　　کبھی لیجاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت
کبھی میں نفی حقیقت میں تھا سوفسطائی　　کبھی میں معتزلی باعث رد ردیت
کبھی میں جبری و مجبور بعقل و تدبیر　　کبھی میں قدری و مختار بقدر طاقت
گہہ ملاحدہ کی تھی تردید کلام الحساد　　گہہ وجودی و شہودی سے بیان وحدت
جوں مہندس کبھی مالوف بشکل و مقدار　　جوں محاسب کبھی مصروف بضرب و قسمت
کبھی حرفوں سے تھا مطلوب مثال جفار　　کبھی کچھ نقطہ سے مقصود تھا رمال صفت
خانۂ کعبہ سے خارج کبھی شکل داخل　　شکل خارج تھی کبھی داخل بیت غربت
کبھی کرتا تھا قران مہ و زہرہ پہ نظر　　کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت
کبھی افسون و عزیمت کبھی تعویذ و طلسم　　کبھی تجویز زکوٰۃ اور کبھی قصد دعوت
کبھی تھا علم قیافہ میں یہ ادراک مجھے　　ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت
کبھی میں رہتا سرودی میں ایسا مشغول　　کہ نہ تھی ایک نفس ضبط نفس کی فرصت
سیمیا سے کبھی تصویر کش موہومات　　کیمیا سے کبھی میں زرکش گنج دولت
کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس　　کبھی علامہ کبھی صوفی صافی طینت
کبھی میں قرب فرائض سے تھا عالی درجہ　　کبھی میں قرب نوافل سے تھا والا رتبت
ماہر موسقی ایسا کہ ادا کرتا تھا　　کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت
کبھی میں شاعر غرا و ادب دان بلیغ　　نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت
کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ　　طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت
کبھی پیش نظر انجیل و زبور و توریت　　کبھی مصحف میں نظر میری سر ہر آیت
کبھی زرتشتیوں میں ایسا کہ سارے موبد　　ژند و پاژند میں کرتی تھی مری تبعیت
کبھی یہ آگہی شاستر و بید پران　　کردوں اک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت
کبھی میں ص نما و نغز میں ذی ہوش　　کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت
آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر　　عاقبت پایا تو ہاں بلہ کو اہل جنت

جابجا عالم مستی میں قدم کو لغزش ‏ دمبدم نشۂ صہبا سے زباں کو لکنت
آکے اُس رشکِ مسیحا نے کہا بالیں پر ‏ لاتنم قُم کہ یہ غافل نہیں وقتِ غفلت
خوش بختی سے نہ اتنا نمک افشاں ہو کہ ہو ‏ بادۂ میکدۂ عیش کی گم کیفیت
کیا سبب ہوتا کدورت سے نہیں کیوں خالی ‏ دل ترا شیشۂ ساعت کی طرح یک ساعت
مستی میں تو ہنس بول رہیگا کب تک ‏ صورتِ شمع سحر سوختہ روئی صورت
تنگ دل سے تری گوشۂ تنہائی میں ‏ بنگئی شعلۂ جوالہ کمند وحدت
وقت ضائع نہ کر اُٹھ بسترِ اندوہ سے تو ‏ چل درِ میکدہ تک ہے حرکت سے برکت
باطل سے نہ کر دل کو خنک تو اپنے ‏ ہے تجھے مثلِ سحر یک دو نفس کی مہلت
دیکھ تو کیا اُفقِ مشرقِ انوار سے ہے ‏ جلوہ افروز رُخِ بانوے صبحِ عشرت
ہم نہیں سر عرصہ ہے برگشتہ عناں ‏ اشہبِ یوم سبک سیر ہے سوے ساحت
جانبِ شرق ہے نوری فلق بال کشا ‏ جانبِ غرب ہے پروازِ غرابِ ظلمت
چرخِ مینائی پہ اک سبز پری کا عالم ‏ شفقِ صبح پہ اک لال پری کی حالت
نکہت گل جو ہوا میں تو ہوا عطر فشاں ‏ تازگی گل کو چمن میں تو چمن کو نزہت
کھلتے ہی جاتے ہیں سب غنچہ زہے جوشِ نشاط ‏ پھولے ہی جاتے ہیں گل بل بے ہنسی کی شدت
یہ جوش پہ ہے رحمتِ باری کہ کہیں ‏ نہ رہی کلفتِ عصیاں سے جہاں میں ظلمت
طفلِ نومشق کی مشقی کی طرح سو سو بار ‏ دھووے مستوں کے سیہ نامہ کو ابرِ رحمت
کہے یہ رند کہ او زہد فروش آگ نہ پھانک ‏ مانگے گر بادۂ نو زہد کہن کی قیمت
قُل ہوا زہد کا قلیا ہوئی زاہد کی تمام ‏ سنتے ہی قلقلِ مینائے شرابِ عشرت
اس قدر رسا زِ طرب ساز کی آواز بلند ‏ چھیڑیں گر تاج کھرج کا تو ہو پیدا دہشت
نغمہ بر لب کہیں مطرب پسرِ زہرہ جبیں ‏ جام دردست کہیں مغبچۂ مہ طلعت
لیے انگڑائی کہیں ہنسنے لگی رام کلی ‏ اُٹھی ملتی ہوئی آنکھوں کو کہیں اپنی للت
چشمِ سرمست مئے ناز میں کاجل پھیلا ‏ لبِ میگوں پہ مسی کی پڑی پھیکی رنگت

علم سے لاکھ ہو شیخی پہ تری بے تقدیر
نہ کہے کوئی سے تجھے شیخ علیہ الرحمۃ
یہ مقالات مثالِ قصص مصنوعہ
ہوئے یکبار جو افسانۂ خوابِ غفلت
لگ گئی آنکھ مری دیکھتا کیا خواب میں ہوں
کہ مجسم نظر آئی ہے نویدِ بہجت
اللہ اللہ رے حسن اس کا کہ سرتا بقدم
تھا وہ خالق کا تماشائے ظہورِ قدرت
یاد کرتا قدِ رعنا کو ہے اُس کے زاہد
دمِ تکبیر جو کہتا ہے سدا قد قامت
چشم وحشی کو اگر اپنی وہ دکھلائے تو ہو
چشم آہو سے ہرن نشۂ جامِ وحشت
دلِ شامت زدہ کے درپئے تدبیرِ ہلاک
زلف واژوں بھی وہ رخسار پہ واژوں قسمت
آتشِ حسن سے اک شعلۂ سرکش بینی
موجۂ دود لطیف اُسکی بھووں کی حالت
فوجِ مژگاں وہ بلا ہو دے صف آرا تو کرے
دستِ بیداد سے یکدست دو عالم غارت
چاہِ بابل وہ ذقن اور دھواں لف کا عکس
دل گرفتارِ عذاب اس میں ہو ہاروت صفت
لعلِ شیریں کی حلاوت پہ جو دے جاں عاشق
تو دمِ نزع بھی عناب کا چاہے شربت
نہ دمِ شرم تبسم سے لبِ اُسکے خوگر
نہ تغافل سے اُن آنکھوں کو نگہ کی عادت
کھولدے معنیٔ معدوم کمر کی جنبش
واکرے عقدۂ موہوم لبوں کی حرکت
شوخی و نازکی تعریف میں اس کی مطلع
وہ پڑھوں میں کہ جسے سُنکے ہو دل کو فرحت

شوخی اُس چہرے میں یوں گل میں ہو جیسے حمرت
نازوں چشم میں نرگس میں ہو جیسے نکہت

لبِ پاں خوردہ کی شوخی کے ہے آگے اک بات
گر لگا دے وہ مسیحا پہ بھی خوں کی تہمت
نازک اندام وہ اور سنگدل اُن سے بھی سوا
آیا جن سنگدلوں کے لئے ہے نثمّ قست
سیلی سینہ پہ نہ تھی جدِ پسِ پشت کا عکس
نظر آتا تھا صفائی سے الف کی صورت
چینی رنگ کا وہ اپنے دکھا کر عالم
ایک عالم کا ہو دل لیکے بغل میں چنپت
اللہ اللہ رے تری تمکنت اُف رے تمیز
واہ رے تیرا تجنتر تری بل بے نخوت
قہرِ انداز بلا نازقیامت طنازہ
سحر چشمک ستم ایما و کرشمہ آفت

ماہِ نو ایک فلک پر ترے نو بردوں میں — تو فلک تو رواں ہیں ترے قدیم بخدمت
کیسۂ گوہرِ انجم ترا صرفِ انعام — طاقۂ اطلسِ گردوں ترا وقفِ خلعت
نیتِ نیک تری آئینۂ حسنِ عمل — عملِ خیر ترا جلوۂ حسنِ نیت
ذہنِ عالی ہے ترا طائرِ شاخِ سدرہ — طبعِ رنگیں تری گلچینِ ریاضِ جنت
تیرا انفعال جہاں کے لیے برہانِ کرم — تیرا اکرام زمانہ کو دلیلِ رحمت
علمِ ظاہر سے ہے یکساں تجھے دور و نزدیک — ذرہ باطن سے برابر ہے حضور و غیبت
ذہنِ صافی سے ترا پردہ دریِ غیب — موشگافی ہے تری کوہ شگافِ دقت
عقل میں شمس سا ہے تو علم میں کانِ گوہر — نقل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت
تری تدبیر ہے از دفترِ ہوش و فرہنگ — تیری شمشیر ہے از جوہرِ فتح و نصرت
دعوتِ صدق پہ لائے تری ایمان تصدیق — دستِ ہمت پہ کرے تیرے سخاوت بیعت
جس سے راضی ہے خدا اور خدا کے محبوب — تیرا حامی ہے نبیؐ اور نبیؐ کی عترت
عزم کو ہے ترے ہر عزم میں عزم بالجزم — قصد کو تیرے ہے ہر قصد میں قصدِ سبقت
قوتِ روحِ ملائک چمنِ قدس میں ہو — ذاتِ قدسی کا تری عطر قبائے عفت
کیا اللہ نے جب تجھ سا ولی نعمتِ خلق — کیونکہ واجب نہ خلائق کو ہو شکرِ نعمت
نطقِ شیریں سے تری عام حلاوت ہو اگر — ثمرِ تلخ ہو حنظل کا سبوئے شربت
شوکتِ عقربِ جرارہ کی مانند رہے — دلِ حاسد میں خلش گر ترا رشکِ شوکت
روشِ شیشہ ہر اک سنگ ہو ریزہ ریزہ — پڑے البرز پہ گر گرز کی تیرے ضربت
سر کشف وار چھپاتا ہے فلک زیرِ سپر — کیا غضب ہے تری شمشیرِ غضب کی ہیبت
آئے طوفاں جو ترے قہر کا طغیانی پر — کشتیِ نوح بھی اعدا کو ہو گرداب صفت
وہ تری تیغ کی برش ہے کہ سایہ جس کا — کردے اک دم میں ہیولیٰ سے مفارق صورت
تیرا بدخواہ رہے حرز سے یاں تک محروم — دیں نہ تعویذ اسے تا بہ نشانِ تربت
آسیا وار پھرے کیوں نہ فلک گردش میں — تیرے توسن کی جو کاوش کی اڑا جائے پھرت

صبح تک آیا نظر بن مہ و انجم جب رات
ہو گیا زرد رخِ شمع و شبستانِ خلوت

چونکے مرغِ سحری جوش سے آواز خروس
ہو گئی خواب کو آوازۂ کوسِ رحلت

باغِ عالم میں ہوا غلغلۂ اولی اجنحہ تک
مثلِ مرغانِ سحر نغمہ طرازِ عشرت

دی ہے مسجد میں مؤذن نے اذانِ ہر نماز
باوضو ہو کے نمازی نے ہے باندھی نیت

ہوئی بتخانے سے ناقوس کی پیدا آواز
چلے مینا کو برہمن کوئی لے کر مودت

اُٹھے میخوار صبوحی کے لیے لے کے سبو
کہ عداوت ہے اگر کیجیے ترکِ عادت

اک طرف سے ہوئی گھڑیال کی آواز بلند
ایک جانب سے لگی آنے صدائے نوبت

سحرِ عید ہے اک عید کا سامانِ نشاط
روزِ شادی کی ہے آمد شبِ غم کی رخصت

آج وہ دن ہے کہ آغوش میں لے کر تجھ کو
گئے طوبیٰ تک ہر شاہدِ طوبیٰ قامت

اب ہیں بیدار ترے بخت مددگار نصیب
اب تو دی ہیں ترے طالع تری یاور قسمت

فلک کر تہنیتِ عید کا اس شاہ کے تو
دور میں جس کے ہے ہر صبح صباحِ دولت

وہ شہنشاہ بہادر شہِ کسریٰ انصاف
خسروِ جم خدم و داورِ دارا حشمت

قوتِ ملت و دیں قامعِ کفر و الحاد
حامیِ شرعِ نبی ماحیِ شرک و بدعت

حکمِ شرعی سے کرے سلب و حسبِ ذوق
مردِ مجذوب سے گر ترک ہو سترِ عورت

کون اُس کا نہیں وصافِ صفاتِ نیکو
کون اُس کا نہیں سرگرمِ ثنا و مدحت

سنتے ہی میں نے بھی وہ مطلعِ روشن لکھا
مطلعِ صبح کو ہو سامنے جس کے خجلت

متصف ذات ترا اے سایۂ رب العزت
کھولے ہے نعمتِ علیا کا درِ نعمت

تیرا دروازۂ دولت ہے مقامِ امید
تیرا دیوانِ عدالت ہے محلِ عبرت

تیرا ایوان ہے زینِ صدر و رونق
تیری نیت چمن آرائے ہزار امنیت

تیرے عشرت کدہ میں بار کسے غیر نشاط
تیرے خلوت کدہ میں دخل کسے جز طاعت

صفحۂ علم پہ برجیس سے تو ہم زانو
حجلۂ عیش میں ناہید سے تو ہم صحبت

حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش — دستِ حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج
شش جہت پر جو ہے غالب تر اسرِ پنجۂ امن — فتنہ کو اُٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج
نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے — ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج
تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم — صفحۂ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج
لایا ہے سعیِ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ — ذوق جو مدح و ثنا میں ہے تری گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ — رنگِ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نارنج
بزمِ رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز — اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

## قصیدہ نمبر ۱۶

۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اُس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسلِ صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا تھا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر دینگے ؎

مے دو سالہ و محبوب چار دہ سالہ — ہمیں بس است مرا صحبتِ صغیر و کبیر

اسی عرصہ میں ایک دن میں گیا تو جو شعر بے جوڑ پڑے تھے انہیں ترتیب دیا تھا۔ اسلئے اُنہی میں قطعہ پڑھا

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہِ عیش و نشاط — کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھے ہیں بدرِ منیر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبریٰ — نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اب بھی وہ شعر؟ میں نے کہا۔ اب کیا ضرورت رہی آنکھیں بند کر کے فرمایا۔ یہ اُدھر ہی کا فیضان ہے!

اس قصیدہ پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر، اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی عنایت فرمایا۔

کیا ترے فیل کے اوصاف لکھوں میں کہ وہ ہے
ابر رفتار جبل پیکر و گردوں رفعت

اُس کی خرطوم ہے گر طرۂ لیلیٰ کی مثال
تو ہیں دندانِ صفا ساعدِ سلمیٰ کی صفت

کیا عجب گر ہو تپِ لرزۂ ہیبت سے تری
نبض کی طرح رگِ سنگ میں پیدا سرعت

آبِ بارانِ کرم تیرا ہے وہ شربتِ خضر
برسے لالہ پہ افیوں میں نہ ہو سمیت

عدل کے لفظ کو دیتا نہیں نقطہ کوئی
عدل سے تیرے جو موقوف ہے رسمِ رشوت

عہد میں تیرے عجب کیا سرِ داغِ دلِ شمع
شعلہ میں مرہمِ کافور کی ہو خاصیت

پنجۂ گربہ سرِ بچۂ موش و گنجشک
ہے حمایت سے تری دایہ کا دستِ شفقت

دورِ انصاف میں گر تیرے ہو کشتہ سیماب
ڈلیا شیشہ پہ پڑے دینی ہوس کو دیت

دیا اللہ نے وہ قلبِ مصفّا تجھ کو
اے شہنشاہِ صفا ذہن و سراپا صفوت

فردِ تفصیل جو آج ہے رخِ حاجتمند
عرضِ حاجت کی نہیں سامنے تیرے حاجت

عید کو دیکھ ترے ساتھ خلائق کا ہجوم
کہے عارف کہ یہ کثرت میں ہے ظاہر وحدت

لکھے گر خامہ ترا وصفِ شمیمِ اخلاق
تو ہر اک نقطہ ہو اک نافۂ مشکِ تبت

منتہی ہوں نہ کبھو تیرے صفاتِ نیکو
گر بیاں کیجیے تا حشر صفت بعد صفت

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
کہ زباں کو ہے نہ یارا نہ قلم کو طاقت

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں
با شکوہ و حشم و جاہ بعمر و صحت

خیر خواہوں کے ترے چہرے پہ ہو رنگِ نشاط
اور بدخواہوں کے رخسار پہ اشکِ حسرت

## قطعۂ تہنیتِ جشنِ نوروز

خسروا اُن سے ترا مژدۂ جشنِ نوروز
آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج

خبرِ عیش تری دی ہے چمن کو سب کر
زرِ گل پیکِ صبا پائے نہ کیونکر پارنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج
تا بپیرانِ کہن سال پہ ہر چینِ شکنج

چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر
آگے ہمت کے تری گوہرِ شہوار کے گنج

نہ کیونکہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع ‏ ‏ ‏ ‏ کہ آتی ہے نظر اک قدرت خدائے قدیر

ظہور نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم نکہت گل مظہر لطیف و خبیر

شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں ‏ ‏ ‏ ‏ کہ فرش سبزہ ہے زمیں تا گرد عبیر
حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں ‏ ‏ ‏ ‏ بنا ہے عالم بالا بھی عالم تصویر
جہات ستہ سے بزم جہاں ہے وسعت خواہ ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ہے جو مرکز خاک و سپہر جسم صغیر
زمانہ دشمن عشرت کا اس قدر قاتل ‏ ‏ ‏ ‏ مہ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر
ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہ عیش و نشاط ‏ ‏ ‏ ‏ کہ شمس بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ ‏ ‏ ‏ ‏ نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر
زمین میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ان شہ سے ہو دیوار قہقہہ تعمیر
دیا ہے شیخ کو دھو تیرے غسل صحت سے ‏ ‏ ‏ ‏ ضمیر خلق سے دامن بہ شاہ پاک ضمیر
عجب نہیں یہ ہوا ہے کہ مثل نبض مسیح ‏ ‏ ‏ ‏ کرے اگر حرکت موج چشمۂ تصویر
شفا تھا ترے یمن شفا سے کامل تھے ‏ ‏ ‏ ‏ جو لا علاج مرض تھے وہ ہیں علاج پذیر
کہ چوب گل کو اگر مارے بید مجنوں پر ‏ ‏ ‏ ‏ تو ہووے بید بھی ہوشمند فوق التقدیر
اشارہ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیان کرے ‏ ‏ ‏ ‏ زبان برگ سے غنچوں کے خواب کی تعبیر
جمیل کحل بصارت ہو کلک خط غبار ‏ ‏ ‏ ‏ تو چشم دائرہ عین بھی ہو چشم بصیر
نہ موج مے کو ہو پیچش نہ شیشہ لے ہچکی ‏ ‏ ‏ ‏ گئی جہاں سے یہ بیماری نواق و زحیر
نہ برق کو تپ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام ‏ ‏ ‏ ‏ نہ آب میں ہو رطوبت نہ خاک میں تبخیر
بدل گئی ہے حلاوت سے تلخی دارو ‏ ‏ ‏ ‏ شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر و شیر
قوی ہے قوت تاثیر سے دوائے طبیب ‏ ‏ ‏ ‏ غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر
ق
شکست دل کو ترے یمن تندرستی سے ‏ ‏ ‏ ‏ کرے درست اگر مومیائی تدبیر
تو ٹوٹے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضا ‏ ‏ ‏ ‏ نکالے کاسۂ چینی سے مثل موئے خمیر

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر / عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو / نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر
ہوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش / کلید قفل دل تنگ و خاطر دلگیر
کرے ہے وا لب غنچہ در ہزار سخن / چمن میں موج تبسم کے کھول کر زنجیر
کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں / جو وا ہو غنچہ منقار بلبل تصویر
قفس میں بیضہ کے بھی [illegible] نغمہ سنجی سے / عجب نہیں کہ ہو مرغ چمن بت نہ صفیر
اثر سے باد بہاری کے [illegible] سا تے ہیں / زمیں پہ [illegible] ہے موج نقش حصیر
نکل کے سنگ سے اگر ہو شرر [illegible] تخم فشاں / تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر
زمیں پہ گرتے ہی [illegible] / جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر
ہوا ہے دور تا ہے [illegible] / کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر
نہ خار دشت ہے زمیں میں خواب مخمل ہے / ہر ایک تار رگ سنگ بھی ہے تار حریر
ہوا میں ہے یہ طراوت کہ [illegible] / برستا اٹھتا ہے آتش سے مثل ابر مطیر
یہ آیا جوش میں باران رحمت باری / کہ سنگ سنگ میں [illegible] کی ہے تاثیر
ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغر عیش / ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر
ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی [illegible] آب / ہر اک گہر شب چراغ پر تنویر
کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کیساتھ / کہ جس طرح ہم آمیختہ ہوں شکر و شیر
سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو / سواد مشک ختن پر ہے لاکھ آہوگیر
نہال شمع سے ہر شب چنے گل شبتو / بہار عیش میں گلچیں کی طرح ہے گلگیر
بنے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں / سیاہ رنگ گل آفتاب ہو تغییر
رہے ہے چرخ پہ ہر تیغ جوں ہلالی کش / [illegible]
عجب نہیں ہے کہ آرائش [illegible] سے / حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر
چمن میں ہے یہ درختان سبز پر جوبن / کہ زہر کھاتے ہیں سبزان خطۂ کشمیر

ترا توسن بھی یوں ہی ہے داخلِ جنات
کہ جیسے جنت اصحاب کہف میں قطمیر

کرے ہے سلب تغیر کو ذات حادث سے
زمانہ عدل سے تیرے یہ اعتدال پذیر

خیال کیا کہ ترے عہد میں شرر کی طرح
اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشی [illegible]

ہوا میں آ کے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ
تو [illegible]

ترے نسق سے نہ بالکل رہی جو خونریزی
لڑائیوں میں کہیں ہوتی نہیں [illegible]

[illegible]
بلند [illegible] قوس [illegible]

[illegible] نے ترے عہد [illegible]
کہ کوئی زلف بتاں [illegible]

[illegible] رنگ
جو [illegible]

[illegible]
ہے [illegible]

[illegible] تیری تیغ آتش دم
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
طلب میں جان [illegible]

ق
[illegible] لکھا [illegible]
جو کھینچے اک روش خط [illegible]

[illegible] اشکال [illegible]
[illegible] دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر

ق
[illegible] ترے خط [illegible]
[illegible] سے [illegible] تحریر

[illegible] عبارت [illegible]
[illegible] تقدیر

رقم میں گر ترے اوصاف کے قصور کرے
زبان خامہ عطارد کی [illegible]

ق
ترا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقت خرام
[illegible]

[illegible] روزہ
اور اس کا شرق سے [illegible]

ترے [illegible] کی تعریف [illegible] لکھوں
کروں حکایت شیریں [illegible] تحریر

کہ فیل [illegible] فرہاد
وہ دونوں دانت [illegible] جوئے شیر

کھلا ہے [illegible] میرکشش کا — علاج خارش سر ہو بنا [illegible]
بنا ہے نقش شفا خانہ ہزار شفا — ہر ایک خانۂ تعویذ صاحب تاثیر
ہر ایک اسم عزیمت میں اسم اعظم ہے — ہر ایک نسخۂ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر
[illegible] — پہنچے جو تیرے تصدق میں [illegible] اسیر
[illegible] زندہ کی [illegible] — یہ تیرا دم ہے وہ اعجاز عیسوی تاثیر
[illegible] ہے مدت و دیں — جہاں میں تیرے [illegible] ہو [illegible] متوال [illegible]
[illegible] زمانہ میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
[illegible] ایک جہاں — کیے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر
[illegible] — تمام کرتا ہے [illegible] روز ایک گنج [illegible]
[illegible] — [illegible] زیب نہیں [illegible] منیر
[illegible] — [illegible] جہاں میں [illegible]
[illegible] — [illegible] طویل [illegible]
[illegible] — [illegible] کی طرح [illegible]
جہاں کو یوں تری مدحت نے ساتھ [illegible] — [illegible] ہو مع تفسیر
[illegible] — [illegible] کی طرح بدن [illegible]
پڑھوں [illegible] اب وہ مطلع روشن — کہ [illegible] مطلع خورشید بھی [illegible]

شہنشاہا تری روشنی رائے منیر
عقول عشرہ کے انوار ہیں کے عشر عشیر

جو [illegible] — تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر
جو ہیں نکات و معانی بشر کے فہم سے دور — وہ تیرے ذہن میں موجود ہیں قلیل و کثیر
اگر ہے [illegible] حافظہ میں تو یہ — نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر
حیا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ — تو ہے ضمیر کی جانب تری صفائی ضمیر

غیر بے مایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس
بن گیا ژالہ جو آگ سے نہ پگھلا گوہر

جوہرِ خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب
خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھہرا گوہر

سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغز وقار
جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر

ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد
ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خارا گوہر

دلخراش اور ہے طاقت دہِ دل ہے بخدا
کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

فیض کو عالمِ بالا کی ہے شرط استعداد
قطرہ بجائے طباشیر ہے بنتا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرطِ نظر
کور کیا جانے یہ بینا ہے کہ جھوٹا گوہر

صافِ باطن کی موجب قدر کہ ظاہر ہو درست
ہو دل بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی غربت میں اگر قدر تو کشش جوہر کی
تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

خلشِ خارِ جنوں سے ہے پرو تا کیا کیا
ہر قدم پر ہے زرِ آبلۂ نشتر کا گوہر

دلِ عاشق میں کرے کیونکہ نہ آنسو سوراخ
اسی الماس سے بنتا ہے پرونا گوہر

ذوق موقوف کر اندازِ عشرت جوئی کو
ڈھونڈ اس بحر میں اب تو کوئی نرالا گوہر

غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر
آگے تقدیر ہے خرمہرہ ملے یا گوہر

اثرِ مدح ہے اس خسروِ دریا دل کے
کہ سخن قابلِ ارشاد ہے دانا گوہر

وہ بہادر شہِ غازی کہ برنگِ نیساں
روز برسائے ہے ابرِ کرم اس کا گوہر

جشن سے اس کے ہے اک فیض کا دریا جاری
بنتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر

زیب آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو
بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر

پہنچے گر گوشِ صدف تک یہ نویدِ عشرت
اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر

کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی کہ اس دور میں کاش
ہوتا میں دانۂ انگور نہ ہوتا گوہر

ہے دلِ آب میں کثرت سے حبابوں کے بھر
مانگ میں مثلِ بتِ خوشتن آرا گوہر

ڈالتا ہے کشمکشِ عیش سے جو سچ کا ہار
بھر دیے شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر

گل شگفتہ ہیں یہ قطرۂ باراں سے بہار
بھر دیے درجِ یاقوت میں گویا گوہر

چلے نہ اشرفیِ آفتاب عالم میں
خطِ شعاع سے اُس پر جو یہ نہ ہو تحریر

ابوظفر شہِ والا گہر بہادر شاہ
سراجِ دینِ نبی سایۂ خدائے قدیر

شہِ بلند نگہ شہریار والاجاہ
خدیوِ مہر کلہ خسروِ سپہر سریر

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت نصیر

زمیں جو سبز ہو تیرے سحابِ بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے ہر خاک کے بنے اکسیر

ق
بچشمِ مہ اگر تیرا نیرِ اقبال
کرے نگاہ کرے سیر آبجو و آبِ غدیر

تو قرصِ شمس سے ہو ماہیوں کی نذرِ نثار
نگین دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر

نہ ہے ثنا کے لیے تیرے اختتام و تمام
نہ ہے دعا کے لیے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوقِ ثنائے مدح خواں تیرا
غلام پیرِ کہن سال اک فقیر حقیر

کرے جب دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سُنا ہے جب سے کہ رحمِ خدا دُعائے فقیر

الٰہی آب پہ تا ہو زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدویر

فلک کو چھوڑے نہ تا دامنِ مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامن گیر

عطا کرے تجھے عالم میں قادرِ قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل
سپاہ وافر و ملکِ وسیع و گنجِ خطیر

## قصیدہ نمبر ۱۷

ہیں مری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر
اک ٹھہر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظرِ خلق سے چھپ سکتے نہیں اہلِ صفت
تہِ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو درخورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو
مرغ کو دانہ ملا جنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت
غرق ہے آب میں پر تر نہیں ہوا گوہر

ہے دلِ صاف کو عزلت میں بھی گردوں کے غبار
گرد آلود نہیں ہو اتنہا گوہر

کور باطن کو ہو کیا جوہرِ دانش کی شناخت
کہ پرکھتا نہیں جُز دیدۂ بینا گوہر

ترے دوران حفاظت میں [illegible]
[illegible] سب کا گوہر

[illegible] زلف کے کانٹے [illegible]
[illegible] میں [illegible] زلف [illegible] گوہر

سینہ [illegible]
[illegible] ترے [illegible] گوہر

نقد و خانہ [illegible]
[illegible] عشاق کے [illegible] گوہر

[illegible] دریا [illegible]
[illegible] گوہر

[illegible] بلندی [illegible]
[illegible] زیادا گوہر

[illegible] آب [illegible]
[illegible] گوہر

[illegible] دم [illegible]
[illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

[illegible] غضب سے ترے [illegible]
[illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

سینۂ ساقی [illegible]
دل کا [illegible] گوہر

[illegible]
[illegible] گوہر

[illegible] میں جو لعل سب ترے [illegible]
[illegible] گوہر

ذوق [illegible]
[illegible] سنگ سے لعل [illegible] پیدا گوہر

[illegible] خورشید [illegible]
[illegible] شب عقد ثریا گوہر

[illegible]
[illegible] میں شب [illegible] گوہر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوا دم صبح
[illegible] گوہر

[illegible] مبارک ہووے
برسیں نیسان کرم سے ترے شاہا گوہر

موج کی [illegible] | [illegible] غنچہ [illegible] گوہر
[illegible] ساقی [illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] لطافت [illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] میں کروں [illegible] مطلع [illegible] | [illegible] گوہر

[illegible] گوہر
[illegible] دریا گوہر

[illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] | [illegible] گرا تھا گوہر
[illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] | [illegible] تھا گوہر
[illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] | [illegible] گوہر
[illegible] لیے | [illegible] کیا [illegible] گوہر
[illegible] | [illegible] گوہر

ق

عکس سے تیرا اقبال کے دریا میں ترے | اے مسیحا کرم و جود کے [illegible] گوہر
آب گوہر ہو تو ہو آب یہ اعجاز نما | لطف دریا کو [illegible] گوہر
کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبت عدل | [illegible] پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر
طبع نازک پہ تری بار گہر ہو جو گراں | دست [illegible] گوہر
آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب | ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر
آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے | لگن شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر
دست فراش میں جاروب ہے ریش فرعون | فرش پہ تیلیوں میں الجھے ہیں صدہا گوہر

دور میں اُس کے ہو گر مرتکبِ مے کوئی
کرے ہر قطرہ کلیجے میں خراش الماس

مے اگر آبِ بقا بھی ہو تو ہو وہ زہراب
جس کے پینے سے ہو جینے ہی سے میخوار کو یاس

دعوے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جرّاح
تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

کہتے اس آبِ شر انگیز کو ہیں آج بشر
کہ یہ روغن ہے سرِ آتشِ شرِ خنّاس

تا نہ باقی رہے مے اور نہ مے میں مستی
توڑتا سنگِ نمک سے ہے وہ شیشہ کا گلاس

احتساب اس کا جو دے سنگ پہ شیشہ کو پٹک
تو صدا ہو نہ ملیدا اُس سے بجز حمد و سپاس

مدح حاضر ہیں پڑھوں اُس کے کوئی مطلع میں
کہ سخن فہم و سخنور کا ہے وہ قدر شناس

نطقِ شیریں وہ ترا شہد کہ ہر درد کو راس
شان میں جس کے شہا فیہ شفاء للنّاس

ہندوی زلف کے ہے پاس سیہ مصحفِ رخ
عہد میں تیرے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

مومیائی ہو حمایت ترے حق میں اُس کے
سخت گیری سے فلک توڑے کسی کی گر آس

بوئی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آ سکے
بل بے ہمت ترے نزدیک یہ ٹھہرے وہ گھاس

چمنِ دہر میں نرگس بھی تری بخشش سے
رکھتی اک کاسۂ زر ہے اور اک سیمیں طاس

کیا عجب فیض سے گر ابرِ کرم سے تیرے
بید مجنوں میں ہو پیدا ثمرِ سیب و گلاس

تیری شمشیر کے آگے نہیں ٹکتی ہرگز
سپرِ تیغ مہِ نو کی شہا رتبۂ داس

فیضِ تعلیم سے تیرے ہو جو منکر انساں
احمق النّاس اُسے جانے ملک و نسناس

لوحِ تقدیر کے لکھے کو پڑھے حرف بحرف
تربیت سے تری اُمّی بھی ہو یہ حرف شناس

یوں ترا حاسد بد عیب ہے عالم میں حقیر
اسپِ بد ذات کوئی جیسے میانِ نخّاس

دیکھے آہو کو جو ضیغم تو وہیں عدل ترا
ڈھانک دے آنکھوں کو اُس کی روشِ گاؤ خراس

زہے خورشید کے طالع کہ شعاعِ خورشید
دمِ تزئین ترے گھوڑے پہ لگے جل سے طاس

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اُ...
جس طرح عاشقِ دل باختہ کے ہوش و حواس

پہنچے اس رخشِ فلک سا...
...اس

دوستوں کو ہو ترے گنج گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوہر

## قصیدہ نمبر ۱۸

ہے وہ جاندار وے مے نافع اعضا و حواس
کہ دل مردہ ہو زندہ تن بے حس حساس

قطرۂ مے سے ترقی حواس خمسہ
یوں ہو جس طرح کہ اک نقطہ سے ہوں پانچ پپا

ہو دسے اس دغن کبریت سے مثل زر سرخ
رنگ رخسار جو کلفت سے ہو ہمرنگ نحاس

خشک مغزوں کو جو ہو بوے گلاب اس کی بو
تر دماغ اتنا ہو دم لینے نہ دے فرط عطاس

قلب ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو تو کیوں
قلب انساں میں تھوڑے سے مبدل ہو ہراس

اس کی دولت سے عجب کیا دل مفلس ہو غنی
کہ یہ ہے شربت دینار علاج افلاس

دیوے ساقی جسے اک جام وہ دعوے سے کہے
آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس

اللہ اللہ رے تری مستی و بالادستی
شب کہے مست کو کر لولی گردوں کے مساس

سلسبیل آ کے اگر خلد سے ہو آب سبیل
کیے ہے نوش کہ بجھتی ہے کہیں اس سے پیاس

زندگانی سے ہے مقصود شراب و ساقی
اور باقی تو ہے سب وہم و خیال و وسواس

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو
پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفاس

بیٹھ گوشہ میں نہ تو چھوڑ کے اس جلسہ کو
دیکھ زندان خرابات نشیں کا اجلاس

ہے نہیں برقع مینا میں مگر جلوہ فروز
کہ لی خورشید لقا ہے شفقی رنگ لباس

ہے خنک دل کبھی تو اس سے ہو سرگرم نشاط
غم کو جا دل میں نہ دے جی کو نہ رکھ اپنے اداس

[illegible] جو گھر غم کا ہو کیا اس میں ہو سرمایۂ عیش
وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلے میں چیل کے ماس

دل [illegible] وسوسے کی ہوتی ہے مے سے واشد
کھلتا ہے ہاتھ سے ساقی کے یہ قفل وسواس

یہ کہتا ہی تھا جو دل نے مرے مجھ سے کہا
توبہ کر توبہ نہ کرا اتنی زیادہ بکواس

[illegible] ابد اقبال کا تو نام نہ لے
[illegible] بادشہ پاک انفاس

[illegible]
[illegible] کر کیا محکم اساس

نازک ایسی کمر اُس کی کہ سمجھنا مشکل
جس طرح شعر خیالی میں ہوں معنی ادق

ہے گراں اس پہ نزاکت سے نہ باندھے ہرگز
گر ہو تارِ نظر دیدۂ عنقت منطق

اُس کا زانو وہ مصفّا کہ اگر دیکھے اُسے
آئینہ آبِ خجالت میں رہے مستغرق

کیا کہوں ساقِ بلوریں کی صفائی اُس کی
شمع گر دیکھے اُسے شرم سے آجائے عرق

قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن
نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق

آکے بالیں پہ وہ طنّاز سراپا انداز
مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگیں ناحق

مژدۂ عید سے ہے گلشنِ عالم میں بہار
نغمۂ عیش سے ہے بزمِ جہاں میں رونق

دوش پر سرو لبِ جو کی ہے اک سبز قبا
بر میں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں ملق

جوشِ سبزہ سے ہے وہ فرشِ سرِ صحنِ چمن
کوئی مخمل اسے کہتا ہے کوئی استبرق

باغِ عالم میں ہے یہ جوشِ بہارِ عشرت
ٹپکے ہے نخل سے مستی میں ہمیشہ راوق

تو بھی کر تہنیتِ عید کا اُس کے ساماں
کہ ہے وہ خسروِ دیں حامیِ دینِ برحق

وہ بہادر شہِ غازی کہ دمِ معرکہ ہوں
اُسکے تیروں کی صدف اُسکے حسودوں کی صدق

مدح اُس کی ہے مناسب تجھے بلکہ انسب
یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق

سُن کے یہ میں نے کہا مدح میں اُسکی مطلع
جس پہ تحسین کہیں مجھ کو لبید و عمق

تو ہے وہ نائبِ ختمِ رُسُل اے سایۂ حق
کہ ترے سایہ میں ہے گلشنِ دیں کو رونق

ابرِ رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق
کیونکہ سایہ میں ترے ہو نہ جہاں کو رونق

کس کا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو
جو ترا امر ہے الحق جو کہے تو صدق

ذکرِ حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور
کرتا میخانہ میں ہے شیشۂ مے بھی حق حق

گر کرے نشو و نما نامیۂ فیض ترا
گل جو ہو شمع سے پیدا تو گلاب و زنبق

حرفِ ہیبت کا تری کوئی زباں پر [illegible]
ہو گئی وقتِ کتابت جو زباں خامہ کی شق

نطقِ شیریں سے ترے ہو کے [illegible]
[illegible]

تیرا ہاتھی ہے فلک کا کہکشاں ہے خرطوم
کان دو نو مہ و خور دم ہے ذنب سر ہے راس

ذنب و راس وہ جن سے ہوں سیہ بخت عدو
ماہ و خوردہ کہ ہوا خواہ ہوں روشن انفاس

رنگ ہاتھی کا سیہ اور وہ دانت اُسکے سفید
کہتا ہے دیکھ کے یہ ظلمت و نور اپنا قیاس

طرفہ صنعت سے لپیٹا ہے شب یلدا نے
صفحۂ صبح منور کو مثال قرطاس

ق

ختم کرتا ہے سخن ذوق دعا پر اس طرح
تا ہو دریا میں گہر کان میں پیدا الماس

تو شہ بحر و بر اے شاہ سکندر فر ہو
دے خدا عمر خضر تجھکو حیات الیاسؑ

عید ہر سال ہو سنج تجھے باعیش و نشاط
تو ہمیشہ رہے خوش اور ترا بدخواہ اُداس

## قصیدہ نمبر ۱۹

ایک خورشید لقا طرفہ جوانِ ارشق
تاب رخسار فلق سرخی رخسار شفق

وہ جبیں ماہ مبیں اُس پہ خطِ چین جبیں
تھی وہ انگشت نبی جس نے کیا ماہ کو شق

کرے دو ٹکڑے جگر کھینچ کے ابرو تلوار
باندھکر کھینچ لے دل زلفِ مسلسل کی دہق

تیر انداز جو مژگاں تو ادا دشنہ گذار
چشم ابلق تو نگہ ترک سوار ابلق

غمزہ و ناز کرشمہ وہ بلا غارت گر
کہ نہ چھوڑیں تنِ عشاق میں جاں ایک رمق

سروِ قامت سمن اندام گلستاں رخسار
ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق

سروِ قامت سے اگر اُسکے ہو طوبی سرکش
راست ہاں است ہے یہ کُلُّ طَوِیْلٍ اَحمق

شکر آمیختہ بادام مقشر دنداں
سیب فردوس زنخداں لب خنداں فستق

کھلنا اُسکے دہنِ تنگ کا ایسا مشکل
جیسے دشوار ہو مفہوم کلام معلق

مصحف روے کتابی کو جو دیکھو اُس کے
تو کہیں صورتِ اخلاص نہ پاؤ مطلق

لبِ رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاض گردن
تاکہ ہو سرخی سنجرف نہ خونِ ناحق

[illegible]ست و بازو و بر و دوش عجب صبح بہا
پنجہ و پنجۂ [illegible]شید و حنا رنگ شفق

[illegible] تا نات صفا آب گم[illegible]
[illegible] اس میں بجائے ورق

خدا نے دی اور خود دوسرا انجام کیا۔ اللہ اللہ ان دنوں کا جوشِ طبع بھی یاد رہے گا عجیب عالم تھا۔

ہے آج جو یوں خوشنما نورِ سحر رنگِ شفق
پر تو ہے کس خورشید کا نورِ سحر رنگِ شفق

یہ جوشِ نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن
گلشن میں گویا چھا گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن زیبِ چمن شانِ چمن
ہر سیمبر گلگوں قبا نورِ سحر رنگِ شفق

افشاں جبیں پر سر بسر مہتاب و انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نورِ سحر رنگِ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوشِ بہار و موجِ گل
دندانِ پاں خوردہ ہیں یا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر مجمعِ پیر و جواں اک طرفہ مشرق ہے کہ داں
روشن دل و رنگیں ادا نورِ سحر رنگِ شفق

جامِ بلوریں میں ہے یوں عکسِ شرابِ لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

حسنِ محل و مہتاب نے جوشِ گل سیراب نے
کیا باغ میں چمکا دیا نورِ سحر رنگِ شفق

دیکھے چمن میں برگِ گل آلودۂ شبنم جو کل
خجلت سے پانی ہو گیا نورِ سحر رنگِ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی
کس رنگ ہوں ملکر جدا نورِ سحر رنگِ شفق

ساقی مے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پہ
آب و ہوا جائے فزا نورِ سحر رنگِ شفق

جشنِ بہادر شاہ ہے روزِ علو جاہ ہے
ہے اسلیے بہجت فزا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ خسروِ روشن گہر جس کو خجل ہوں دیکھکر
ماہ و ثریا و سہا نورِ سحر رنگِ شفق

اک صاف مطلع میں لکھوں اور وہ ثنائے رنگ دوں
ہوں دیکھکر غرقِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نورِ سحر رنگِ شفق
ذرہ ہے تیرے فیض کا نورِ سحر رنگِ شفق

اے آفتابِ عز و شاں تیری جبیں سے ہے عیاں
نوِ نقشِ رنگِ حیا نورِ سحر رنگِ شفق

روشن بیانی سے تری رنگیں کلامی سے تری
شرمندہ ہوتا ہے سدا نورِ سحر رنگِ شفق

وہ سیمگوں ایواں ترا وہ سائباں رنگیں گھچا
لیں دام اب جیں سے صفا نورِ سحر رنگِ شفق

فانوسِ شیشہ بعلگوں روشن تری محفل میں یوں
گویا کہ شیشہ میں بھرا نورِ سحر رنگِ شفق

ناتوانوں کو جو دے زور حمایت تیری — مارے لات اُڑ کے سرِ پیل دماں بچۂ بق

کہتے ہیں برق جہاں جس کو وہ ہے اک ادنیٰ — توپخانہ میں ترے توپ پہ زریں بیرق

کوتہی جس پہ کرے کاہکشاں کی بھی کمند — وہ تری ہمتِ عالی کا ہے عالی جوسق

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحابِ ہمت — بوٹی اکسیر کی پیدا ہو بجائے سرق

کرتا ادنےٰ کو جو اعلےٰ نہ ترا منصوبہ — پاتا شطرنج میں فرزیں کا نہ رتبہ بیذق

کرتا اک جست میں ہے ماہیِ گردوں کا شکا — طائرِ تیرِ ہوائی ترا مثلِ لقلق

ق

اے شہِ دادگر اے خسروِ انصاف پرست — اللہ اللہ رے عدالت کا تری نظم و نسق

اتنا عالم میں حذر خوں سے ہے خونخواروں کو — خونِ فاسد کو بھی ہرگز نہ کرے نوش علق

پرتو افگن ہو اگر روشنیِ طبع تری — ابرق آئینہ ہو اور سنگِ سیہ ہو ابرق

مشتری بھی ترے شطرنج کا اک مہرہ ہے — آفتاب ایک ترے گنجفہ کا گر ہے ورق

ق

ابر ہے گرچہ مثالِ نمدِ نم دیدہ — گر تری برقِ غضب جھاڑ دے اُس پہ چقمق

تو ستارہ سے بھی جل اُٹھے زیادہ وہ شتاب — آگ لگجانے میں دیر اُس کے نہ ہووے مطلق

تیرے توسن میں وہ جلدی کہ اگر چھیڑ دے تو — یوں وہ اُڑ جائے کہ جیسے سرِ آتش زیبق

ق

شمس کو پہنچے تری راست سے یوں مشرق میں نور — تو ہو مغرب میں گرا لے پرتوِ نورِ مطلق

جس طرح روشنیِ قلب سے اہلِ اشراق — عرصۂ دور سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق

ق

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر اس طرح — تا کہ ہوں ارض و سما دونوں طبق زیرِ طبق

ہووے ہر سال مبارک تجھے عیدِ رمضاں — اور دشمن کو رہے تیرے سدا رنج و قلق

## قصیدہ نمبر ۲

ایک دن فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سال جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے۔ دل نے کہا کہ قصیدہ لکھیے اور ایسا لکھیے کہ اُستاد بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا۔ یہ طرح

ملک ہو جوشِ بہارانِ کرم سے تیرے کیا عجب شاخ میں آ ہوکے گلِ رنگا رنگ
تیرے انصاف سے ہے بزمِ جہاں میں شاہا شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ
ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتشِ قہر تو سمندر رہے پانی میں بجائے خرچنگ
ق زیرِ راں تیری ہے وہ توسنِ چالاک کہ تو چھیڑ دے ایک ذرا اُس کو جو وقتِ صفِ جنگ
یوں کرے جست کہ جیسے سرِ میدانِ نبرد منھ سے اُڑ جائے حریفوں کے ترے خوف سے رنگ
رکھتی سرعت ہے تپِ لرزۂ ہیبت سے ترے نبضِ محموم کی مانند جبل میں رگِ سنگ
مرغِ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ اور جگہ چوبِ قفس کے ہے ترا تیرِ خدنگ
ہو وے حاسد کو نہ آزارِ حسد سے صحت تاکہ دارو نہ پیالے میں بجے تیری تفنگ
مفسد و حاسد و غماز و عدو سے سرکش زیرِ شمشیرِ غضب تیرے ہوں چاروں چورنگ
آ نہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام ہوتا ہے قافیہ سنجوں کا یہاں قافیہ تنگ
ق کرتا اس رنگ سے ہے ختم سخن دیجے دعا ذوق جو ہے ترا مداحِ محبتِ یک رنگ
گلشنِ دہر میں ہر سال مبارک تجھکو جشنِ نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ
اور ترے حاسدِ بد بیں کو دکھائیں لاکھوں
خسروارو زنئے رنگ فلک کے نیرنگ

## قصیدہ نمبر ۲۲

حبذا ساقیٔ فرخ رخ و خورشید جمال مرحبا مطربِ باردت فن و زہرہ خصال
بارک اللہ کہ درافشاں ہے تو اے ابرِ بہار خیر مقدم کہ خراماں ہے تو اے بادِ شمال
للہ الحمد لبالب ہے مئے عیش سے جام شکر للہ زرِ گل سے ہے چمن مالا مال
جوش روئیدگیٔ سبزہ سے ہو جائیگا سبز گل زمینِ چمنِ حسن میں تا دانۂ خال
اللہ اللہ رے سرسبزیٔ گلزارِ جہاں کیا عجب ہو روشِ خضر اگر رنگِ بلال
شررِ تیشۂ فرہاد سے پیدا ہوئے گل بل بے جوشِ گلِ خود رو سرِ دامانِ خیال

انصاف نے تیرے شہا سیماب و آتش کو کیا
یوں جمع جیسے ایک جا نورِ سحر رنگِ شفق

تیری امان و حفظ سے ہو جائے حق میں شمع کے
تا رِ فتیل آب بقا نورِ سحر رنگِ شفق

خورشید تجھ سے فیض کو پہنچے تو مشرق میں ہو
جُز در و لعلِ بے بہا نورِ سحر رنگِ شفق

جس پر کہ تو ہو دے غضب ہو اُسکے حق میں کیا عجب
سیلِ فنا برقِ بلا نورِ سحر رنگِ شفق

شمشیر کی تیری چمک خونِ عدو سے یک بیک
دکھلائے ہے روزِ وغا نورِ سحر رنگِ شفق

پیکانِ تیرِ الماسگوں منہ سُرخ سوفار و نکلے یوں
گویا لگا کر پر اُڑا نورِ سحر رنگِ شفق

جلوہ ہے تیری مہر کا شعلہ ہے تیرے قہر کا
ہے جس کو عالم جانتا نورِ سحر رنگِ شفق

اسپ خجالت تر از وہ نقرہ خنگ یا دبا
غیرت سے جس کی اُڑ گیا نورِ سحر رنگِ شفق

اب ذوق کی ہے یہ دعا جبتک ہے شاہنشہا ن
خورشید و مہ ارض و سما نورِ سحر رنگِ شفق

جب تک لباسِ دہر کو صابون و شنجرف ہو
زینت دہِ صبح و مسا نورِ سحر رنگِ شفق

ہر جشنِ فرخ ہو تجھے اس طرح آتا ہے
ہوں تیرے محتاجِ ضیا نورِ سحر رنگِ شفق

شاہا زمانہ میں ہوتا یا آبِ داو عمرِ خرد
ہو جلوہ گر مشرق سے تا نورِ سحر رنگِ شفق

دشمن کا تیرے منہ ہو فق اور خون بھی دل ہو کے شق
دیکھے نہ وہ اس کے سوا نورِ سحر رنگِ شفق

## قصیدہ نمبر ۲۱

طرب فزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ
دیکھکر بھاگے جیسے رنج ہزاروں فرسنگ

پل بے بالیدگی عیش کہ برگِ گلُ پر
قطرہ شبنم کا ہے مینا سے شرابِ گلرنگ

واہ کیا گلشنِ آفاق میں ہے جوشِ بہار
چہچہے کرنے لگی بلبلِ تصویر بزنگ

کلکِ نقاشیِ قدرت سے گلستاں میں ہے آج
تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقشِ ارژنگ

خسروا آج کیا تو نے وہ جشنِ نوروز
دیکھکر جس کے تجمل کو ہو جمشید بھی دنگ

ہے ترے بزم طرب میں پئے رسمِ نوروز
صورتِ بیضۂ رنگیں فلکِ مینا رنگ

مشک افشاں ہو جائیں جو تری نکہتِ خلق
نافِ آہوئے ختن سے نہ ہو کم داغِ پلنگ

ہووے جوں چادر مہتاب گلیم شب تار
رخ پرنور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلق ہی رہا
دستگیری نے لیا تیری جو گرتوں کو سنبھال

گر ترے قہر کی گرمی تب محرق بن جائے
لب دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال

قوت ماسکہ ممسک کے توے سے گم ہو
فیض جاری سے ترے بخل کو یاں تک ہو زوال

حکمت آموز ترا علم جہاں ہو تو وہاں
نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطوں کو مجال

ہو تری عقل سے عاجز دم بحث معقول
اگر مقابل میں ترے بالفعل کہیں عقل فعال

ق دم ہے کیا باد صبا میں کہ دم سیر جہاں
تیرے گلگون سبک سیر کے مارے وہاں

یو ہیں دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے
اور سبقت جائے کہاں سے وہ ہے مثل خیال

ہے وہ ہیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری
تب اڑان اس میں ملک کی تو ہے سرعت میں خیال

جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اس کا
ہو وہ مستقبل و ماضی کا وہاں سب یک حال

زیب تن اس کے جو ہے مسند کی ہر کل تصویر
پھرتا کاغذ میں ہے [illegible] صورت طاؤس نہال

اس فلک سیر کو جو دل سے [illegible]
مرحلہ سیر فلک ہو سب [illegible]

ق تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ
سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے دستار سنبھال

کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے
نیشکر راہ میں مانگیں اگر اس سے اطفال

جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں
اس کی مستک پہ [illegible] جلوہ نما یوں ہے ہلال

ہے جو اس فیل کی خرطوم سرافیل کا صور
آئے اعدا پہ قیامت سر میدان قتال

اس کے دانت ان کے لیے ہیں وہی تیر شہاب
ہے جن اعدا کو سرا و بنی شیاطیں کی مثال

ق آبداری میں تری تیغ کہ ہے برق کی موج
کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش سیال

تیری شمشیر کو ہے خون عدو روز مباح
یہ غلط ہے کہ سر دن ہوتا ہے مردار حلال

طائر روح عدو کے لیے صیاد اجل
سبزۂ تیغ میں جو ہے سو لگا رکھتا ہے جال

طاقت دم زدن اس دور میں ہے کس کو رہی
دیکھ کر تیرا نسق اے شہ فرخندہ خصال

پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس
لب پہ آ جاتا ہے سینہ سے پئے استقبال

جوشِ فوارہ ہے وہاں کثرتِ تارِ بارش
سرِ مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمتِ باری سے کہ وقتِ باراں
ابرِ مردہ سے بھی ہو قطرہ نشان آبِ زلال

معجزہ بادِ سے مانندِ عصائے موسیٰ
شجرِ خشک بھی ہو جائے ترو تازہ نہال

ذوقِ مستی سے ہے طاؤس چمن میں رقاص
شوقِ آہنگ سے ہے سرو پہ قمری قوال

شورِ بلبل بھی یہ رکھتا ہے نمک آج کہ گل
بن گیا کثرتِ شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقتِ پرواز یہ کیفیت سے
اس ہوا میں ہے بطِ مے کہ اڑو لے پر و بال

ہے یہ وہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب
رقصِ مستاں میں رہے وجد کناں شاد و حال

بیدموں کو جو ترشحِ بارہ گرِ عیسیٰ دم
شمعِ مردہ کی رگِ تار سے کھولیں قیفال

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں بے ساز
جنبشِ دستِ مژہ سے ہے اس انداز سے تال

ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خطِ غبار
صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گردِ ملال

روزِ جشن آج ہے اسکا کہ جسے کہتی ہے خلق
نائبِ ختمِ رسل ظلِ خدائے متعال

وہ بہادر شہِ غازی کہ اگر تیغ اس کی
اپنی دکھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکو خوئے نکو روئے دو خجستہ منظر
وہ بلند اختر و فرخ روش و فرخ فال

وہ مسیحا دم و یوسف رخ و داؤد الحاں
وہ سلیماں وش و موسیٰ کف و صالح اعمال

چمنِ خلق و نسیمِ کرم و ابرِ سخا
چشمۂ فیض و سپہرِ کرم و کانِ عطا بحرِ نوال

آسماں جاہ و عطارد رقم و مہرِ علم
مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسروِ جم حشم و داورِ کسریٰ انصاف
شاہِ دارا دل و سلطانِ سکندر اقبال

مدحِ حاضر میں پڑھوں اسکی وہ مطلع جس سے
ہمسری کی نہ رکھے مطلعِ خورشید مجال

ہو تری یک نظرِ فیض سے ناقص کو کمال
مہر سے گر مہِ کامل ہو دو ہفتے میں ہلال

نیرِ جاہ ترا وہ ہے کہ تا دورِ فلک
نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ وبال

آ گئے بخشش کے ترے خرمنِ دو نہ یکدانہ
آ گئے ہمت کے ترے کوہِ طلا یک مثقال

جتنا خورشید پہ اُتنی ہی بارش ہو سوا
ہووے کیونکر تپش عشق نہ رحمت کی دلیل

عشق کھنچواے ہے اک زار جفاکش سے بزور
بار بیعہ کو وہ اٹھائے حسن جبرئیل

تپ نہ چرخ کو گر نالۂ عاشق کی ہوا
دم میں اجزائے دخانی کی طرح ہوں تحلیل

شمع کشتہ کے لیے ہے دمِ عیسےٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں جیتے قتیل

معتبر ہے جو کرے نالۂ دل درد اظہار
نالہ ہے دل کی زباں دل ہے مؤکل یہ دلیل

دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری
جس کا اجمال قضا اور قدر ہے تفصیل

جی میں ہے اور پڑھوں میں کوئی مطلع ایسا
گوہرِ مخزنِ معنی سے ہوں ہر تاویل

کنجِ حیرت میں کروں علمِ خموشی تحصیل
یہ عجب مدرسہ ہے جس میں ہے قال نہ قیل

درسِ توحید سے لوں ایک شغف کا نسخہ
بحث میں علت و معلول کی ہے عقل علیل

جلوہ افروزی یک مدرجہ ہے اُس کو
شمع فانوس سمجھ خواہ چراغ قندیل

ق

فکر بیہودہ میں کس واسطے ہے تو پابند
کچھ نکال اپنے لیے ذوق نکلنے کی سبیل

خوابِ غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
نہیں مہتاب یہ ہے روشنی صبحِ رحیل

عرصۂ عمر ہے وہ تار کھنچا اور ٹوٹا
کچھ اگر وقت معین کی طرف سے ہو دلیل

وہی منزل ہے جہاں ٹھیرے حیات گزران
کہ ہے راہ فنا کوئی نہ ذریعہ ہے نہ سبیل

مشق اندوزہ ہے اک روز نہیں تو بیکا
تیرے ہفتے میں نہیں کوئی بھی روز تعطیل

غمِ عصیاں ہے تو ہے رحمتِ غفار وسیع
فکر روزی ہے تو ہے رزق کا رزاق کفیل

ہے تمنائے زوال آب بانکا چھوا
جھوٹا جانے ہو تو کافی ہے فقط ذکرِ جمیل

پھر بہارِ زمنِ عشرت دلگیر ہے یوں
سیر کر سیر کہ ہے فرصتِ گلگشت قلیل

مژدہ عید ہے دیکھ تو کیا رنگ چمن
گل کے رنگیں ہے قبا غنچہ کی رنگیں مندیل

ہوئے آراستہ ہیں آج جہاں کے پوشاک
فصل سے باغ تلک باغ سے لے تا تخیل

نظر آتا ہے برنگِ لبِ ساغر جو ہلال
ٹپکا پڑتا ہے لبِ مست سے شوقِ تقبیل

ہو قوی دست اگر زور دہِ ہمت تیرے
شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگانِ غزال

تقویت دیوے اگر پاس حفاظت تیرا
شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنۂ زمانہ خالی
نیلدونی ہے تنکیوں کی حشم کہنا محال

ق
آتش و آب میں یہ رابطۂ دل سے ہے
دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

کاکلِ موجِ دخاں کے لیے اُس کے دریا
لے ترے آب سے شانہ پرِ ماہی کا نکال

خبر جملۂ عشرت ہے ترا جشنِ سعید
مبتدا جس کا ہے غرۂ ماہِ شوال

ہوتی ہے حیرتِ توصیف سے تیری شاہا
روشِ غنچۂ تصویر زباں منہ میں لال

ق
بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے
یہ جو ہے ذوق ثنا خواں ترا او رہی سگال

جشن ہر سال ترا ہووے مبارک تجھ کو
رہے جب تک کہ زمانہ میں حسابِ مہ و سال

## قصیدہ نمبر ۲۳

لاتا نہ ننگ سے ہے رنگ نئے چرخ بخیل
واہ جگر! اب ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل

ڈر زمانے سے وہ عیار ہے یہ ہوش رُبا
لاکھ بیہوشیوں سے جس کی بھری ہے زنبیل

ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار
کہ بجز حفظِ خدا جس کی نہ خندق نہ فصیل

گم ہوں ظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی
زنگ دیتا ہے چھپا جوہرِ شمشیرِ اصیل

پیشِ دشمن نہ گزر حق سے نہیں سانچ کو آنچ
بلکہ ہے آتشِ نمرود گلستانِ خلیل

ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز
ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

نہیں بے قیدِ علائق کسی عالم میں بزرگ
رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زبر سے ذیل

ہے تہِ خاک بھی قاروں کو سفر حشر تلک
نہیں تا تحتِ ثریٰ منزلِ آرامِ بخیل

عید یک روز جہاں میں رمضاں ہے یکماہ
بعد سب کثرتِ تکلیف کی یاں عیشِ قلیل

کشتِ سبزِ فلکِ دوں سے نہ رکھ چشمِ ثمر
خوشہ چینی سے بے بہرہ ہے یہ مزرعۂ نیل

قابلِ انساں کی صحبت کے ہے انساں نہ ملک
بن گیا پیشِ نبیؐ صورتِ دحیہ جبریلؑ

دوں ترے گھوڑے کو کیونکر میں پری سے نسبت ق
نہ یہ صورت نہ یہ رفتار نہ یہ ڈول نہ ڈیل

گرم جولاں وہ کہاں ہو سکے ہے وسعت
نہ تو میدان تصور نہ نفس سے تحصیل

عرصۂ معرکہ میں گر تجھے اے شاہ سوار
اس سبب سیر سے منظور ہو کا تعمیل

جائے یوں جیسے جو اسم بھی نہ پانی سے ہو تر
نہ ہو پیدا اسے جیسے راہ میں تا لب کہیں

کوہ البرز کو سامنے نہیں رہا اپنے ق
ہے وہ اے شاہ فلک رتبہ تری فیل ثقیل

حملہ آور ہو وہ جس دم تو سینے سب اس عدد
اس کا خرطوم ہو دست کش تیغ عزرائیل

تو وہ مضراب شماری میں ہو جب [illegible]
اس کے دانتوں پہ یہ خرطوم سے سوجھے تمثیل

[illegible]
[illegible] ہوئی رات طویل

نہیں یہ جوش گل و لالہ [illegible]
داد خواہی کے لیے خاک سے خون ہابیل

عدل نے تیرے [illegible]
آج تک عدل میں کوئی نہ ہوا تیرا عدیل

[illegible]
[illegible]

[illegible]
کہ نہ فوارہ سے ہو تیروں کی [illegible] تبدیل

رہزن نطفہ [illegible] ہو دل سے منتفی
اس کی پشت پدری سے نہ کبھی ہو تحلیل

مملکت میں ترے انصاف کے ہوں [illegible]
رہے اگر [illegible]

ذوق کرتا ہے تری مدح [illegible]
ہو گزر خاطر نازک پہ صبا [illegible]

عید ہر سال ہو فرخ تجھے با جاہ و جلال
ہوں قوی پایہ ترے دوست بصد قدر جلیل

[illegible] وہ سے فضل خدا
ذل انعام سے ہوں خاک مذلت پہ ذلیل

## قصیدہ نمبر ۲۴

پائے نہ ایسا ایک بھی دن [illegible]
کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں

ہے بادۂ نشاط طرب لب بلب آج
اک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں

دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں
گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں

نگاہ مے خم میں ہے گر شیشہ میں کیا کیا ہے سر
رنگ گردش ہے کہ جس مست کی قالب تبدیل

تہنیت ہووے جو آج اس شہ دریا دل کا
جس کے نزدیک ہے اک قطرہ کہ قلزم و نیل

وہ جہاں دار شہ والا نسب و پاک گہر
حشمت و چرخ سریر و شہ خورشید اکلیل

ماہ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے
نظر مہر میں ہے اس کے وہ نور تکمیل

تو یقیں ہے جو تشکیل تقرب اس کا
اللہ اللہ رے تیرے شکل شہنشاہ تشکیل

مدح حاضر میں پڑھوں مطلع روشن ایسا
مطلع شمس کو بھی جس کے ہو واجب تبجیل

بعد شاہان سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے قرآں کو ہے توریت و زبور و انجیل

ذات ... اس کی ... سے عادت وہ اولو العزم ...
جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

نور فرمائے ... جب ...
آئینہ آنکھوں سے نظر معنی اللہ جمیل

روئے نیکو جب ... سیکھو
آدمی کو نظر ہے کہ الحسن الی الحسن یمیل

... زباں ... 
برج خاکی میں ہے خورشید فلک کی تحویل

دانش آموز ... تیری
بد نہوں کو بتا دے لکن اللسان ثقیل

جو ہر تیغ اجل ایک ترے حکم کی نقش
تو نہیں قضا حکم کی تیری تعمیل

عہد میں تیرے جو ہوا ... سے مسدود
کھلے فعل متعدی سے نہ باب تفعیل

تشنۂ ذوق طلاوت ہوں تو کیونکر سیراب
تیری شیریں سخنی ہے انہیں شربت کی سبیل

نکتہ چینوں کے لیے نکتہ ... ترا
تو جس طبع رواں ہے روش دانہ نیل

جب ہوں مرغان ہوا تیرے نشان بندوق
شہ طائر کو بھی تو سمجھے اک اڑتی ہوئی چیل

مہرۂ پشت عدو میں ترا ... دور
رشتۂ مہرۂ تسبیح کی مانند ذلیل

طائر روح عدو کے ... پرواز
تیر کی تیری صدا جیسے کبوتر کو غلیل

ق

وہ قیامت ہے تری توپ کہ شور ...
دم نہ مارے کبھی سن پائے جو گھوڑ دوڑ کی صہیل

نالۂ توپ کی ہیبت سے ... پھونک سکے پا ...
گو چہ صور سے گزرے جو دم اسرافیل

یارب ہمیشہ دولھا دلہن میں رہے سہاگ — جب تک کہ ہووے نیچے زمیں اوپر آسماں
مہندی کے وصف لکھنے کے قابل نہیں کہ ہے — نیلا سا ایک کاغذ بے سطر آسماں
جو برج اُڑے ہے اُڑکے یہ ہوتا ہے وہ بلند — رکھ لے ہے سر پہ مثلِ گلِ احمر آسماں
کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار — شبنم کی جائے صبح تلک گوہر آسماں
پہنچے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو — انجم سے لاکھ جمع کرے لشکر آسماں
عیش و طرب کو مژدہ کہ کرتا جہاں میں ہے — زہرہ سے اب قرآن مہِ انور آسماں
ہنگامِ بزمِ عقد ستاروں کے واسطے — کیا کیا سجے ہے اوج و شرف کے گھر آسماں
بدبیں کے ہے نظر کے جلانے کے واسطے — انجم سپند آگ شفق مجمر آسماں
جس وقت سہرہ باندھ کے دولھا ہوا سوار — کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں
کرتا تھا اِن ٹکاد کو دم پڑھکے دمبدم — دولھا کے صبح دم رخ روشن پر آسماں
ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخل آرزو — لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں
کرتا ہے شاخ خشک تمنا کو نخل سبز — در پردہ مثل پردۂ بازی گر آسماں
شادی کا اُس کے نورِ بصر کے ہے اہتمام — کرتا ہے جس کا روز طواف در آسماں
وہ شاہِ نامور کہ بہادر شہ اس کا نام — ہو حکم سے نہ اُس کے کبھی باہر آسماں
وہ آفتاب اُس کی تجلی جس سے آفتاب — وہ چتر اِس کا جس سے نہ ہو ہمسر آسماں
مطلع پڑھوں حضور میں وہ میں جسے کہے — مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع — کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں
نہ آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر — جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں
خطبہ کے واسطے ترے نام بلند کے — گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسماں
وہ بحرِ بے کراں ہے تری ہمت وسیع — ہے بلبلا سا ایک کنارے پر آسماں

اقبال ہے عطر سے عیش و نشاط کے     سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں
افراطِ انبساط سے ہے کیا عجب اگر     مثلِ حباب جامہ سے ہو باہر آسماں
شادی کی اس کی دھوم ہے آج آسماں تلک     تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں
فرزندِ شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار     تسلیم کو ہے جس کی جھکاتا سر آسماں
ہے اس کی بارگاہ میں مسند چوبدار     حاضر عصا سے کاہکشاں لے کر آسماں
اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر سرور     ہے پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں
پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن     مقدور کیا کہ ٹھیر سکے دم بھر آسماں
فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کے ہو کم     گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں
تنور کی پخت مطبخِ عالی میں اس قدر     ہے جس کا ایک تودۂ خاکستر آسماں
اس روشنی کی چند دکھا دیجئے جھلکیاں     نازاں ہے آفتاب کے جیجہ پہ آسماں
ابرِ بہار دودِ چراغاں سے تو بہ تو     ہوں سات آسماں کی جگہ ستر آسماں
چشمِ قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند     کاجل لگائے اس کے دھوئیں سے گر آسماں
کرڈالے پارہ پارہ فلیتوں کے واسطے     مہتاب کو سمجھ کے کہن چادر آسماں
یہ کہنہ و سیاہ وہ خوش رنگ و نو بہ نو     فائق ہو کیا سبوچۂ ساچق پر آسماں
ٹھلیوں میں ہیں وہ نقل کہ ہے ان کا عکس اگر     لے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں
آرائش ایسی اور وہ گلہائے رنگ رنگ     ادنے ساچق میں غنچۂ نیلوفر آسماں
بنوائے اس میں پھول طلائی و نقرئی     لے لے کے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں
نقارخانہ کی ہے چراغاں سے وہ شکوہ     گویا ہے اک زمیں پہ پڑا اخضر آسماں
ق کرتا ہے رقص تخت پہ نقارہ خانہ کی     شہنائی کی صدا کہ جو سن کر آسماں
آوازۂ دمامۂ نوبت سے گونج اٹھا     وہ جو سب آسمانوں کے ہے اوپر آسماں
دولہا دلہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی     آیا ہے اک سہاگ پڑا بن کر آسماں
جائے عجب نہیں ہے کہ عطرِ سہاگ کے     شیشہ کے شیشہ بھر کے لنڈھاوے گر آسماں

واندراں حال سخنہا می گفت — ہمچوں نالۂ موزوں پردرد
صدو یک مطلعِ رنگیں آخر — گفت با نالۂ گرم و دمِ سرد
شد چو تسبیح زمرد ناشس — رونق و آب و گہر رفت بگرد
مُرد فیروزہ و خوں شد دل لعل — کہربا چوں یرقانی شدہ زرد
پیش آں گنج گہر نیست چو ناک — گنج خسرو کہ بود باد آورد
ذوق چوں خواست دتاریخش را — اندریں دفترِ معنی بد و فرد
اول از دانہ خوشِ رنگ شمار — کرد و آں عقدۂ مطلب وا کرد

بازیا حبابہ رنگیں بنوشت
طرز نسب [illegible] مہ آورد [illegible]

## قطعۂ تاریخ تعمیرِ چاہ مقبرۂ محمد شاہ سہارنپوری

حسبہ باصفا محمد شاہ — اکرو تعمیر [illegible] بجد چاہ
باذوق تاریخ سال ہر دو جہ — زہ رقم ساخت مہ و زمزم
خسرو [illegible] اقبال [illegible] خورشید — [illegible] شہا عزو شرف کی سوگند
تا [illegible] نسلاوت [illegible] رہنے ہو ہمہ — [illegible] مہ تاباں ہر چند
دہم [illegible] ہر عسر [illegible] — بیار [illegible] ہو رتبہ بلکہ صد چند
[illegible] کا [illegible] — خیر [illegible] آہو بہ بابے فرزند
[illegible] — [illegible] بہ ترسے [illegible] نصف کند

## [illegible] سدس دعا [illegible]

[illegible] آراستگرد [illegible] — اعلیٰ سعد اکبر ہو
[illegible] — [illegible] میر لشکر ہو

دریا سے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا — پوچھے ... کشتی ہے لنگر آسماں

قد پہ ترے وہ راست قبا ہے علو جاہ — زیبندہ جس کے واسطے بالا بر آسماں

تیری گہر فشاں دست کرم سے ہے — گویا کہ ایک دامن پر گوہر آسماں

چمکائے تیغ تیز کو اقبال گر ترا — ہو مصقلہ ہلال تو صیقل گر آسماں

یوں دل میں تیرے جلوۂ ذات محیط حق — آیا ہے جیسے آئینہ کے اندر آسماں

وسعت میں تیرا جوش فلک سیر کیا تھا — [illegible] میں [illegible] آسماں

شاہا عجب نہیں ترے شبدیز کے لیے — [illegible] آسماں

پہنچا نہ [illegible] کاوے کے انداز کو کبھی — [illegible] آسماں

انجم ہیں یا [illegible] — ہے [illegible] آسماں

ق

[illegible] اگر [illegible] دستگاہ دیں — اٹھی [illegible] ہمسر آسماں

پر اس کے نقش [illegible] قابل بنا سکے — چار آفتاب ایک جگہ کیونکر آسماں

[illegible] ذوق کی [illegible] تب تک [illegible] — منسوب ہر ستارے سے ہوتے [illegible] آسماں

بزم نشاط و عیش [illegible] تیرے گھر میں [illegible] — لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں

[illegible] جگر میں [illegible] کے ترے
تا زخطوط [illegible] آسماں

## اشعار در تاریخ دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف

سبزہ رنگاں کہ بباغ حسنند — تازہ چوں شاخ گل و لالہ و ورد

از تماشا دہن [illegible] موہوم — چوں خط جوہری [illegible] ہر فرد

چشم دارند بقتل عشاق — چوں حریفے کہ کند قصد نبرد

بجمال رخ آنہا معروف — مدتے شد کہ دلش خوش میکرد

[illegible] بخشش [illegible] — آصفایان [illegible] عراق [illegible]

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو زیبا
نہالِ تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا
نیستاں میں ہو تا نے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جب تک نشاط افزا

شرابِ عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشنِ جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکامِ شریعت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محرابِ عبادت سے
خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
نمازِ اہلِ سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیبِ منبر ہو
ترا حامی ابو بکر و عمر عثمان و حیدر ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفت آئینہ
زباں پہ تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں
قلمزن تا ہو مشک افشان و کاغذ خطِ مشکیں
سخن تا داد چاہے اور تا اہلِ سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسروا ذوقِ سخن ور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ظفر گر ہو

# اشعار متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ

## قصیدہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے
خون نخچیر سے ہوا سارا
نہ بچا اُس شکار افگن سے
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ
سمجھے شیر آپ کو ہزار غنیم
شیر گردوں بھی اسکے لشکر میں

قصدِ صید افگنی کیا جس دم
دامنِ دشت لالہ زارِ ارم
صید کوئی سوائے صیدِ حرم
ہوئے مسکن پذیر دشتِ عدم
ہو بہادر نہ کیوں وہ شیر شیم
اُس کے پر سامنے ہے مثلِ غنم
پاسے ہرگز نہ قدمِ پیشِ علم

سر ہفت آسماں جبتک کہ دورِ ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بہادر شاہ شاہِ ہفت کشور ہو

رہے نام سلیماں تا نگینِ حکمرانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاجِ کیانی سے
رہے نام فریدوں تا درفشِ کاویانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشورستانی سے

ترا اے خسرو ذوالاحتشم عالم مسخر ہو
سریر سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخار ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
زمیں میں تا ہو کان اور کان میں ہو جوہر کانی
رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
پئے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحر پُر گہر ہو کان پُر زر ہو

رہے تا عود کو آتش میں اور آتش کو مجمر میں
رہے نافہ میں مشک اذفر اور بو مشک اذفر میں
گل تر تا ہو گلداں میں تری ہو تا گلِ تر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں

ترے ابر کرم سے باغ عالم تازہ و تر ہو
شمیمِ خلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریق رہبری میں خضر ہو جبتک ہدایت فن
رہے ادریس تا قطع تعلق سے جناں مسکن
سہارا ہو وے تا بحر غریق الیاس کا دامن
مسیحا کا ہو بالاخانہ تا خورشید سے روشن

چراغ عمر سے تیری جہاں سارا منور ہو
فروغ اسلام کو ہو رونق دین پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جب تک سحر کے روئے نیکو کو
ثریا گوہر تا کہکشاں کے ہووے بازو کو
کرے آراستہ تا شام اپنے موئے گیسو کو
کرے وسمہ سے تا قوس قزح سبز اپنے ابرو کو

لب پاں خوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سر بدخواہ فندق تیری انگشت سناں پر ہو

| | |
|---|---|
| دستِ ہمت نے ترے کھوئی بڑپنے کی یہ قدر | چٹکیوں میں ہیرا اڑاتے ہے کیا کیا صراف |
| دیتا ہے تیری فوج میں نقارہ جب فلک | آتا ہے صاف چوب کی صورت نظر ہلال |
| تا نسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے | منظور تجھکو جبکہ شکارِ پرند ہو |

## مطلع قصیدہ مدح حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ

قصیدہ مرقومۃ الذیل آغازِ شباب کا تھا والد مرحوم نے ایّامِ جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ اُستاد مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔ یہ چند اشعار یادگار رہے۔ الحمد للہ ع۔ تو باقی و یادگار باقی +

| | |
|---|---|
| آج کچھ ایسی ہوائے عیش کی تاثیر ہے | ہر ورق کاغذ کا رشکِ گلشنِ کشمیر ہے |
| گو نہالِ دشت کو شوقِ حنابندی نہیں | ہاتھ کیوں مہندی سے رنگتا برگِ بید انجیر ہے |
| مدحِ حاضر میں سنائے مطلعِ روشن کہ ذوق | منتظر مشرق میں جیتا مہر یہ تنویر ہے |
| نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے | ہر اذاں میں شامل اور داخل ہر تکبیر ہے |

بادشاہی قصہ خوانوں میں میر امیر علی نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ اُنہوں نے اُستاد مرحوم سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہدیجئے کہ داستان میں جب ایسا موقع آتا ہے تو شعر حسبِ دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہجاتا ہے۔ اُستاد مرحوم نے حسبِ عادت وعدہ کرلیا مگر پورا کرنے کی فرصت کہاں جب کئی تقاضے گزر گئے۔ اور اُنہوں نے پھر کہا تو ایکدن فرمایا کہ جب ہم بادشاہ کے لئے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا۔ اُس میں طبیعت پر زور ڈال کر کہینگے۔ تمہارا کام ہوجائیگا ہمارے قصیدہ کا ایک جزو بھی ہوجائیگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا +

رہے مانند شیر تا لیس کے — اوج ہمت سے اُس کے زیرِ قدم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے — ہمسرِ اژدہا سے آتش دم
کیے شیرِ ژیاں شکار کئی — اُس غضنفر شکار نے پیہم
ہے بجا گر دلاورانِ جہاں — کھائیں اُس کی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرأت و شجاعت کو — چاہا اس طرح دل نے کیجے رقم
تا ہے یادگارِ عالم میں — وصفِ عالی صاحبِ عالم

لکھی اسے ذوق میں نے یہ توجیہ [illegible]
سے تاریخ تا نہ [illegible]

لکھتے ہیں اس کی ہنیتِ عید مدح خواں — آراستہ ہوا جو [illegible] سماں

عہد میں تیرے نکالے دانت گر سیب ستم — [illegible]
گر پڑے پاؤں پہ تیرے مہر آ کر سایہ دار — [illegible]

فصلِ گل آج ہے وہ سلطنت [illegible] — [illegible] میں بلبل کو [illegible]

ہے اگر لیلیٰ سیاہ [illegible] — خط [illegible] قلم شاخِ نبات
ہو گیا خورشید بالا مال [illegible] — دی جو تو نے [illegible] کی زکوٰت
ہاتھ میں بندوق لے جبر [illegible] — شیر گردوں کہ ہو [illegible] ہاتھ سے [illegible]

بر نہیں پہ ترا توسن وہ یہ [illegible] سال [illegible] — [illegible] کے ہے اک قوت سے [illegible]
ہو قوی دست ترے زور [illegible] — [illegible]
پاتا گرداب سے ہے گرد [illegible] — [illegible]

## مخمس در مدح

خسروا چڑھ کے سر گنبدِ دوار ہلال
خود لبِ عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ہلال
حاضرِ خدمتِ عالی ہے بہر کار ہلال
گرز بردار ہے خورشید کماندار ہلال
آسماں لے کے سپر چلتا ہے تلوار ہلال

دستِ ہمت ترا خورشید سے ہے بالاتر
تیری بخشش سے ہے نیساں عرقِ شرم میں تر
آئیں تیرے درِ دولت پہ گدایانہ اگر
اپنے کاسے میں بھرے چرخ دہیں لعل و گہر
اور کشتی میں بھرے درہم و دینار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
عید ہر سال ہو فرخ تجھے با حشمت و جاہ
تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دولتخواہ
اور جو حاسد ہیں ترے واسطے اُن کے ہر ماہ
چرخ پر تیز کرے خنجرِ خونخوار ہلال

## قصیدۂ ناتمام در منقبت

لکھوں جو میں کوئی مضمونِ ظلمِ چرخِ بریں
تو کربلا کی زمیں ہو مری غزل کی زمیں
یہ حال ہے مرا ضعفِ دماغ سے کہ مجھے
صدائے صورِ قیامت ہے ہر مگس کی طنیں
زمانہ عربدہ پرداز و بخت بد ناساز
ستارہ بر سرِ پیکار و چرخ بر سرِ کیں
عجب نہیں ہے کہ راہب خطِ چلیپا سے
بنا دے تیرے طویلے کے واسطے خرزیں

## رباعیات مدح

شاہا تجھے با دولت و بختِ فیروز
فرخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز
ہے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں مہرِ عالم افروز

قصیدۂ مذکور معدوم ہوگیا غدر کے بعد عالم تباہی میں ایکدن میر موصوف حافظ ویران کو مل گئے۔ حافظ کو اللہ مغفرت کرے اُن سے اشعار مفصلۂ ذیل حاصل کئے۔ اور مجھے دیے تین شعر متفرق اور بھی ہیں وہ بھی لکھتا ہوں +

کروں اگر رقم تہنیت کا میں آہنگ
تو ہووے خامہ سے پیدا صدائے بربط و چنگ

ہے تیرا زور حمایت کہ باؤں کو پنجے
کرے ہے شیر کی جرأت سے مالش آہوے لنگ

شہا ترے رُخ روشن کو کس سے دوں تشبیہ
کہ مہر و مہ کو گہن لازم آئینہ کو زنگ

گھوڑے کی تعریف میں

کروں میں کیا ترے گھوڑوں کا وصف چالا کی
اُڑا ہی جاتا ہے وہ تو برنگ طائر رنگ

نہ پہنچے گرد کو اس کی وہ پیک فکر رسا
کہ ہووے عرصۂ چرخ جسکی ایک شلنگ

چلے ہے یوں کج و کج ادا و ناز کے ساتھ
کہ جیسے مست [illegible] کوئی دلیر شنگ

وہ چلنے میں ہے نظر اور اُڑنے میں شاہین
[illegible] میں [illegible] وہ [illegible] لپکنے میں ہے پلنگ

نہیں پری وہ پری سے ہے پر سوا پرّاں
[illegible] آدمی [illegible] آدمی کے شنگ

رواں ہو گر وہ بکبیر آب دریا پر
[illegible] اس [illegible] ہے زانو تنگ

جو چھیڑے اُسکو تو میداں میں۔ اور کہیں لگے
[illegible] شعر [illegible] جو سنگ

بشرار سنگ نظر سے نہاں نہ ہونے پائے
[illegible] وہ [illegible] سینکڑوں فرسنگ

اگر چہ تجھکو شہا اُس کے خانۂ زین [illegible]
تمام عرصہ گیتی کی [illegible] کا آئینہ [illegible]

تو اس ارادہ کے آنے میں دل تلک جو دبر
[illegible] جا کے پھر [illegible] ہووے تنگ

ہیں وہ لعلین خسرو اتھرے سیراب [illegible]
چمن پہ کھا [illegible] چمن [illegible] اور رنگ [illegible]

[illegible]

سبزے سے ہے بھر [illegible] دل کو صاف [illegible]
[illegible] ہے کیونکہ نہ ہو [illegible] لشکر [illegible]

# نثرِ موزوں

حمد سے آغاز تھا شکر پر انجام ہے کہ فرض نے اپنا حق ادا کیا۔ اور عمروں کی آرزو آج پوری ہوئی۔ قلم کا مسافر زمین سے آسمان اور مکان سے لامکاں تک بارہا چڑھتا اور اُترتا رہا۔ دس مہینے کے بعد فدن میں آکر دم لیا ہے۔ اس میں اتنی طاقت کہاں تھی۔ پاک نیت کا زور تھا اور صدقِ عقیدت نے پر پرواز لگائے کہ یہ رتبے پائے۔ اُستاد کے کلام شاگرد کے لیے حقیقی اور تحقیقی بھائی ہوتے ہیں۔ اب [illegible] یک باب سے [illegible] تو رہے۔ پریشانی اور سرگرداں [illegible] فرق نہیں آیا [illegible] پیارے [illegible] ہے۔ آج تک میرے پاس [illegible] ہو [illegible] پہاڑوں سے اُڑو [illegible] وقت [illegible] ہے۔ تم بھی سمجھے [illegible] ایک مقام ہے [illegible] دوست اللہ ہی [illegible] کے قلعوں کو توڑ دو [illegible] عالم میں بیٹھا ہے [illegible] ۔ پیارے اُستاد [illegible] ۔ یہ لڑکپن

خورشید سے یکروز جہاں میں نوروز
اور تجھ سے جہاں روز مسرت اندوز
ہے تجھکو زمانہ میں شرف دوازدہ ماہ
اور ہے مہر جہاں تاب کو یک دو یک روز

کہتا ہے یہ فیروزی رنگ نوروز
تو موصف اعدا پہ مقرر فیروز
ہو دشمن سرکش کے لیے سہم الموت
اے شاہ عدو کش ترا تیر دل دوز

دعا ہے نذر کی ہو خلعت ولیعہدی
مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ
بحق سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

## اشعار قصیدہ

آگے تیری طبع موزوں کے ہے اک فعل عبث
یہ جو کرتے ہیں عروضی فاعلاتن فاعلات
فیض سے تیرے نہ کیونکر اک جہاں سرسبز ہو
ذات ہے تیری نہاں سرچشمۂ آب حیات

## اشعار قصیدہ ہفتہ زبان

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوے نشو و نمائے گلشن
جوش روئیدگی سبزہ یہ یاد آتی ہے
آیت انبتنا اللہ نباتاً حسناً
جس طرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوس خیال
خوف سے یوں ترے [illegible]

شاہا یہ عمر و دولت و اقبال و عز و جاہ
فرخ یہ تجھکو سالگرہ ہو ہزار سال
ملکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز
ہوں جس میں بے شمار گرہ [illegible] سال

کوہ اور آندھی ہیں گر آتش و آب و خاک و باد
چل [illegible]
تاکہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست یوں باز
چھو [illegible]

# آبِ حیات

ہندوستان کے وسیع النظر انشا پرداز اور مشہور و معروف اہلِ قلم پروفیسر آزاد مرحوم کے کارناموں میں یہ وہ ہر دلعزیز اور کامیاب کتاب ہے جس نے مشاہیر شعرائے ہند کو دوبارہ خلعتِ زندگانی بخش کر اس مجموعہ کو ہزاروں کی تعداد میں چھپنے پر بھی اب (نویں دفعہ) زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے۔ یہ مقبولِ عام کتاب [illegible] دفعات چھپی ہے اور پھر تھوڑے ہی عرصہ میں اسکی مانگ چاردانگ عالم میں نئے ذخیرے کو خالی کر دیتی ہے حق یہ ہے کہ آبِ حیات کا ایک ایک دورِ سرمستانِ ذوقِ سلیم کو ہر مطالعہ کے بعد جانِ تازہ بخشتا ہے۔ دل اسکی نادر الکلامی کے مزے لیتے ہیں اور آنکھیں ان جواہر پاروں سے روشنی پاتی ہیں جن کو مصنف ممدوح نے عین نیک نیتی اور خلوص سے ہر قابل قدر ہستی کے تاجِ شہرت میں اپنی چابکدستی سے جڑ دیا ہے۔ تمام شائقین کے لیے خصوصاً شعرا یا فن شعرا اور علم ادب کے مبتدیوں کیلیے تو **آبِ حیات** وہ معشوق دلفریب ہے جو ہر وقت گلے سے لگائے رکھنے کے قابل ہے [illegible] اسکی اردو معلی [illegible] گلے [illegible] پھولوں کی [illegible] کلید ہے جو ہر وقت [illegible] ۵۳۵ صفحے تقطیع [illegible] قیمت [illegible]

# نظمِ آزاد

یہ وہ کتاب ہے جس کے ۰۰۶ صفحوں پر حسن و عشق کی قید سے آزاد اخلاقی نظمیں ہیں جن میں مثنویاں [illegible] بند، غزلیات اور قصائد بھی شامل ہیں۔ مگر کیسے؟ مغربی پھولوں سے مشرقی دامن [illegible] اخلاقی گرانبہا مطالب ایک ایک مصرعے میں لبالب کر دیے ہیں۔ دولت، خصلت [illegible] وطن۔ ایک تارے کا عشق وغیرہ وغیرہ وغیرہ با کمال نظمیں ہیں کہ جن سے کارآمد مطالب پیدا [illegible] اخلاق افکارات سے بچنے کے لیے آسان راستے دکھائے ہیں۔ گویا نظم اردو میں [illegible] یہ ذخیرہ لا رہا ہے جنہیں پڑھ کر ملک و قوم کے عاشق صرف صحتِ زمانہ کے پہلو بہ پہلو [illegible] نیکنامی کے ساتھ دوامی شہرت بھی۔

**قیمت** [illegible] سائز ۲۰×۲۶

سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک کی نشانی ہیں انہیں سامنے سے اٹھانا کیسے بھائیوں کو الوداع کہنا ہے ؟

یہ درست ہے کہ گراں سنگ قرض تھا اور گرانبہا فرض تھا جس سے آج میں ہلکا ہوا ۔ لیکن عمروں کا ساتھ ہے ، اور دس مہینے دن رات آنکھوں کا تیل لگتا ہے ۔ موانست رو رو کر دل سے رخصت مانگتی ہے ۔ ہائے دلگیر محنت تھی ۔ لیکن دلپذیر محنت تھی ۔ سخت کام تھا ۔ مگر مزے کا کام تھا ۔ اور ثواب یہ انجام تھا کہ اُستاد کا کلام تھا ۔ اب یہ مزہ کہاں آہ اُستاد کہاں ۔ اُستاد ! خیر آزاد ! بہار زندگی کے لطف ہوتے ہیں کہ بہار نظر اور سماعت وغیرہ وغیرہ ۔ ایک ایک کرکے انسان سے رخصت ہوتے جاتے ہیں ۔ تب وہ کیا کرتا ہے ۔ صبر کرتا ہے بس صبر کر کہ یہ نعمت بھی رخصت ہوئی ۔ اور نہ کروگے تو کیا کروگے ۔ بندگی کا عالم بے چارگی کا ماتم ہے ۔

خاتمہ تحریر بس دعا پر ہے کہ :-

الٰہی تو جانتا ہے ۔ آزاد نے جو کچھ کیا نیک اور پاک عقیدت سے کیا ہے اور تیرے حکم سے کیا ہے ۔ اس خدمت کو قبول کر ۔ کلام کو عمر دے ۔ نام کو روشن کر اور آزاد کے حال پر رحم کر کہ تو

ارحم الراحمین

تمت بالخیر

والعزۃ

# نیرنگِ خیال

## مع ازدیاد مضمون نظمِ اُردو

یہ ایک خیالی تصویر ہے۔ مگر دور اندیشی کی آنکھ سے زمانہ اور اہلِ زمانہ کو جس نظم و نثر کی ضرورت ہے اس کا جگہ جگہ پردہ اٹھا دیا گیا ہے۔ اندر سبھا اور چہار درویش جیسے افسانوں کو طاق پر رکھ کر ملٹن اور شیکسپیر کے کلام کا انداز۔ کالیداس کے ترانے متقدمین شعرائے اُردو کے تخیلات کا بین فرق ثابت کرتا ہے کہ نظم ہو یا نثر اسے تشبیہ اور استعارات سے برہنہ کر کے اگر دیکھا جائے تو تمام ان مندوں میں مفید اور کارآمد مغز ہونا چاہئیے۔ جامعیت کی علیحدگی کے بعد نتیجہ خیز مادہ ہونا لازمی ہے ورنہ بیکار ہے۔ تحصیلِ لاحاصل ہے۔ اور ایسی نثر کی اب ضرورت نہیں جو تکمیلِ مطالب سے قاصر ہو۔ تمثیلاً مغربی زبان کے جواب مضمون Essay کے پیش کر کے شعراء و اہلِ قلم کو ہدایتیں ہیں کہ مشرقی زبان اُردو کے مالک بن کر مغربی خزانوں پر بھی متصرف ہوں۔ اور دونوں زبانوں کے تجربے سے ایک ایسا سمویا ہوا دریا بہہ جس سے ملک سیراب ہو اور زبان کا خزانہ مالا مال ہو جائے۔ ان تمام مطالب کو مولانا نے نظم کے بدلے نثر کا لباس پہنا کر اس طرح پیش کیا ہے کہ نیرنگِ خیال کے تخیل اور نثر نظم کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی ہے۔ اس سے بہتر کوئی کتاب زبانِ اُردو کے پاس نہیں جو نثر کے عجائب خانہ میں رکھی جائے۔ باایں ہمہ ایسی عدیم المثال مشعلِ ہدایت کی قیمت صرف ۸ [illegible]

## نصیحت کا کرن پھول

اس روشن خیالی کی چمک ملک میں ابھی ندارد ہے کہ ملک کی آبادی کا نصف حصہ یعنی مخدراتِ عصمت اُس وقت تک تاریکی میں ہیں جس کا درد رکھتے ہوئے مولانا آزاد نے نصیحت کا کرن پھول تعلیم نسواں کے ایک دلچسپ قصے کے پیرایہ میں ایک میاں بیوی کی بحث نہایت نتیجہ خیز پیرایہ میں لکھا ہے کہ ہونہار کو نیکیوں کی نمود بہترین زیور ثابت ہو۔ جس میں آسان اُردو سیدھے سادے فقرے روزمرہ کی بول چال اور ناصحی دلبستگی کا سامان ہے۔ قیمت صرف [illegible] مکتبہ [illegible] دہلی

# جواہر پارے

## مراۃ الغالب

حضرت غالبؔ کا اُردو دیوان ہماری زبان اُردو کیلیے ایک گوہر شب چراغ ہے اس کو بار بار پڑھیے۔ ہر وقت دیکھیے۔ ہر دفعہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔ اور دل چاہتا ہے کہ ہر وقت اس کو سرہانے تعویذ بنا کر رکھا جاوے مگر پورا لطف اُس وقت آتا ہے جبکہ اس کے نکتہ نکتہ کو سمجھ کر پڑھا جاوے۔ اس مقصد کیلیے بہت سے ترجمے اور شرحیں ملتی ہیں۔ مگر کہنے والوں کو کیا خبر کہ غالب کون تھے۔ اور کس طبیعت و رنگ کے انسان تھے۔ اگر آپ غالب کے کلام کے نکتہ سنج اور نکتہ داں ہونا چاہتے ہیں تو مراۃ الغالب دیکھیے۔ جو ملک الشعرا حضرت سید وحید الدین صاحب بیخود دہلوی جانشین حضرت داغ نے کمال محنت سے تحریر فرمائی ہے۔ ایسی آسان بکمل و جامع رہا ہے کہ آج تک نہیں لکھی گئی۔ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد دیوان غالب کبھی دماغ سے محو نہ ہو گا۔

مجلد۔ مطلا۔ قیمت فقط تین روپے

## طالبعلم کی زندگی حصہ اول

ہمارے محترم و معظم آغا محمد صفدر صاحب نے یہ عجیب و غریب کتاب لکھکر ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان ابھی تک اخلاق سے خالی نہیں ہوا۔ یہ کتاب ایک دیوتا ہے اخلاق کا۔ اس کو ایک دفعہ پڑھنا ہر ہندوستانی طالب علم پر فرض ہے۔ اس کے بعد طالبعلم کو معلوم ہو جاویگا کہ یا عزیز وقت کس طرح گزارتے ہیں ہم خود کیا ہیں۔ ہمارے آس پاس کے انسان کیا ہیں ہمیں کس طرح رہنا چاہیے اور کیونکر مکمل انسان بن سکتے ہیں۔ غرضکہ یہ مشعل ہدایت ہے جسمیں ایک موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور دل پر لکھ لینے کے لائق۔ ۸۰ صفحے قیمت ۱۲ / ۔ اسکے پڑھنے کے بعد سخت سے سخت امتحان میں بھی آپ کے قدم ڈگمگا نہیں سکتے۔

ملنے کا پتہ [illegible]